ہندوستان

کے زمانۂ قدیم ووسطیٰ کے

کتب خانے

بمل کمار دت

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

ہندوستان

کے زمانۂ قدیم و وسطیٰ کے

کتب خانے

بمل کمار دت

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

ہندوستان کے زمانۂ قدیم و وسطیٰ کے کتب خانے

مصنف

بمل کمار دت

مترجم

سرتاج احمد عابدی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک-۱، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

Hindustan Ke Zamana-E-Qadeem-O-Wusta Ke Kutub Khane
By: Dr. B.M. Dutta

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت :
پہلا اڈیشن : 1979
دوسرا اڈیشن : جولائی 2002 تعداد 1100
قیمت : =/69
سلسلہ مطبوعات : 1009

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، ویسٹ بلاک۔I، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066
طابع : لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی۔ 110006

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے اُن اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدارسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقہ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب

ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کیں ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے اب ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا پروگرام شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست

	مقدمہ	(الف)
	تمہید	1
1	قدیم مذہبی اور دیگر اداروں کے کتب خانے	11
2 (الف)	مغربی اور جنوبی ہند کے کتب خانے	34
2 (ب)	ہندوستان کے قدیم کاغذات	46
3	عہد سلطنت کے شاہی اور اہم ذاتی کتب خانے	50
4	مغلوں، چھوٹی مسلم ریاستوں اور مراٹھوں کے کتب خانے	60
5	جنوبی ہند اور بنگال میں ابتدائی یورپی باشندوں کے کتب خانے اور ٹیپو سلطان کی لائبریری	88
6	سامان تحریر کی تاریخ اور کاغذ کی ابتدا	104
7	مخطوطات اور کتابوں کی جلد سازی کی تاریخ	140
8	کتابوں اور مخطوطوں کو باتصویر اور مطلا منقش کرنا	150
9	لائبریری تکنیک اور نظام	174
10	ہندوستان میں طباعت کی تاریخ	213

مقدمہ

کتابوں اور لائبریریوں کی باضابطہ تاریخ کسی ملک کے ذہنی ارتقاء کا ایک ضروری باب ہوا کرتی ہے۔

زیر نظر کتاب میں ہندوستان کے زمانۂ قدیم اور عہد وسطیٰ کے کتب خانوں اور فن کتب خانہ کے فروغ کی ایک باضابطہ اور جامع تاریخ بیان کی گئی ہے۔ میں نے زیر نظر کتاب میں سامان کتابت، مخطوطات اور کتابوں کی جلد سازی، کتابی تصویریں، نظامِ کتب خانہ، کتابوں کی درجہ بندی، کیٹلاگ گری اور کتابوں کی حفاظت سے متعلق ابواب بھی شامل کیے ہیں۔ کتابوں اور کتب خانوں سے ان موضوعات کا باہمی تعلق بہت واضح ہے اور ان ابواب کے ذریعہ اس مضمون کے مختلف پہلوؤں کے اندرونی تعلق کی مکمل تصویر پیش کی گئی ہے۔

اس طرح کی تصنیف کا خیال پہلے پہل ۱۹۶۱ء میں میرے ذہن میں آیا تھا جب میں کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں اسکول آف لائبریری سائنس کا ایک طالب علم تھا۔ وہاں کے نصاب میں کتابوں اور تہذیب کے فروغ پر ایک پرچہ بھی ہے لیکن اس میں ہندوستان نے جو کارنامے انجام دیے ہیں ان کا ذکر شامل نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کے کتب خانوں کے ارتقاء پر کوئی کتاب ہی موجود نہ تھی۔

واپس وطن آیا تو برابر یہ قصد رہا کہ قدیم زمانے سے دور طباعت کے آغاز تک کے ہندوستان کے کتب خانوں کی مکمل تاریخ کا ایک جائزہ پیش کروں، لیکن میری نئی ذمہ داریوں کے بوجھ نے اب تک مجھے اس کام سے روکے رکھا۔

۱۹۶۹ء میں میں نے اس کام کو مکمل کر لیا اور کلکتہ یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے اس کو پیش کیا۔ بعد میں اس نے زیر نظر کتاب کی صورت اختیار کر لی۔ مجھے امید ہے کہ یہ حقیر کوشش ایک اہم خلا کو پر کر سکے گی اور طلباء اور تمام حضرات کے لیے جو اس مضمون میں دلچسپی رکھتے ہیں قابل قدر ثابت ہوگی۔

میں پروفیسر نہار رنجن رے، ڈائریکٹر انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی شملہ (سابق یونیورسٹی

لائبریرین) اور باگیشوری پروفیسر آف فائن آرٹس کلکتہ یونیورسٹی کی خدمت میں ہدیۂ شکر پیش کرتا ہوں، ان دونوں حضرات نے میری قابل قدر مدد اور رہنمائی کی۔ میں شری رام لال پوری، مالک آتما رام اینڈ سنز دہلی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس کی طباعت کا ذمہ لیا۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا برٹش میوزیم، کلیولینڈ میوزیم یو۔ ایس۔ اے (امریکہ) اور اسٹیلن گراڈ میوزیم آف آرٹ۔ یو۔ ایس۔ ایس۔ آر۔ (سوویت روس) کا بھی ممنون ہوں جہاں سے میں نے پلیٹیں حاصل کیں۔

آخر میں میں اُن خامیوں کے لیے جو اس کتاب میں پائی جائیں قارئین سے معافی کا خواستگار ہوں۔

کل کارو دت۔

وشو بھارتی یونیورسٹی

شانتی نکیتن۔ 27 جنوری ۱۹۷۰ء

تمہید

۱۔ لائبریری کی قدیم اور جدید تعریف
۲۔ زیر نظر کام کا دائرہ کار
۳۔ ماخذ اور ماخذی مواد

۱۔ لائبریری کی قدیم اور جدید تعریف

پوری مغربی دنیا میں لائبریریوں کا تصور خواہ وہ عوامی ہوں یا اداروں سے متعلق ہوں۔ ان کے نظم و نسق اور اُنکی تنظیم کا نظریہ سب کچھ اس وقت یکسر بدل گیا جب یورپ میں انیسویں صدی کے وسط سے خواندگی اور کتابوں کے ذریعہ تعلیم کی حیرت انگیز ترویج ہوئی اور وہ سماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں جو صنعتی انقلاب کا نتیجہ تھیں۔ ان ممالک میں جو اقتصادی طور پر صدیوں سے پسماندہ تھے اس صدی کے آغاز سے جو سماجی، سیاسی اور اقتصادی تبدیلیاں عمل میں آئیں اور کتابوں کے ذریعہ جو تعلیم عام ہوئی اس سے کتب خانوں کے قدیم مفہوم و مقاصد بالکل بدل گئے۔ موجودہ دنیا کی لائبریریاں ایک ایسی ارتقائی منزل پر ہیں جہاں ان کے اغراض و مقاصد، طریقہ کار اور تنظیم تقریباً سب یکساں ہیں یہاں یہ جاننا

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم و عہدِ وسطیٰ میں لائبریریاں کس قسم کی تھیں، ان کے مقاصد کیا تھے اور ان کی تنظیم کس طرح ہوتی تھی۔ اسی طرح دورِ حاضرہ کی لائبریری کی کیفیت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ اسی نظریہ کے تحت اور انسان کے اس جذبۂ تجسس کے پیشِ نظر کہ ماضی میں اس کی کیا کامیابیاں رہی تھیں لائبریری کے فن سے متعلق قدیم تہذیبی گہوارے مثلاً مصر و بابل، یونان و روم اور وسطیٰ عیسائی دنیا کے بارے میں سنجیدہ مطالعے کیے گئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو آلات، انداز اور طریقۂ کار ان کتب خانوں میں رائج تھے اُن میں سے کچھ موجودہ دور کی لائبریریوں میں بھی مروّج ہیں۔ اس کے علاوہ عہدِ قدیم و عہدِ وسطیٰ کے مغربی ممالک کی لائبریریوں کے مطالعہ سے وہاں کی سماجی و تہذیبی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

سب کے علم میں ہے کہ عہدِ قدیم و عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں اٹھارھویں صدی کے آخر تک لائبریری کو علم و دانش اور حصولِ علم کا اہم سرچشمہ سمجھا جاتا تھا اسی لیے شہنشاہوں، بادشاہوں اور جاگیرداروں نے اپنے ذاتی کتب خانے قائم کیے اور ان کی نگہداشت کی، مذہبی اداروں اور خانقاہوں میں بھی کتب خانے تھے۔ عہدِ حاضر میں لائبریری اور اس کے پیشہ میں جو غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا گیا ہے اس کے نتیجہ میں ہم عہدِ قدیم کے کتب خانوں کے نیز ان کے مقاصد اور تنظیم کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کے زیادہ خواہشمند ہو گئے۔ ہماری اس خواہشِ تحقیق کے عملی نتیجہ کے طور پر عہدِ قدیم و عہدِ وسطیٰ کے کتب خانوں کے بارے میں صرف چند بکھرے ہوئے مقالے شائع ہوئے ہیں یا چند اتفاقی حوالے جو لائبریری اور فنِ لائبریری یا ہندوستان کی تعلیمی تاریخ سے متعلق کتابوں میں نظر آ جاتے ہیں لیکن بدقسمتی سے کوئی ایسا عمیق اور غائر مطالعہ اس موضوع پر نہیں ملتا کہ ان کتب خانوں کی ایک واضح تصویر ابھر سکے۔ زیرِ نظر تصنیف میں اسی مقصد کے تحت کوشش کی گئی ہے کہ جس طرح مغربی ملکوں کی لائبریریوں اور فنِ لائبریری کے متعلق کتابیں ہیں ویسی ہی ایک کتاب ہندوستان پر بھی ہو جائے

لائبریری کی جدید تعریف* (جس کا پہلا لفظ "لائبر" لاطینی ہے جس کے معنی کتاب کے ہیں) پڑھنے تحقیق کرنے یا دونوں مقاصد کے لیے باقاعدہ کسی ایک جگہ کتب و مخطوطات کو اکٹھا کرنا ہے۔ باقاعدہ اکٹھا کرنے کے پیچیدہ نظام میں کیٹلاگ، اشاریئے دیگر کاغذات، شعبہ جلدسازی، دفاتر اور بڑے عملہ سے لے کر سادہ فہرست والے شخصی کتب خانے سب شامل ہیں۔

عام طور سے موجودہ لائبریری بہت سی کتابوں، ایک بڑی علاحدہ عمارت اور لائبریرین پر مشتمل ہوتی ہے لیکن کتابیں کم بھی ہوں اور اس کا مالک ہی اس کا محافظ بھی ہو تب بھی اُسے لائبریری تصور کیا جائے گا بشرطیکہ وہاں

---

* ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA, 1961

کتابیں استعمال کے لیے رکھی گئی ہوں نہ کہ فروخت کے لیے۔

مغربی ملکوں میں دو اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں "لائبریری اور ببلیوتھیکا" جس کا مطلب ہے ایسی ایسی جگہ جہاں کتابیں اور مخطوطات رکھے گئے ہوں۔ پہلی اصطلاح لاطینی لبر سے مشتق ہے بمعنی کتاب اور دوسری اصطلاح یونانی زبان سے لی گئی ہے جو دو الفاظ پر مشتمل ہے، ببلیو بمعنی کتاب اور تھیکا بمعنی الماری یا صندوق۔ لہٰذا ببلیوتھیکا لغوی طور پر کتابوں کی الماری یا ذخیرۂ کتب ہوا۔

ہندوستان کے قدیم اور وسطی زمانوں میں مندرجہ ذیل اصطلاحات رائج تھیں جو لائبریری کے لیے پستک اور گرنتھوں کے مجموعے کو بیان کرتی ہیں۔

نبندھ پستک استھان 1

دھرم گنج 2

گرنتھ کٹی 3

گیان بھنڈار 4

پستک بھنڈار 5

سرسوتی بھنڈار 6

بھارتی بھنڈار 7

سرسوتی محل 8

---

1. ARTHASASTRA. ED. SHAMASASTRY, P.62
2. HISTORY OF INDIAN LOGIC, VIDYA BHUSAN, P.516
3. TRIKANDA : (VISVA-KOSHA, P.603).
4. JAIN CHITRA KALPADRUM : SARABHI NAWAB.
5. ANNUAL REPORT OF THE SOUTH INDIAN EPIGRAPHY, 1936-37, PP. 81-82.
6. Annual Report of the South Indian Epigraphy, 1938-39 No. No.139 and Hyderabad Archaeological Series No.8.
7. Indian Paleography, Buhler, P.93.
8. A descriptive catalogue of the Sanskrit Mss. in the Tanjore Maharaja Serfoji's Saraswati Mahal Library. Tanjore, p.P.S.Sastry, Vol.1

کتاب خانہ

پتھی خانہ

ودیا شالہ

کاتھا گھر

ارتھ شاستر میں اور تذکروں کے ساتھ ایک ایسے عوامی ادارے کا بھی ذکر ہے جس کا نام "اکسے پاٹلہ" ہے جس میں افسران حساب رکھتے تھے جن کو "گن نکیہ دھیکار" کہا جاتا تھا۔ اس کا ایک سربراہ یعنی "ادھیکش" ہوتا تھا جس کی تحویل میں خاص کتابیں ہوتی تھیں۔ اس مقام کو "بندھ پستک استھان" کہتے تھے۔ "دھرم گنج" کا مطلب ہے مذہبی مقام اور یہ اصطلاح نالندہ یونیورسٹی کی لائبریری کے لیے استعمال کی گئی تھی۔ دھرم گنج تین شاندار عمارتوں پر مشتمل تھی جن کے نام تھے "رتن ساگر، رتن داد ھی، رتن رنجکا"۔

گرنتھ کٹی کے لغوی معنی ہیں کتاب گھر یا کتب خانہ۔ لفظ "گرنتھ" سنسکرت سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے کسی دھاگہ سے چیزوں کو یکجا رکھنا۔ ہندوستان میں یہ لفظ مخطوطات کے لیے استعمال ہوا ہے کیونکہ انکے اوراق کو ایک دھاگہ کے ذریعہ یکجا رکھا جاتا تھا۔ جنوبی ہند اور مغربی ہند میں گیان پستک اور سرسوتی بھنڈار یا محل لائبریری کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ گیان بمعنی علم اور سرسوتی علم کی دیوی ہے۔ جب ان الفاظ کو بھنڈار یا محل سے جوڑ دیا جائے تو اس کے معنی ہو جاتے ہیں علم کا خزانہ یا علم کی دیوی کا گھر۔ دوسرا لفظ "پستک" "ادیستان" سے نکلا ہے۔ یہ "پوست" سے مشتق ہے جس کا مفہوم ہے چیزوں کا ڈھیر جسے تلے اوپر رکھ کر سی دیا گیا ہو۔ ہندوستان میں پستک کتاب کے لیے استعمال ہوتا ہے اور "پستک بھنڈار" یا "پستک استھان" کا مطلب ہے کتابوں کا خزانہ دوسری اصطلاح ہے "بھارتی بھنڈار گھر"۔ بھنڈار گھر یعنی خزانہ اور بھارتی گویائی کی دیوی ہے۔

دہلی سلطنت اور عہد مغلیہ میں نظام ملک مختلف محکموں میں منقسم تھا اور ہر محکمہ کو کارخانہ کہا جاتا تھا۔ اور انہی میں ایک کتب خانہ تھا جس کے لغوی معنی ہیں کتابوں کا گھر۔

---

9. ADMINISTRATION OF THE SULTANATE OF DELHI. I.H. Qureshi

10. J.O.R. Vol.XXVII, P. 143.

11. STUDIES IN INDIAN LITERARY HISTORY, Vol.II, pp.122-36.

12. CHITIPATHE SAMAJ CHITRA. VISVA-BHARATI, Vol.2, p.483.

ہندو حکمرانوں کو جو عہد وسطیٰ کے آخر میں تھے عربی لفظ "کتاب" پسند نہ تھا۔ اس لیے وہ "پوتھی خانہ" یعنی محکمہ مخطوطات استعمال کرتے تھے۔

"اکس بھیرو کلپ" جو تانجور سرسوتی محل لائبریری میں ہے ایک ایسا مخطوطہ ہے جس میں وجے نگر خاندان کا شجرہ ہے وہ پندرھویں صدی کی کتاب ہے۔ مذکورہ مخطوطہ کا پاٹھ 32، شاہی محل کے اندرونی حصوں کی تعمیر سے متعلق ہے ان میں سے ایک محل "درباشالہ" (یا مخطوطات گھر) کہا جاتا تھا جس میں شاہی کتابیں، مخطوطات وغیرہ رکھے جاتے تھے۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی بنگال کی لائبریری کو "گوتھا گھر" کہا جاتا تھا۔ "گاتھا" کا ماخذ "گرنتھ" اور "گھر" کا ماخذ "گرہ" یعنی کمرہ ہے۔

2۔ زیر نظر تصنیف کا دائرہ

ہندوستان کے زمانۂ قدیم اور عہد وسطیٰ میں خواندگی یا کتابوں کے ذریعہ پڑھائی کا حق محدود افراد کو حاصل تھا۔ آبادی کا صرف اعلا طبقہ یعنی برہمن اور چھتری ہی تعلیم سے بہرہ ور تھا اور مذہبی اداروں سے متعلق افراد بھی اس حق میں شامل تھے بعد میں افسران اور تجارت پیشہ لوگ بھی (جنھیں حساب کتاب سے واسطہ پڑتا تھا) تعلیم کے دائرہ میں آگئے۔ اقتصادی طور پر پست طبقہ نیز خواتین تعلیم سے بالکل بے بہرہ تھے اگرچہ بعض مستثنیات بھی ملتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ کتب خانے بہت کم تھے اور وہ صرف شاہی درباروں یا مذہبی علماء و فضلاء تک محدود تھے یا مذہبی اداروں سے متعلق تھے، علاوہ ازیں سولھویں صدی سے پہلے ہندوستان میں چھاپے خانے ناپید تھے اور آج کے دور میں جو چیز کتاب کہلاتی ہے ایسی کوئی شے اس وقت نہ تھی۔ جو کچھ لائبریریوں میں تھا وہ مخطوطے اور دستاویزات تھیں جن کو بڑی احتیاط اور محنت سے نقل کیا جاسکتا تھا ان پر کافی خرچ آتا تھا۔ نقل نویسی ایک قیمتی ہنر یا مذہبی رسم سمجھی جاتی تھی۔ اس طرح اس دور میں ایک ایسا طبقہ وجود میں آگیا تھا جس کا پیشہ نقل نویسی قرار پایا۔ یہ بادشاہوں اور جاگیرداروں کے ملازم ہوتے تھے ان کا کام تھا کہ شاہی لائبریریوں کے لیے مخطوطات تحریر کریں یا نقل کریں۔

عہد وسطیٰ کے یوروپ میں چھاپہ خانہ کی ایجاد سے پہلے جو حال تھا بعینہٖ وہی ہندوستان کا بھی حال تھا یعنی قدیم اور دور وسطیٰ کے ہندوستان میں ذاتی اور اداروں سے متعلق قسم کی لائبریریاں تھیں۔ ان ہی کتب خانوں کے گرد پاٹھ شالا، ٹول، اور چتسپاٹھی (اسکول کالج) یا یونیورسٹی (وہار یا مہا وہار) مندروں یا خانقاہوں نے قائم کیے اور ایسے علاحدہ گوشوں میں جو کسی گرو، ادارہ یا شاہی لائبریریوں سے متعلق تھے۔ علم ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتا تھا۔ مخطوطات نقل ہوتے اور محفوظ رکھے جاتے تھے۔ علماء، پجاری اور راہب ہی ان علوم کے خزانوں کے مالک تھے اور وہی ان مخطوطات کے مفسر اور نقل نویس بھی تھے ایک سنسکرت کہاوت ہے[13] کہ لائبریری

13. The Library Movement, Madras Library Association, 1929, p. 130.

رکھنا اور استاد ہونا برابر ہے۔ اس کہاوت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ لائبریری کا مالک ہونا کتنا قابلِ فخر اور ذمہ دارانہ فعل تھا۔ قدیم ہندوستان کو بہت سے علوم میں برتری حاصل تھی اس نے نئے مذہبی نظام کو جنم دیا اور ایک آزاد مکتبِ فکر و فلسفہ کو فروغ دیا۔ ہمارا ملک مشرق کے لیے مشعلِ راہ بنا اور علم و دانش کا ایک اہم مرکز کہلایا۔ یہ مرتبہ ایک دن یا ایک نسل کی محنت کا ثمرہ نہ تھا بلکہ صدیوں کے تجربات کا نچوڑ تھا۔ کتابیں اور مخطوطات نسلوں کی یادداشتیں تھیں جو بڑھتی رہیں اور ہندوستان میں بے شمار علوم کے خزانے کتب خانوں کی شکل میں وجود میں آئے۔

زیرِ نظر تصنیف میں مذکورہ بالا زمانۂ قدیم و وسطیٰ کی لائبریریوں کی تاریخ ۱۸۵۷ء تک بیان کی جائے گی۔ اب تک کوئی سیر حاصل تصنیف یا تحقیق اس موضوع پر نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے یہ تصنیف ایک خلا کو پُر کرے گی اور ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کے ایک پہلو پر روشنی ڈالے گی۔

آثارِ قدیمہ اور ادبی حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرقہ وارانہ فساد، بغض و حسد اور غارت گری اور مخطوطوں اور کتابوں کے بیرونی ملکوں میں منتقل ہونے سے قدیم اور عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں کتب خانوں کے بارے میں حوالے کس طرح ناپید ہو گئے۔ اس کے علاوہ قیمتی مخطوطات لاپرواہی کی وجہ سے تلف ہو گئے۔ کس طرح زمانۂ قدیم و وسطیٰ میں کتب خانے تباہ ہوئے اس کی تفصیل آئندہ ابواب میں آئے گی۔

لائبریریوں کے ارتقاء کی تاریخ میں اور موضوع بھی شامل ہوں گے مثلاً لکھنے کا ساز و سامان، جلد سازی، تصویروں کے ذریعہ تشریح اور لائبریری ٹیکنک جیسے علوم کی درجہ بندی، کیٹلاگ گری، تحفظ کے طریقے اور لائبریری کا انتظام، ہندوستان میں چھاپہ خانہ کی ابتدا جس نے ایک نئے دور کا آغاز کیا اور ہمارے ملک میں کتابوں کی پیداوار کو فروغ دیا یہ سب چیزیں بیان کی جائیں گی۔ اس تصنیف میں میں نے کوشش کی ہے کہ مذکورہ بالا تمام موضوعات کی تشریح ہو جائے اور ان کا باہمی ربط ظاہر ہو جائے نیز کتب خانوں کی تاریخ اور پیشہ سے متعلق قدیم و وسطیٰ ادوار میں کیا حالات تھے ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کی شکل میں سامنے آ جائیں۔

بے جا نہ ہوگا کہ چند الفاظ اپنے دائرۂ کار کے بارے میں کہہ دیئے جائیں۔ ہمیں مختلف موضوعوں پر اس پہلو سے گفتگو کرنا ہے کہ مرکزی خیال کی وضاحت ہو جائے۔ اس قدر وسیع موضوع پر کتاب لکھنے میں کہیں کہیں خاص طور پر حوالوں کی کمی یا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے جس مخصوص مہارت کی ضرورت ہے اس کی کمی کی وجہ سے کچھ خامیاں ضرور نظر آئیں گی۔

پڑھنے والوں کی سہولت کے لیے میں کتاب کے ابواب کا خلاصہ ذیل میں درج کرتا ہوں۔

پہلے باب میں قدیم خانقاہوں اور دیگر اداروں سے وابستہ لائبریریوں کا ذکر ہے جس میں شاہی کتب خانے اور یونیورسٹی لائبریریاں بھی شامل ہیں اور ملک کے تعلیمی پس منظر کا مختصر خاکہ ہے، چینی سیاحوں کا شوق تھا،

ہوان سانگ اور آئی چنگ کے سفرناموں کو اس باب کا مواد فراہم کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں جین گیان بھنڈار کا جو مغربی ہندوستان میں تھے اور سرسوتی بھنڈار کا جو جنوبی ہندوستان میں تھے بیان ہے۔

تیسرے باب میں دہلی سلطنت کی شاہی اور اہم ذاتی لائبریری کی تاریخ ہے اور سماجی و تعلیمی سرگرمیوں کی تفصیل ہے۔

چوتھے باب میں شاہی اور اہم ذاتی لائبریریوں کا ذکر ہے جو عہد مغلیہ میں تھیں اسی میں اس دور کے ہندو علمی مراکز اور کتب خانے بھی آگئے ہیں اور دکنی سلاطین و مراٹھوں کے کتب خانوں کا بھی بیان ہے۔ اگلے باب میں جنوبی ہند اور بنگال کے عیسائی تبلیغی مراکز کی تعلیمی سرگرمیوں کی تفصیل میں نے بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ کتب خانوں کے قیام میں ان کا کیا مقام تھا۔ بیان کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے اس قصہ کو ۱۹۰۵ء تک لایا ہوں جبکہ لارڈ کرزن نے کلکتہ پبلک لائبریری کو ایک قومی ادارہ میں تبدیل کیا۔ نیز ٹیپو سلطان (وفات ۱۷۹۹ء) کی لائبریری کا بھی اسی میں ذکر ہے۔

لکھنے کا سامان مثلاً کاغذ وغیرہ کی ایجاد و ابتداء پر کافی مواد کتابی شکل میں موجود ہے۔ اس لیے میں نے اس کو از سر نو ترتیب دے دیا ہے اور کچھ نئے واقعات کا اضافہ بھی کیا ہے۔

اگلے دو ابواب (ا) میں کتابوں کی تشکیل اور جلد سازی کی تاریخ (ب) میں مخطوطات اور کتابوں کی تصویر کشی سے بحث کی گئی ہے۔

نواں باب نظام علم اور کتابوں کی درجہ بندی کے بارے میں ہے اس میں فہرست سازی اور مخطوطات کے تحفظ کے طریقے بھی درج کیے گئے ہیں اس میں لائبریری کے عملہ کے بارے میں اور ان کی تنخواہ، حیثیت اور گذشتہ اور موجودہ لائبریری کی عمارت کا بیان بھی شامل ہے۔

چھاپہ خانے کی ایجاد و ابتدا نے کتب خانوں اور اس کے پیشہ میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔

دسویں اور آخری باب میں ہندوستان میں چھاپہ خانہ کی کہانی کو مکمل کرتے ہوئے اس جائزہ کو تمام کیا ہے۔ اس موضوع پر جناب پریولکر کی قابل قدر تحقیقات سے میں نے استفادہ کیا ہے۔

3۔ ماخذ اور ماخذی مواد

ہندوستان کے عہد قدیم و وسطیٰ کی لائبریریوں کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے جو کتابیں مواد فراہم کرتی ہیں ان کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی ادبی حوالے اور آثار قدیمہ۔ ادبی حوالوں میں ملکی اور بیرونی دونوں شامل ہیں۔ "نیرکوس" کی تحریر میں جو سکندر اعظم کا سپہ سالار تھا اور ہندوستان پر حملہ میں اس کے ہمراہ تھا۔ "اسٹریبو" کی تحریر میں جو یونانی

یونانی تھا جس نے پہلی صدی عیسوی کے آغاز میں جغرافیہ کی ایک کتاب لکھی۔ اور کرٹیس" کی تحریر میں جو دوسرا یونانی مصنف تھا ہمیں سامان تحریر کے بارے میں مختصر مگر قابل قدر معلومات ملتی ہیں۔ چینی سیاح فاہیان (۳۹۹ء)، ہیوان سانگ (۶۲۹ء) اور آئی چنگ (۷۵-۶۷۱ء) اور دوسرے بدھ سیاحوں نے جو پڑوسی ملکوں سے ہندوستان میں مذہب برہم اور نیکی پر مواد فراہم کرنے آئے۔ یہاں بہت سے تعلیمی مراکز دیکھے ان کی تحریروں میں قدیم کتب خانوں اور ان کی تنظیم کے بارے میں گرانقدر معلومات ملتی ہیں۔ عرب مصنفین میں ابوریحان نے جسے البیرونی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے سرکاری کاغذات اور شاہی سوانح میں ہندوستان کے بارے میں معتد بہ معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ منہاج الدین نے طبقات ناصری میں ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے بارے میں اس زمانہ کے تہذیب و تمدن کے بارے میں تفصیلات دی ہیں۔

اور سب سے آخر میں ان یوروپی سیاحوں اور عیسائی پادریوں کی تحریریں ہیں جو سترھویں صدی کے نصف سے ہندوستان میں آتے رہے انھوں نے ہندوستان کی مذہبی اور تہذیبی تاریخ پر کافی مواد چھوڑا ہے ان میں برنیر (BERNIER) کی "ٹریولز ان مغل ایمپائر" (TRAVELS IN THE MOGHUL EMPIRE) نکولس منوچی (NICCOLAO MANUCCI) کی "اسٹوریا ڈو موگور" (STORIA DO MOGOR) جین بیپٹسٹ ٹیورنیئر (JEAN BAPTIST TAVERNIER) تھیوناٹ کریری (THEVENOT CARERI) اونگٹن (OVINGTON) اور منڈسلو (MANDESLO) کے سفری روزنامچے ہیں جن میں ہندوستان کے کتب خانوں، سامان تحریر اور دوسری سرگرمیوں کی واضح تصویر پیش کی گئی ہے۔

ادوار کے اعتبار سے ہندوستان کے ادبی حوالوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:-

(الف) قدیم برہمن، جین اور بدھ تصانیف، (ب) عہد وسطیٰ کے شاہی تاریخی کاغذات، سوانح اور خودنوشت سوانح، دفتری ریکارڈ وغیرہ، (ج) موجودہ دور کی ابتدائی تصانیف، قدیم ادب میں ہندوستان میں سامانِ تحریر اور دوسرے متعلقہ موضوع پر بہت کم اور بہت بکھرے ہوئے حوالے ملتے ہیں۔ قدیم برہمن تصانیف میں رگ وید، اتھر وید، اپنشد اور رامائن میں فن تحریر اور علوم کی درجہ بندی کے بارے میں بہت مختصر حوالے ہیں۔ مہابھارت میں گرنتھ اور مخطوطات کے استعمال کی جو مہاراجہ جنک نے استعمال کیے، بہت واضح تصویر ملتی ہے۔

پرانوں سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مقدس کتابیں کیسے تقسیم کی جاتی تھیں، اور بلاک چھپائی کے بارے میں بالواسطہ حوالے ملتے ہیں۔ کوٹلیہ کے ارتھ شاستر سے ہمیں پہلی بار براہ راست مخطوطات کے مجموعہ "بندھ پستک استھان" کے بارے میں نیز فن تحریر اور سامان تحریر سے متعلق حوالہ ملتا ہے۔ "ترکنڈ" بھی "گرنتھ کٹی" یا "مخطوطات کا گھر" کی طرف ایک اشارہ کرتا ہے۔ شاہی رزمیہ نظمیں اور ڈرامے مثلاً "مدرا راکشش"، "نتی مادھو"، "شکنتلا" اور "واسو دتا" وغیرہ میں تحریر اور سامانِ تحریر سے متعلق تفصیلات ملتی ہیں۔ بدھ مذہب کی کتاب "جاتکا" سے ہمیں فن تحریر

سامان تحریر اور مخطوطات کے استعمال کا پتہ چلتا ہے۔ دہلی سلطنت کی تہذیبی تاریخ "منہاج السراج کی طبقات ناصری" سے نیز تاریخ فیروز شاہی اور واقعات مشتاقی" جیسی کتابوں سے معلوم ہوتی ہے۔ سلاطین دہلی نے علم و ادب کی جو سرپرستی کی اور جو کتب خانے قائم کیے اس کی صاف تصویر بھی ملتی ہے۔ "بابر نامہ" سے بابر کی شاہی لائبریری کا پتہ چلتا ہے۔ "اکبر نامہ و آئین اکبری" سے اکبر اعظم کے کتب خانے اور اس کی سرگرمیوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ امراء و وزراء کے کتب خانوں کی تاریخ ہمیں "تاریخ بدایونی" سے معلوم ہوتی ہے۔

میں نے جہانگیر کی لائبریری کی تاریخ لکھنے کے لئے "تزک جہانگیری اور واقعات جہانگیری" سے استفادہ کیا ہے اور عیسائی رہنماؤں کے بیانات سے اس کو مکمل کیا ہے۔ ایک اور مصنف فرشتہ ہے جس کی تصنیف اس حصہ ملک کے واقعات سے پُر ہے جو اس کے ارگرد تھے۔ اس سے میں نے سلاطین دکن کے کتب خانوں کا مواد اخذ کیا۔ "سیر المتاخرین" میں بنگال کے نواب علی وردی خاں کے کتب خانہ کا مختصر تذکرہ ہے۔

موجودہ دور کی تصانیف میں جو قدیم ہندوستان کی لائبریریوں، فن تحریر اور سامان تحریر پر روشنی ڈالتی ہے بوہلر کی کتاب "انڈین پیلیوگرافی" قابل ذکر ہے۔ یہ قدیم تصنیف اس موضوع پر جدید تحقیقات کے سامنے آجانے کے باوجود نہایت مستند اور عالمانہ ہے۔ ڈاکٹر آر۔ کے مکرجی کی کتاب "انشینٹ انڈین ایجوکیشن" سے جس میں کئی پیراگراف ہندوستان کی قدیم لائبریریوں کے بارے میں ملتے ہیں مجھے کافی مدد ملی ہے۔

عہد وسطیٰ اور موجودہ زمانے کے کتب خانوں کے تاریخی ارتقاء کے مطالعہ کے لئے مندرجہ ذیل کتابیں کافی مفید ثابت ہوئیں۔

(FRANK PENNY : MADRAS CHURCH)	فرینک پینی۔ مدراس چرچ
(JADUNATH SARKAR : MUGHAL ADMINISTRATION)	جادو ناتھ سرکار۔ مغل ایڈمنسٹریشن
(ANECDOTES OF AURANGZE. HISTORICAL ESSAYS)	انیکڈوٹس آف اورنگ زیب اینڈ ہسٹاریکل ایسز۔
(PROMOTION OF LEARNING IN MUSLIM INDIA BY N.N. LAW).	این این۔ لا: پروموشن آف لرننگ ان مسلم انڈیا۔
PROMOTION OF LEARNING IN INDIA BY EARLY EUROPEAN SETTLERS UPTO 1800 : N.N. LAW)	این۔ این۔ لا: پروموشن آف لرننگ ان انڈیا بائی ارلی یورپین سیٹلرز اپٹو ۱۸۰۰
(JAIN CHITRA KALPADURAM	جین چتر کلپادرم
(A.K. PRIOLKAR : THE PRINTING PRESS IN INDIA).	اے۔ کے۔ پریولکر: دی پرنٹنگ

پریس ان انڈیا

آثار قدیمہ کی دریافتوں کو جو بالواسطہ اور براہ راست مستند حوالوں کی حیثیت رکھتے ہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ کتبے اور تاریخی عمارتیں حقائق کی وضاحت اور تشریح کے لیے کتبے خواہ وہ سرکاری ہوں خواہ ذاتی، کافی گراں قدر ہوتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ مندر وغیرہ کی لائبریری کی تعمیر کے لیے جگہ دی گئی یا مذہبی اداروں کے کتب خانہ کی توسیع کے لیے امداد دی گئی یا کتب خانوں میں مخطوطات کی خرید اور ان کی دیکھ بھال کے لیے اعانت کی گئی وغیرہ وغیرہ۔

قدیم لائبریری کی عمارتیں جو وقت کے بے رحم ہاتھوں کی دست برد سے بچ گئیں وہ تاریخی اعتبار سے جیتی جاگتی یادگاریں ہیں۔ محکمۂ آثار قدیمہ نے نالندہ یونیورسٹی کے (جو اپنی لائبریری کے لیے مشہور تھی) کھنڈرات کا جائزہ لیا۔ موجودہ کمال مولا مسجد میں جو دھارا میں ہے، راجہ بھوج کی لائبریری اور کالج تھے۔ نیل کنٹھیشور کا مندر جو ادوے پور میں ہے اس کا ایک حصہ لائبریری کے طور پر کام آتا تھا جو ۱۰۵۹ء میں ادوے دتیا نے قائم کی۔ شیر منڈل، ہمایوں کی لائبریری محمود گاواں کالج واقع بیدر۔ بیجاپور کی عادل شاہی لائبریری اور تانجور سرسوتی محل لائبریری دوسرا اہم سنگ میل ہیں۔

بابؑ اوّل

قدیم مذہبی اور دیگر اداروں کے کتب خانے

1 ـــ پس منظر
2 ـــ پانچویں صدی عیسوی کے کتب خانے۔ (فاہیان کا بیان)
3 ـــ ساتویں صدی عیسوی کے کتب خانے (ہیوان سانگ کا بیان)
4 ـــ ساتویں صدی عیسوی کے کتب خانے (اِتسنگ کی تفصیل)
5 ـــ مشرقی وسطا ہندوستان کے اہم تعلیمی مراکز سے وابستہ کتب خانے

(الف) نالندہ
(ب) وکرم شلا
(ج) اودانتاپوری
(د) سوماپوری
(ہ) جگدل
(و) متھلا

6 ـــ مغربی ہندوستان کے تعلیمی مراکز سے وابستہ کتب خانے۔

(الف) ولبھی
(ب) کنہیری

1 — پس منظر

کتب خانوں کے ارتقاء کی تاریخ تہذیب و تمدن کے ذہنی نشو و نما کا ایک ضروری باب ہے اور لائبریری کے فروغ اور علم کی ترویج میں بہت قریبی رشتہ ہے۔ تحریر اور کتابوں کے ذریعہ تعلیم نے قدرتی طور پر کتابوں کو جمع کرنے اور محفوظ رکھنے کو رواج دیا جس کی وجہ سے کتب خانے وجود میں آئے۔ چونکہ کتب خانوں کا ارتقاء اس مفہوم میں محفوظ معلومات کی دستاویزوں اور کتابوں کا وہ خزینہ ہے اور ہمیشہ وسیع پیمانہ پر ان پر علم کا انحصار رہا ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس ملک کے تعلیمی نظام پر بھی زمانۂ قدیم سے آخر سولھویں صدی تک جب چھاپہ خانوں کی ابتدا ہوئی نظر ڈالی جائے اور انیسویں صدی کے آغاز تک کا جب موجودہ تعلیم شروع ہوئی مطالعہ کیا جائے۔

ہندوستان میں پہلے زبانی تعلیم کا طریقہ رائج تھا جس میں الفاظ کو رٹ کر یاد کر لیا جاتا ہے، یہ طریقہ برہمن، بدھ، جین اور اسلامی سبھی طریقۂ تعلیم میں رائج تھا۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ وادیٔ سندھ اور ہندوستان کے دیگر علاقوں میں کھدائی سے جس تہذیب کا پتہ چلا ہے اس میں دو دواقعیں ملی ہیں جس میں ایک موہن جودڑو میں اور دوسری چنہودارو میں ملی اور ایک بڑی تعداد مہروں کی ملی ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ ماقبل تاریخ میں ہندوستانی میں فن تحریر سے لوگ واقف تھے۔ لیکن اس تصویری تحریر کو پڑھا نہ جا سکا۔ جو کہ آریہ تہذیب کے عروج تک متروک ہو گئی ہوگی۔ "وید اور ویدانگ یعنی اپنشد۔ برہمن اور ارنایک" یقیناً ہند آریائی تہذیب کی قدیم ترین دستاویز میں ہیں لیکن اب تک اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ وید جنھیں 2000 قبل مسیح سے ۶۰۰ قبل مسیح تک کا کہا جاتا ہے اسی دور میں لکھے گئے یا نہیں اور نہ اس کی کوئی شہادت ہے کہ انھیں دائرہ تحریر میں لایا بھی گیا تھا یا نہیں۔ قرین قیاس یہ ہے کہ انھیں کسی نہ کسی شکل میں تحریر کیا گیا ہوگا۔

کچھ کتبے ایسے ہیں جن کو اشوک اعظم سے قبل کا کہا جاتا ہے[1]۔ لیکن اگر آثار قدیمہ کے نقطۂ نظر سے

---

1. (a) THE BRAN COINLEGEND.:
   (b) BATTIPROLU RELIC CASKET
   (c) TAXILA COIN BRAHMI LEGEND.
   (d) MAHASTHAN STONE PILLAR INSCRIPTIONS
   (e) SOHGAURA COPPER PLATE.
   (f) PIPRAHWA BUDDHIST VASE.
   (g) BADLI INSCRIPTIONS OF AJMER.

دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں عہد موریہ سے قبل عام طور سے فن تحریر سے واقفیت نہ تھی۔ اشوک کے کتبات کو جو ہندوستان کے بڑے حصے میں بانٹے گئے کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ تحریر اس قدر ترقی یافتہ جو ہی نہیں سکتی تھی جب تک یہ صدیوں استعمال میں نہ رہی ہو۔ بہت سے مضامین کی فہرستیں اور دستاویزوں کی فہرستیں اپنشد آشرموں اور بدھ وہاروں میں تعلیم کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ پاپانی کے عہد میں علم و ادب کا عروج بتاتا ہے کہ کافی تعداد مخطوطات کی ہوگی جنھیں راہب دانشور مذہبی مرکزوں میں استعمال کرتے ہوں گے۔

جب ہم چوتھی یا پانچویں صدی عیسوی کے دستاویزی مجموعہ کا خیال کرتے ہیں اور اشوک کے زمانہ میں انتظامی معاملات میں فن تحریر کے بکثرت استعمال کو دیکھتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچنا مشکل نہیں رہتا کہ کتابیں اس سے زیادہ کثرت سے استعمال ہوتی تھیں جتنا آج کل یقین کیا جاتا ہے یا مذہبی مصنفین اور راہبوں کے استعمال میں آتی تھیں۔ شہ

بیرات میں جو سنگ کندہ ہے اور جو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں محفوظ ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ اشوک نے ایک اجتماع میں راہبوں کو مندرجہ ذیل الفاظ میں مخاطب کیا تھا۔

"میری خواہش ہے کہ زیادہ سے زیادہ راہب راہبائیں مندرجہ ذیل مذہبی کتابوں کو توجہ سے سنیں اور ان پر غور کریں: ونے ، متھارشا، آریہ وسا، اناگت بھیانی، منی گاتھا، سونیہ سوترم، اپاتشیہ پراسنے، اور راہول اوادلو۔ جو مہاتما بدھ نے غلط بیانی کے متعلق کہی تھی۔ اسی طرح مہاتما بدھ کے پیرؤوں کو چاہے وہ مرد ہوں یا عورت، کہ انھیں مقدس کتابوں کو دھیان سے سنیں اور ان پر غور کریں"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اشوک کے وقت میں مہاتما بدھ کے اقوال دائرہ تحریر میں آچکے تھے اور وہ راہبوں کے روزانہ مطالعہ اور ورد میں تھے۔

پانینی کے عہد میں (چوتھی صدی عیسوی) ادبی کتابیں اور دستاویزیں وجود میں آکر رائج ہو چکی تھیں۔ پانینی گرنتھوں کا ذکر کرتا ہے (iv. 3. 87 ; IV. 3. 116)۔ کئی قسم کے مصنفین کا تذکرہ ہے: منتر کار، پد کار، سوتر کار، گاتھا کار، شلوک کار، اور شبد کار (iii. 2. 3) کتابوں کو پہچاننے کے اصول جیسے کرت گرنتھ (IV. 3. 116) اور ادھیکرت، کرت گرنتھ، (iv. 3. 87) اور کتابوں کو لکھنے کا طریقہ یا تانتریکتی (IV. 3. 87) وغیرہ ملتے ہیں۔ کوٹلیہ، چرک اور سشرتا کو بھی کتابیں ترتیب دینے اور لکھنے کا طریقہ معلوم تھا۔

---

2. The History and Culture of Indian People
   Ed. R.C. Mazumdar, Vol. 2,p.385.

مہابھارت کے زمانہ میں زبانی تعلیم کی سرپرستی کے باوجود مخطوطات پڑھنا رائج تھا۔ مہابھارت کے شانتی پرو میں وششٹھ نے مہاراجہ جنک سے کہا "حضور والا (یعنی مہاراجہ جنک) آپ نے ویدوں اور دوسرے شاستروں کو مطالعہ کیا ہے لیکن آپ انکی اہمیت سمجھنے میں ناکام رہے۔ آپکے اس مطالعہ سے کوئی نتیجہ نہ نکلے گا جو صرف گرنتھوں کو پڑھتے لیکن ان کے باطنی معنی اور اہمیت کو نہیں سمجھتے ان کا مطالعہ بے سود ہے۔ وہ صرف کتابوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کا پڑھنا مفید ہے جو اس کے پوشیدہ مطالب سے آگاہ ہیں اور گرنتھوں کی مدد سے متعلقہ سوالوں کے جوابات دے سکتے ہیں"[3]

ہندوستان میں بدھ زمانہ میں تحریر استعمال میں لائی جاتی تھی اور مخطوطات کو کافی پڑھا جاتا تھا۔ تحریر اور سامان تحریر سے متعلق کافی حوالے ملتے ہیں اور ان دو الفاظ یعنی "پستم وچیتی" کو جٹاکا کے مطالعہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ٹنڈیلا جٹاکا میں فیصلوں کی ایک کتاب لکھنے کا حوالہ ہے جس میں کہا گیا ہے "اس کتاب کی روشنی میں تمہیں مقدمات فیصل کرنا چاہیئے"۔ (iii : 292) سیتاکیتو جٹاکا سے ہمیں ایک ٹھوس حوالہ ملتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخطوطات تھے اور استعمال بھی ہوتے تھے۔ اتفاق سے اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مخطوطہ کو کس طرح لپیٹ کر رنگین کپڑے میں اور پالش شدہ اسٹینڈ پر کیسے رکھا جائے (iii . 235)۔

آثار قدیمہ اور ادبی شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان یعنی چوتھی صدی قبل مسیح سے مخطوطات تحریر کیے جاتے تھے اور مطالعہ کیے جاتے تھے، اور یہ مفروضہ بالکل قدرتی ہے کہ اہم علمی مراکز میں اور شخصی تحویل میں مخطوطات کے ذخیرے رہے ہوں گے۔ ان اہم مراکز میں جو شاہی عطیات سے بھی بہرہ ور تھے ہندوستان کے مختلف حصوں اور بیرونی ملکوں سے طالب علم فاضل استادوں سے تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ جٹاکا میں ایسے دو اہم مرکزوں یعنی ٹکسلا اور بنارس کا حوالہ ملتا ہے۔ جہاں لوگ اعلیٰ تعلیم کے لیے آتے تھے۔ اور یہ بھی یقینی ہے کہ ان مرکزوں کے مخطوطوں اور اصل کتابوں اور تفسیروں کے الگ الگ ذخیرے ہوں گے۔ اب تک آثار قدیمہ نیز بدھ اور برہمن کتابوں سے تحریر کا اور نئی کتابیں لکھنے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اب ہندوستان میں زمانۂ قدیم میں کتب خانوں کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے ہمیں چینی سیاحوں کی تصانیف کو دیکھنا ہے وہ سیاح جنھوں نے بدھ مذہبی اداروں میں تعلیم حاصل کی اور مخطوطات نقل کیے۔ فاہیان، ہیوان سانگ اور اٹسنگ کی چونکہ ذاتی اور چشم دید شہادت ہیں اسلیے زیادہ مصدقہ مانی جائینگی اور دوسری شہادتوں کی توثیق میں مددگار بھی ہوں گی۔

3. Mahabharata, Santi Parva, 305

پانچویں صدی عیسوی کے کتب خانے (فاھیان کا بیان)

قدیم ہندوستان کے کتب خانوں کے بارے میں مشہور چینی سیاح فاہیان کا سفری روزنامچہ ایک عام دسترخوان کی حیثیت رکھتا ہے وہ 399ء میں ہندوستان آیا اور اس نے 414ء تک قیام کیا۔ اس کی آمد کا مُدعا یہ تھا کہ وہ مقدس مقامات کی زیارت کرے اور بدھ مقدس کتابیں جمع کرے تاکہ چینی عبادت خانوں میں بدھ طریقۂ عبادت جاری ہو سکے[4]

بہ حیثیت بُدھ دیندار کے فاہیان نے شمالی ہند کے اہم بُدھ مقدس مقامات کی زیارت کی۔ اس طرح اسکا سفری روزنامچہ بدھ عہد کے ہندوستان کی مختصر مگر صحیح تصویر پیش کرتا ہے۔ فاہیان خشکی کے راستہ کھوتان اور کاشغر ہوتا ہوا ہندوستان آیا۔ مندرجہ ذیل سطور کے ذریعہ اس نے بتایا ہے کہ اس دور میں بدھ لوگ ہندوستان میں مخطوطات کا مطالعہ کرتے تھے۔

> "اس نقطہ سے مغرب کی طرف سفر کرو تو لوگ یکساں اور مشابہ ہیں صرف تاتاری زبان جو وہ بولتے ہیں جداگانہ ہے۔ اس کے علاوہ جنہوں نے اپنی خاندانی زندگی ترک کر دی ہے (یعنی پجاری اور راہب) وہ ہندوستانی کتابیں پڑھتے ہیں اور ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں کا مطالعہ کرتے ہیں"[5]

شمال مغربی ہندوستان یعنی پنجاب اور متھرا سے ہوتا ہوا فاہیان وسطی علاقہ میں داخل ہوا۔ اپنے روزنامچہ میں اس نے وسط ہند کی سماجی مذہبی روایات کو بیان کیا ہے اور خاص طور سے مذہبی عبادت گاہوں کی دیکھ بھال اور مخطوطوں کے استعمال کا مندرجہ ذیل الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

> جب مہاتما بدھ دنیا سے سدھارے تو بادشاہوں اور بزرگوں نے درگاہیں قائم کیں تاکہ راہبوں اور پجاریوں کو نذریں دی جا سکیں۔ انہیں زمین، مکان اور باغ دیے آدمی اور بیل دیے تاکہ زراعت کر سکیں اور ان عطیات کی توثیق کے لیے ضبط تحریر میں آئے اور ایک عہد سے دوسرے بادشاہ نے اس روایت کو برقرار رکھا

---

4. The Travels of Fa-Hsien, Giles, p.1

5. The Travels of Fa-Hsien, Giles, p.5
6. The Travels of Fa-Hsien, Giles, p.21

اس کے علاوہ راہبوں کی زندگی کے دلچسپ تفصیلات ہمیں ذیل کی عبارت سے ملتی ہیں :-

"ان مقامات پر جہاں پجاری رہتے ہیں ۔ سری پتر کے اعزاز میں پگوڈا بنائے جاتے ہیں اور حکمت دانند (یعنی آنے والے بدھ) اور ابھیدھرم کے لیے ۔ ونے اور سوتر (بدھ مقدس اصول) کے لیے بھی پگوڈا بنائے جاتے ہیں[7] ۔ بدھ مقدس کتابوں کی بڑی عزت ہوتی تھی اور عبادت گاہوں میں مذہبی استادوں اور کتابوں کی یادگار کے طور پر استوپ بنائے جاتے تھے ۔ استاد اور طالب علم جو ابھیدھرم ، ونے اور سوتر وغیرہ کی تدریس سے متعلق تھے ان استوپوں پر نذریں گزارتے ۔

اس کے باوجود زبانی تعلیم کی روایت شمالی ہند میں برقرار تھی اس لیے فاہیان جب ان مقامات پر گیا تو وہاں کیا مضامین پڑھائے جاتے تھے انھیں تحریری شکل میں حاصل کر سکا[8] ۔

"فاہیان بنارس سے پاٹلی پتر پہنچا جہاں وہ تین سال ٹھہرا اور سنسکرت (پالی) لکھنا اور بولنا سیکھا اور مختلف مضامین کے جو مخطوطات تھے ان کو نقل کیا[9] ۔

"ونے" کا جو نسخہ یہاں دستیاب ہوا وہ تفصیل اور مکمل تھا ۔ پاٹلی پتر کی عبادت گاہ کی لائبریری سے اس نے "ابھیدھرم" (فلسفیانہ اصولوں کا حصہ) کے اقتباسات لیے جو چھ ہزار پیراگراف پر مشتمل تھے ۔ ایک مکمل نقل "ین" (؟) کی ۔ "سوتر" کے دو ہزار پانچ سو پیراگراف اور "دیپلیا پری نروان" کے پانچ ہزار پیراگراف نقل کیے ۔

واپسی کے وقت وہ تملوک میں دو سال ٹھہرا جو ہگلی کے دہانہ پر ایک بندرگاہ ہے وہاں اس نے چوبیس عبادت گاہوں کا دورہ کیا جنمیں پجاری رہتے تھے اور "سوتر" کی نقل کی اور بدھ بتوں کے قلمی خاکے تیار کیے[10] ۔

فاہیان کی تحریروں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پانچویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں فنِ تحریر اور نقل نویسی سے واقفیت تھی ۔ اہم نمایاں عبادت گاہوں کے اپنے کتب خانے تھے ۔ فاہیان پاٹلی پتر اور تملوک عبادت گاہوں کے کتب خانوں میں گیا اور اس نے چین کی بدھ خانقاہوں کے لیے مذہبی کتابیں جمع کیں ۔

---

7. The Travels of Fa-Hsien, Giles, p.22

8. The Travels of Fa-Hsien, Giles, p.64.

9. The Travels of Fa-Hsien, Giles, p.65.

10. The Travels of Fa-Hsien, Giles, pp.65-66.

3۔ ساتویں صدی عیسوی کے کتب خانے (ہیون سانگ کا بیان)

فاہیان کے بعد دوسرا اہم چینی سیاح ہیوان سانگ تھا جو 629ء سے 643ء تک ہندوستان میں رہا یعنی اس کا قیام سولہ سال رہا۔ اس کی آمد کا مقصد یہ تھا کہ "مشہور زمانہ بدھ زیارت گاہوں کو دیکھے اور مہاتما بدھ نے جو دوسروں کی دست گیری کی اس کے شواہد جمع کرے .... مقدس کتابیں جمع کرے اور ہندوستان میں ان علوم کے جو پنڈت ہیں ان سے اصول دین سیکھے اور ان کے معنی و مطالب سمجھے"[11]۔

اس کا بیان بہت دلچسپ ہے اور اس زمانہ کی سماجی، مذہبی حالت کو بیان کرتا ہے۔ وہ شمالی ہند میں 629ء سے 645ء تک مذہبی اداروں کے کتب خانوں کی تاریخ بیان کرتا ہے۔ اس کے بیان میں پہلے ہندوستان کی عام حالت کا ذکر ہے۔ تحریر اور ہندوؤں کے سرکاری ریکارڈ کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

> "ان کا طرز تحریر برہما نے ایجاد کیا اور شروع میں 47 حرف بنائے۔ جیسے جیسے چیزیں سامنے آتی رہیں ان حروف کو ملا کر بڑے الفاظ بنائے گئے اور وہ پانی کے چشموں کی طرح پھیلتے چلے گئے اور زمانے میں جگہ اور مقام کے بدلنے سے تھوڑی تھوڑی تبدیلی آتی گئی"[12]۔

اس بیان سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ سنسکرت طرز تحریر استعمال ہوتا تھا اور لوگ کاغذات محفوظ رکھنے کے عادی تھے۔ ذیل کی سطور سے معلوم ہوگا کہ سرکاری ریکارڈ اور کاغذات کی دیکھ بھال ہوتی تھی بلکہ ان کو باقاعدہ محفوظ رکھا جاتا تھا۔ یہ بیان اس طرح ہے:

> "قدیم مخطوطات اور ریکارڈوں کے لیے الگ الگ محافظین ہیں۔ سرکاری اور ملکی کاغذات کو مجموعی طور پر "نیلو۔ پی۔ تو" کہا جاتا ہے۔ ان کاغذات میں بدنام اور نیک نام لوگوں کا ریکارڈ رہتا ہے اور عوام پر اثر انداز ہونے والے تباہیوں، بربادیوں اور خوش آئند حالات کی تفصیل ہوتی ہے"[13]۔

---

11. Yuan Chwang: Watters : p.11
12. Yuan Chwang: Watters : p.152
13. Yuan Chwang: Watters : p.154

اس کے علاوہ اس کے بیان میں ہمیں برہمن نظام تعلیم کی جھلک ملتی ہے یعنی ویدوں کو بدھ لوگ جنھوں نے برہمی ازم کو قبول کر لیا کس طرح بذریعہ تحریر دستاویزوں کی شکل میں لائے[14]

چینی سیاح سفر کرتا ہوا گندھارا پہنچا جہاں اس نے ایک ہزار بدھ عبادت گاہوں کو خستہ حالت میں دیکھا۔ "پرُوساپورا یا پساور کا وہار جسے کنشک نے بنوایا تھا علوم کا مرکز تھا۔" جب سے یہ وہار تعمیر ہوا اس نے غیر معمولی قابل ہستیاں پیدا کی تھیں جنھوں نے ارہات اور شاستروں کو جنم دیا اس وقت بھی ان کا اثر غالب تھا[15]۔ اسی عبادت گاہ میں ابھیدھرم، کوشش شاستر اور وبھاشالُن جیسی کتابیں وسوبندھو اور منورتھ نے تحریر کیں۔ یہ لوگ اسی عبادت گاہ میں تھے اور انھوں نے مشہور کتابیں تحریر کیں۔

اودیان، بولر اور ٹیکسلا کو دیکھتا ہوا ہیوان سانگ کشمیر پہنچا اس کی سوانح سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس نے ایک رات جیندر عبادت خانہ میں بسر کی، دوسرے روز وہ شاہی دعوت نامہ پر محل میں داخل ہوا اور وہاں دو سال رہا۔ بادشاہ کشمیر نے بیسیوں قابل بھدنتوں کو اس کی مدد کے لئے مقرر کیا اور اس کو دعوت دی کہ وہ مذہبی کتابوں کو پڑھے اور تفسیر بیان کرے اور بیس خوش نویس دیئے کہ وہ مخطوطات کی نقل کریں۔ اور پانچ خدمت گار دیئے[16]۔ ان سطور سے پتہ چلتا ہے کہ کشمیر کے دربار میں شاندار شاہی لائبریری تھی۔ مخطوطات کو عام طور سے پڑھا جاتا تھا اور ان کے نقل کرنے کا بھی سامان تھا۔

کنشک کی علم دوستی اور مطالعے کے حوالہ سے وہ کہتا ہے: "یہ گندھارا کا بادشاہ بڑا طاقتور تھا اس کا اثر عالمگیر تھا اپنے فرصت کے اوقات میں وہ بدھ مقدس کتابیں پڑھتا تھا اور شاہی محل میں ہمیشہ ایک راہب رہتا تھا جو اُسے مذہبی مشورہ اور ہدایت دیتا تھا۔"[17]

بادشاہ کنشک بدھ مقدس کتابوں کی متضاد تفسیروں سے بہت پریشان ہوا اور صحیح تفسیر کے لیے اس نے حکم دیا کہ تمام ترپٹکا کتب جمع کر لی جائیں اور تمام بدھ علماء کو مشاورت کے لیے طلب کیا۔ "اس مجلس مشاورت نے ایک لاکھ پیراگراف اپدیش شاستر کے مرتب کیے جو سوتر کو مفصل بیان کرتے ہیں۔ ایک لاکھ پیراگراف ونے وبھاشا شاستر کے تحریر کیے جو ونے کی تفصیل دیتے ہیں۔ اور ایک لاکھ پیراگراف ابھیدھرم وبھاشا شاستر کے ترتیب دیئے

---

14. Yuan Chwang: Watters : p.160
15. Yuan Chwang: Watters : p.205
16. Yuan Chwang: Watters : p.259

جو ابھیدھرم کی تشریح کرتے ہیں تریپٹکا کی اس تفسیر کے لیے قدیم ترین نسخوں کا عمیق مطالعہ کیا گیا اور اس کے مفہوم اور زبان کو صاف اور واضح بنایا گیا اور اس کو پیروان مذہب اور شاگردوں کے لیے دور دور تک پہنچایا گیا۔ بادشاہ کنشک نے ان کتابوں کو تانبہ کی تختیوں پر کندہ کروایا اور انھیں پتھر کے صندوقوں میں بند کرکے ایک گنبد میں رکھوایا جو اسی مقصد کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔[18]

اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ گندھار کے علاقہ میں اہم عبادت گاہیں تھیں۔ یہ وہ مراکز تھے جہاں بدھ علماء درس دیتے، نئی کتابیں تحریر کرتے اور اپنی اپنی لائبریریاں رکھتے تھے اس کے علاوہ درباری وزراء اور امراء بھی اپنی ذاتی لائبریریاں رکھتے تھے۔ ہیوان سانگ شاہ کشمیر کی شاہی لائبریری میں دو سال رہا اور بادشاہ نے بڑی عنایت سے بیس خطاط مخطوطات کو نقل کرنے کے لیے مقرر کیے مخطوطات کو پڑھنا اس دور میں عام تھا اور بادشاہ اور رؤسا بھی کسی عالم کی مدد سے ان کو پڑھا کرتے تھے۔ بادشاہ کنشک کا تریپٹکا کے نسخوں کو جمع کرنا اور ایک جامع تفسیر کو وجود میں لانا مندرجہ بالا حقائق کی تصدیق کے لیے کافی ہے۔

مخطوطات تحریر کرنا ان کو جمع کرنا اور ان کو بطور تحفہ دینا ایک دستور بن چکا تھا اور اس سے قبل کے قصوں میں ارہاٹ کا ذکر آتا ہے جبکہ ایک ہاتھی پر مقدس کتابیں لاد کر انھیں مشرقی ہندوستان سے باہر بھیجا گیا۔[19]

سیاح اپنے بیان میں آگے جیتوانہ عبادت گاہ کی تاریخ بیان کرتا ہے جو اس وقت زوال پذیر ہو چکی تھی۔ واٹرس نے مندرجہ ذیل تفصیل اس کے بارے میں چینی نسخہ سے تلاش کی۔

"جیتوانہ عبادت گاہ جو غالباً نہ زیادہ بڑی تھی نہ اتنی اہم اس کی اچھی طرح دیکھ بھال بھی نہیں کی گئی اور مہاتما بدھ کی حیات ہی میں آگ لگنے سے تباہ ہو گئی۔ سودتا کی موت کے بعد یہ مقام بے توجہی کا شکار ہوا کیونکہ عمارت اور متعلقہ میدان کی نگرانی کے لیے کوئی نہ تھا۔ اس کے بعد ایک نیا دوبار تعمیر کیا گیا جو اس سے وسیع تھا لیکن وہ بھی آتش زدگی کا شکار ہوا۔ اور ایک جگہ ہم پڑھتے ہیں کہ یہ جگہ بدھ پجاریوں نے بالکل چھوڑ دی اور بادشاہ کے اصطبل کے طور پر استعمال ہوئی لیکن بعد میں اس عمارت میں بدھ راہب دوبارہ آئے اور اس کو از سر نو تعمیر کیا۔ اس عبادت گاہ کے عروج کے ایام میں جیتوانہ بہت بڑا اور عالیشان ادارہ رہا ہوگا۔ تبلیغ کے لیے کمرے۔ مراقبہ کے لیے ہال۔ کھانے کے کمرے۔ راہبوں کے لیے کمرے۔ غسل خانے۔ اسپتال۔ کتب خانے۔ مطالعہ کے کمرے معہ خوشگوار

---

18. Yuan Chwang: watters : p.271

19. Yuan Chwang: watters :p .281

سایہ دار حوض اور چہار دیواری سب کچھ وہاں موجود تھا۔ لائبریری میں نہ صرف بدھ مقدس کتابیں تھیں بلکہ ویدک، غیر بدھ کتب اور فنون و سائنس پر جو ہندوستان میں پڑھائے جاتے تھے، دوسری کتابیں بھی موجود تھیں۔[20]

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ عبادت گاہوں کی لائبریریوں میں مطالعہ کے لیے کمرے تھے اور ان کے مخطوطات کے ذخیروں میں نہ صرف مذہبی بلکہ دیگر علوم و فنون اور سائنس کے مخطوطات موجود تھے۔ ان عبادت گاہوں کا یہ وسیع المشرب رویہ قدیم ہندوستان کے کتب خانوں کے مقاصد کو پورا کرتا ہے جن میں سے جیتوانہ لائبریری ایک تھی۔

سیاح نے اس کے بعد ویشالی علاقہ میں سویتاپور عبادت گاہ کو دیکھا۔ "یہاں کی عبادت گاہ دو منزلہ عمارت تھی جس میں چمکدار رنگین بڑے کمرے تھے یہاں اس کو مہایان کتاب بدھ ستوپٹکا کا ایک نسخہ ملا تھا۔"[21]

چینی سیاح دوران سفر میں جنوبی کوشل (ودھرب یا برار) گیا وہاں اس نے سو عبادت گاہیں بدھ مذہب کی پائیں۔ اُن میں سے ایک فاہیان کبوتر عبادت خانہ تھا جس میں حجرے اور بڑے ہال تھے ...... سب سے بالائی منزل کے ہال میں ناگرجن نے ساکیہ منی بدھ کی مقدس کتابیں اور بو ساس کی تصانیف رکھیں۔[22]

سولہ سال قیام کے بعد ہیوان سانگ اپنے وطن واپس آیا اور اپنے ساتھ اور چیزوں کے علاوہ ایک بڑی تعداد مخطوطات کی بھی لایا جس میں 657 الگ الگ کتابیں تھیں اور وہ 520 صندوقوں میں تھیں۔[23] یہ کتابیں حسب ذیل ہیں:۔

ستھاویرا واد سوتر، شاستر اور ونے	14 کتابیں
مہاسنگھیکا	15 کتابیں
مہی سسکا	22 کتابیں
سمیتیہ	15 کتابیں
کسیاپیا	17 کتابیں
سروستی واد	67 کتابیں

---

20. Yuan Chwang: Watters :pp.385-86.
21. Yuan Chwang: Watters : Vol.II,p.80
22. Yuan Chwang: Watters : Vol.II,p.201
23. The Life of Hiuen-Tsang,Peking 1959,pp.208-9.

مہایان سوتر	224 کتابیں
مہایان شاستر	192 کتابیں
دھرم گپت	42 کتابیں
ہیتو ودیا	36 کتابیں
شبد ودیا	23 کتابیں

واپس جانے کے بعد بھی ہیوان سانگ نے نالندہ یونیورسٹی کے عہدہ داروں نے تعلقات باقی رکھے اور خط و کتابت جاری رہی۔ چینی سیاح کے مخطوطات کا ایک بنڈل اس وقت ضائع ہوگیا جب دریائے سندھ میں اس کا جہاز تباہ ہوا۔ ہیوان سانگ کے ایک خط میں جو اس نے ستھادیرا پرجنا دیو کو لکھا تھا گم شدہ مخطوطوں کی ایک فہرست تھی اور اس سے درخواست کی تھی کہ وہ ان کو نقل کر کے اس کے پاس بھیجے[24]

بدھ سیاح نہ صرف چین بلکہ جاپان اور کوریا سے بھی ہندوستان آئے تاکہ بدھ مقدس کتابوں کو جمع کر سکیں اور نقل کر سکیں۔ 629ء سے 671ء تک تقریباً 57 سیاح چین جاپان اور کوریا سے ہندوستان آئے اور ان سب کا مقصد یہی تھا کہ مذہبی کتابیں جمع کریں اور نقل کریں[25]

ہیوان سانگ کے فوراً بعد کوریا کا ایک سیاح جس کا نام آریہ ورمن تھا ہندوستان آیا۔ وہ فنون اور ابھیدھرم کتابوں کا عالم تھا اس نے نالندہ میں بہت سے سوتر نقل کیے اور اسی دور میں دو اور کوریائی سیاح جنکے نام" ہودئی یخ اور "تاؤ ہی" تھے نالندہ آئے۔ اوّل الذکر نے وہاں تعلیم حاصل کی اور بہت سی سنسکرت کتابیں تصنیف کیں[26] اٹسنگ کا قیام جب نالندہ میں تھا ایک روز اسے ہودئی یخ کا کتب خانہ دریافت ہوا جس میں بہت سی چینی زبان اور سنسکرت کی کتابیں تھیں[26] تاؤ ہی بھی کئی سال نالندہ میں رہا جہاں انہوں نے عظیم سواری پر کتابیں پڑھیں اور سوتر کے چار سو باب تحریر دیا نقل کیے[28]

655ء میں شہنشاہ تائسنگ کے دور حکومت میں وسطی ہند کا ایک سرامن ناوی نامی چین پہنچا جس کے پاس ۔

---

24. These letters Possibly written in Sanskrit are now preserved in Chinese translations in the annals of the Tang dynasty.

25. India's Diplomatic relations with East, Saletore, p.319

26. India's Diplomatic relations with East, Saletore, p.309

27. Indian Literature in China and Far East, Mukherjee, p.279.

28. India's Diplomatic relations with the East, Salteore, pp. 309-10.

پندرہ سو سے زیادہ مہایان اور ہنایان مقدس کتابوں کے نسخے تھے[29]

4۔ ساتویں صدی کے کتب خانوں سے متعلق اٹسنگ کا بیان

اپنے عظیم پیشروؤں کی شخصیتوں سے متاثر ہو کر ایک اور اہم چینی سیاح جو ہندوستان آیا اس کا نام اٹسنگ تھا اس کا مقصد تھا کہ مقدس ونے اصولوں کے مصدقہ نسخے حاصل کرے اور شبہ مخطوطات جمع کرے۔ وہ ہندوستان سمندری راستہ سے 627ء میں پہنچا اور یہاں تیرہ سال ٹھہرا۔

اٹسنگ کا سفری روزنامچہ ہمیں عبادت گاہوں کے کتب خانوں کی تفصیلات پر اہم معلومات فراہم کرتا ہے[30] اور ان سابق معلومات میں جو فاہیان اور ہیوان سانگ نے چھوڑیں اضافہ کرتا ہے: چونکہ وہ سمندری راستہ سے ہندوستان آیا اس لیے وہ تمرالپتا کے بندرگاہ پر پہنچا اور اس نے وہاں چار ماہ قیام کیا وہاں اس نے راہبوں کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا اس کے زمانہ میں ایک بھکشو جن کا نام ارہلامتر (راہل متر) تھا عبادت گاہ میں رہتے اور روز رتنا کتا سوتر کا ورد کرتے تھے جس میں سات سو شعر تھے۔ بھکشو نہ صرف تین مجموعوں کے ماہر تھے بلکہ غیبی کتابوں پر بھی انھیں عبور حاصل تھا۔ علمی درس کے درجات اور استاد و شاگرد کے تعلقات کے بارے میں ہمیں اٹسنگ بتاتا ہے کہ طالب علم ونے پٹکا پڑھنے کے بعد سوتر اور شاستروں کا مطالعہ کرتا ہے[31] اس سے کہا جا سکتا ہے کہ اٹسنگ کے زمانہ میں عبادت گاہوں میں مطالعہ کا رواج تھا اور مختلف علوم کے لیے ابتدائی اور بلند پایہ کتابیں موجود تھیں۔

سنگھ کی جائداد اور اس کے استعمال کے بارے میں وہ ذیل کا بیان دیتا ہے:۔

قیمتی اشیا کو مقدس اسٹور میں رکھا جانا چاہیے اور وقت بضرورت مریضوں کو مہیا کرنا چاہیے قیمتی پتھر اور اس قسم کی دوسری چیزوں کو دو حصوں میں بانٹا جاتا ہے ایک وہ جو پجاریوں کے استعمال کی ہیں یعنی سنگھکا۔ اول الذکر کو مقدس مخطوطوں کی نقل کے لیے یا شیر کے مقام کی آرائش کے لیے خرچ کیا جاتا ہے اور دوسرا حصہ موجود راہبوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ لکڑی کی کرسیاں عام استعمال

---

29. India's Diplomatic relations with the East Salteore, p.313
30. A record of the Buddhist religion as preached in India and the Malay Archipelago (A.D.671-695) by I-Tsing, P.63.
31. A record of the Buddhist religion as preachedin India and the Malay Archipelago(A.D.671-695) by I-Tsing,p.104

کے لیے ہیں لیکن مقدس کتابیں اور ان کی تفسیر کو تقسیم نہیں کیا جاتا بلکہ وہ لائبریری میں رکھنے کے لیے ہیں تاکہ سنگھ کے افراد کے مطالعہ میں آسکیں۔ غیر بدھ کتابیں بکنے کے لیے ہیں اور اس سے جو روپیہ حاصل ہو وہ بھکاریوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے۔[32]

اوپر کے بیان سے ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ راہبوں کے ذاتی کتب خانے تھے اور عبادت گاہوں کے بھی کتب خانے تھے جو عمومی استعمال کے تھے۔ اٹسنگ کے بعد بہت سے چینی سیاح ہندوستان آئے ان میں سے ایک "ہاؤلن" تھا جو کنگ چاؤ (ہیچے) کا باشندہ تھا اس نے تمرالپتا میں تین سال سنسکرت کی تعلیم حاصل کی اور چند سال نالندہ میں قیام کیا تاکہ کوشش کا مطالعہ کرے۔[33]

"تانگ کوانگ" دوسرا سیاح تھا جو سمندر کے راستہ سے اراکان پہنچا۔ اسے بادشاہ کی سرپرستی حاصل ہوئی اس نے ایک بدھ مندر بنوایا، کتابیں لکھوائیں اور مہاتما بدھ کے بت بنوائے۔ اس کے بعد "ہیوان" تمرالپتا پہنچا وہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے نالندہ آیا اور وطن واپس جاتے ہوئے اپنی تمام کتابیں اور ترجمے جن کی تعداد ایک ہزار تھی اپنے ہمراہ لے گیا۔[34]

751ء میں یوکانگ (دھرم دوت) ایک چینی سیاح مشرقی ایشیا ہوتا ہوا کشمیر پہنچا وہ نالندہ میں دس سال ٹھہرا 790ء میں وہ چین واپس گیا اور اپنے ساتھ دس بھومی اور دس بالا سوتر اور دوسری کتابوں کے سنسکرت نسخے لے گیا۔[35]

964ء اور 976ء کے درمیان چین کے شہنشاہ نے "کی۔ تے" کی قیادت میں تین سو راہبوں کا ایک وفد ہندوستان بھیجا تاکہ بدھ تبرکات، نشانیاں اور کھجور کی پتیوں پر جو مخطوطات ہیں ان کو تلاش کرے اور حاصل کرے۔[36]

تقریباً 969ء میں ایک ہندوستانی بدھ پجاری چین سے کچھ سنسکرت کتابیں ہندوستان لایا اور

---

32. A record of the Buddhist religion as preached in India and the Malay Archipelago (A.D.671-695) by I-Tsing, p.192.

33. India's Diplomatic relations with the East, Saletore, p.319

34. India's Diplomatic relations with the East, Saletore, p.319

35. India's Diplomatic relations with the East, Saletore, p.322

36. India's Diplomatic relations with the East, Saletore, p.336

پھر سفیر وہاں سے کتب لاتے رہے[37]۔ 965ء میں ہندوستانی پجاریوں کا ایک گروہ بحری جہاز کے ذریعہ چے گان پہنچ گیا اور بادشاہ کے لیے پیتل اور تانبہ کی گھنٹیاں، بدھ کی مورتی اور کچھ ہندوستانی کتابیں جو پی۔ تو درخت کی پتیوں (کھجور) پر لکھی تھیں لے گئے[38]۔ دوسرا گروہ مغربی ہند سے چین 1025-1041ء آیا اور فان کتابیں اور تحفے لایا[39]۔

آخری سال یعنی 1053ء میں ایک ہندو راہب ہندوستان سے چین آیا۔ چے کیانگ جو مغربی ہند کا سرامن تھا اپنے ساتھیوں کے ساتھ چین آیا اور شاید آخری کتاب چین میں لایا[40]۔

5۔ مشرقی اور وسطی ہندوستان کے اہم تعلیمی مراکز سے وابستہ کتب خانے

یوروپ کے بینے ڈکٹائن کی طرح ہندوستان کے بدھ تابعین نے مخطوطات کے جمع کرنے اور لکھنے پر زور دیا۔ جین اور ہندو علمار نے بھی اپنا اپنا کردار علم کے میدان میں نبھایا۔ انھوں نے ادبی سرگرمیوں کی سرپرستی کی انھوں نے بے شمار ابا سائے اور مندروں سے متعلق کالج قائم کیے آثار قدیمہ اور ادبی حوالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمام اداروں کی اپنی اپنی لائبریریاں تھیں۔

بدھ مذہبی ادارے مثلاً نالندہ، ولبھی، وکرم شلا، اودنتاپوری وغیرہ نے عزت و شہرت حاصل کی اور وہ ہندوستان میں علم کے اعلیٰ مراکز بنے۔ ان اداروں نے تعلیم کے علاوہ مخطوطات کی تحریر، ادارت اور ترجمہ کو فروغ دیا اور ہندوستانی تہذیب کو دور دراز ملکوں میں پھیلایا۔ ان تمام اداروں نے اپنے کتب خانے بھی قائم کیے تاکہ ہزاروں ہندوستانی اور بیرونی طلبار کی تعلیم میں سہولت ہو۔

بدھ اداروں کے علاوہ ہندو راجاؤں مثلاً راجا بھوج اور اودے دتا نے جو مالوہ کے حکمراں تھے اور برہمن تہذیب کے مراکز جیسے متھل وغیرہ نے کتب خانے قائم کرنے میں عظیم کردار ادا کیا۔

---

37. J.A.S.B. Vol. VI,p.72
38. J.A.S.B. Vol. VI,p.75
39. J.A.S.B. Vol. VI,p.75
40. Indian Literature in China and Far East,Mukherjee,p.324

یہاں ہم ان اہم لائبریریوں کا ذکر کریں گے جن کا تعلق مشرقی اور وسطی ہندوستان کے تعلیمی مراکز سے تھا جیسے نالندہ، اودانتاپوری، وکرم سلا، سوماپوری، جگدل اور متھلا اور مغربی ہند کی لائبریریاں جیسے ولبھی، کشمیری اور راجہ بھوج کی شاہی لائبریری وغیرہ۔

نالندہ

بدھ علوم کے اعلیٰ مراکز میں وسطی اور مشرقی ہندوستان میں نالندہ کا مقام اپنی نظیر آپ تھا اس نے قدیم ہندوستان کی تعلیم میں ایک وسیع کردار ادا کیا۔ نالندہ پٹنہ سے جنوب مغرب میں تقریباً چالیس میل پر واقع ہے اور پانچویں صدی کے آغاز تک ایک معمولی گاؤں تھا۔ گپتا خاندان کے بادشاہوں، پالا اور سینا حکمرانوں کی مسلسل سرپرستی نے اس کو ایک یونیورسٹی کی حیثیت سے فروغ دیا۔

جب ہیوان سانگ ہندوستان آیا نالندہ اپنے پورے عروج پر تھی اور تقریباً پانچ ہزار طلبا اس میں تعلیم پاتے تھے۔ اتسنگ بھی نالندہ میں (سنہ 675ء) رہا۔ اور اس وقت بھی یہ ایک اعلیٰ تعلیمی مرکز تھی اور تین ہزار سے زیادہ راہب اس میں رہتے تھے جو ہندوستان کے کونے کونے سے اور دوسرے ملکوں مثلاً چین، کوریا، تبت وغیرہ سے آتے۔ داخلہ کے لیے معیار امتحان کافی بلند تھا۔

تبت کے تاریخی بیان کے مطابق نالندہ میں ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا جسکو دھرم گنج یعنی خزانۂ دھرم کہا جاتا تھا۔[41] اس میں تین بڑی عمارتیں شامل تھیں (1) رتن ساگر (2) رتن وادھی (3) رتن رنجکا۔ ان میں رتن وادھی 9 منزلہ عمارت تھی جس میں مقدس مخطوطات تھے پرجناپرمتیا سوترا اور تانترک تصنیفات تھیں۔ جیسے سماج گیا وغیرہ۔

نویں صدی میں نالندہ کی شہرت پورے عروج پر اور بین الاقوامی سطح کی تھی۔ نالندہ کی تانبہ کی تختی جو دیوپال دیو کی سند عطیہ ہے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بالاپترا دیو کی جو سورن دیپ (جاوا) کا حکمران تھا درخواست کی تعمیل میں دیوپال دیو نے پانچ گاؤں عطا کیے ان میں سے چار راج گرہ (راجگیر) میں واقع تھے اور ایک گیا ضلع بری نگر بھگتی پٹنہ میں تھا۔ یہ عطیہ اس کے ماں باپ کی اور اس کی ذاتی نیک نامی کے لیے، وہاں تابعدوں کے لیے ذریعۂ آمدنی، قابل احترام بھکشوؤں کی آسائش کے لیے، چاکروں کے لیے اور دھرم رتن یعنی بدھ مقدس

---

41) Pag-Samjon-Zang edited in the original Tibetan by Rai Bahadur Sarat Chandra Das, p.92

42. E.I. Vol. 17, p.310

کتابیں لکھنے کے لئے تھا۔ اور اس عبادت گاہ کی دیکھ بھال اور مرمّت کے لئے تھا جو نالندہ میں سورن دیپ کے حکمراں کی درخواست پر تعمیر ہوئی تھی۔

مذکورہ بالا شہادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاوا سماترا کا بادشاہ نالندہ یونیورسٹی کی شان و شوکت سے متاثر ہوا تھا۔ اس نے ایک عبادت گاہ بھی وہاں بنوائی اور بنگال کے راجہ دیو پال کو ترغیب دی کہ وہ اس کی دیکھ بھال اور کفالت کے لیے پانچ گاؤں کا عطیہ دے۔ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اس زمانہ میں مخطوطات کی نقل کرنا ایک مستقل شغل تھی کیونکہ مذکورہ عطیہ کا ایک حصّہ یونیورسٹی لائبریری (دھرم رتناسیا لیکھا نارتھم) میں مخطوطات نقل کرنے کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔

بارھویں صدی کے خاتمہ پر یونیورسٹی اور اس کی شاندار لائبریری کو مسلم حملہ آوروں نے تباہ کر دیا۔ تبت حوالوں کے مطابق ایک درویش نے جس کا نام مُدیتا بھدر تھا ترُسکا حملہ کے ختم ہو جانے کے بعد نالندہ کے مندروں اور عبادت گاہوں کی مرمّت کروائی تھی لیکن آخری تباہی جب ہوئی جبکہ ناراض ترتھکا فقیروں نے عمارت میں آگ اس وجہ سے پھینکی کہ کچھ نووارد لوگوں نے جو نالندہ میں تھے فقیروں کی بے عزّتی کر دی تھی۔ اسی آتش زدگی سے رتن ادھی جل کر راکھ ہو گئی۔[44]

وکرم سلا

آٹھویں صدی عیسوی میں بادشاہ دھرم پال نے وکرم سلا عبادت گاہ کی بنیاد ڈالی۔ جو چار سال تک مشہور علمی مرکز رہا۔ یہ بھاگلپور، بہار سے مشرق کی سمت چوبیس میل کے فاصلہ پر واقع تھی۔[44]

یونیورسٹی کی شہرت کی وجہ سے ہندوستان کے کونے کونے سے اور تبت سے کافی بڑی تعداد میں طالب علم کھنچ کر یہاں آئے۔ تبت کے حوالوں سے بھی پتہ چلتا ہے کہ بُدھ گیان پد، دیرو چینار کشت، جیتاری، رتناکر شانتی، گیان شری متر، رتنا دجر، ابھینکر گپتا، تتھاگاتا رکشت اور اس یونیورسٹی کے دوسرے علماء نے بہت سے مخطوطات سنسکرت میں تحریر کیے اور بہت سے مخطوطات کا تبتی زبان میں ترجمہ کیا۔[45] وکرم شلا کے سب سے مشہور

---

43. Medieval School of Indian Logic by Dr. S.C. Vidyabauson. p. 146

44. J.A.S.B. Vl.7

45. Indian Pandits in the Land of Show, DAs, p.50

عالم دیپانکر شری گیان نے تقریباً دو سو کتابیں لکھیں اور وہ تبت کے راجہ چان جپ کی دعوت پر تبت گئے تاکہ اس ملک میں بدھ مذہب کی اصلاح کر سکیں۔[46]

انھیں ذرائع سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بارھویں صدی میں وکرم شلا میں تین ہزار طالب علم رہتے تھے۔ اور اس سے ملحق ایک شاندار لائبریری تھی۔ دیگر تعلیمی مراکز کی طرح وکرم شلا یونیورسٹی اور اس کی لائبریری دونوں ہی مسلمانوں نے تباہ کیں۔ بختیار خلجی اس کو غلطی سے ایک قلعہ سمجھا اور اس نے اسے تباہ کر ڈالا۔

وکرم شلا یونیورسٹی کی لائبریری کے بارے میں ہمیں طبقات ناصری سے مندرجہ ذیل معلومات حاصل ہوتی ہیں:-

> "ہندو مذہب (بدھ مذہب) پر وہاں بڑی تعداد میں کتابیں تھیں اور جب یہ کتابیں مسلمانوں کے مشاہدے میں آئیں تو انھوں نے بڑی تعداد میں ہندوؤں کو طلب کیا کہ وہ انھیں ان کتابوں کے بارے میں بتا سکیں کہ کہاں سے حاصل ہوئیں لیکن سب ہندو قتل ہو چکے تھے۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ یہ قلعہ اور شہر ہندو زبان کا ایک کالج تھا۔ وہ لوگ کالج کو 'بہار یا دھار' کہتے تھے"۔[47]

اودانتاپوری

اودانتاپوری یونیورسٹی شاید قصبہ بہار شریف کے قریب تھی۔ اور پالا راجاؤں کے مگدھ میں برسر اقتدار آنے سے قبل تھی۔ یہ یونیورسٹی بھی مشہور علمی مرکز تھی اور یہ معیاری حیثیت رکھتی تھی اور اس نے تبت کی پہلی خانقاہ "سام یی" کے لیے جو ۷۴۹ء میں عظیم بدھ مصنف سنترا کشتا نے تعمیر کرائی تھی نمونہ کا فرض انجام دیا۔[48]

جب مگدھ پر گوپی پال اوّل کا قبضہ ہوا تو بہادر اودانتاپوری کی ملکیت پالا راجاؤں کے ہاتھ آئی۔ ان بادشاہوں نے اس کو اور فروغ دیا۔ اس کے اندر ایک عمدہ لائبریری قائم کی جس میں بدھ اور برہمن تصنیفات رکھیں۔[49]

---

46. Indian Teachers of the Buddhist Universities, Bose, Madras, 1923, pp.32-105

47. Tabaqat-i-Nasari, Raverty 1,p.552

48. Medieval School of Indian Logic,Vidyabhusan,pp.124-125

49. Ancient Indian Education, Mukherjee, p.596

محمد بختیار خلجی کی فتوحات نے اس بدھ یونیورسٹی کو بھی تباہ کر دیا ترک اور افغان نے ایک چھوٹا سا قلعہ اس یونیورسٹی کے جائے وقوع پر تعمیر کیا ہے۔[50]

سوماپوری

سوماپوری یونیورسٹی (پہاڑپور، شمالی بنگال) وکرم شلا کی طرح دھرم پال (769-827ء) کے زمانے سے بڑی حیثیت رکھتی تھی۔ تیسا دیپانکر یہاں رہتا تھا اور اس نے بھاوادو یکا کی تصنیف مدھیامک رتن پردیپ کا دوسرے علماء کی مدد سے تبتی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس یونیورسٹی میں بھی نالندہ اور وکرم شلا کی طرح اس کی اپنی لائبریری تھی۔ گیارھویں صدی کے نصف میں یہ یونیورسٹی آگ لگ جانے سے تباہ ہو گئی اس کو ایک راہب نے جس کا نام ویل سری مترا تھا از سر نو تعمیر کیا لیکن یہ اپنے پہلے عروج پر دوبارہ نہ پہنچ سکی۔[51]

جگدل

شمالی بنگال کے شہر راماوتی میں وریندر میں راجہ رام پال نے جس کا عہد 1084ء سے 1130ء تک جگدل عبادت گاہ کو قائم کیا۔ اس یونیورسٹی نے بڑے عالم اور مصنف پیدا کیے۔ مثلاً مہاپنڈت دبھوتی چندر جو مصنف بھی تھے اور مترجم بھی انھوں نے دبرایانا اور کالاچرایانا کتابیں لکھیں۔ داناسیلا جیسا مشہور مصنف جس نے تانترک بدھ ازم لکھی۔ موکشکا گپتا جو منطقی تھے شبھنکر گپتا۔ دھرمکار گپتا وغیرہ۔ اس دور کے طرز تعلیم کے مطابق یہ یونیورسٹی مقدس مذہبی کتابوں کا مرکز تھی اور اس میں مقدس مخطوطات کا شاندار ذخیرہ تھا۔

اس یونیورسٹی میں پنڈت داناسیلا نے سنسکرت کتاب پستک تھوپایا یعنی کتب بینی کا طریقہ تصنیف کی۔ اصل سنسکرت نسخہ تلف ہو چکا ہے لیکن مصنف نے خود اسے تبتی زبان میں ترجمہ کیا تھا اور اس کا تبتی نام ہے "گلگز بلام بجگ بیچی تھبس"۔[52]

بنگال کے گیارھویں اور بارھویں صدی کے کم مشہور وہاروں میں شمالی بنگال کا دیوکتا اور مشرقی بنگال ضلع چٹاگانگ کا پنڈت وہار بحیثیت بدھ علمی اور تہذیبی مراکز کے قابل ذکر ہیں۔[53]

---

50. The Socio Economic History of Northern India (11th & 12th cy.) B.P. Majumdar, p.164

51. E.I.CCI,P.97.

52. Tanjur, Mdo,Ze,267,7-268; Cordier, Vol.3, p.452 & T. H. Qly. V. 3, p. 856.

53. I.C. , p.231

اس کے علاوہ ان اداروں میں مخطوطات کی تصنیف، ادارت اور ترجمہ کی سہولتیں تھیں اور یقینی ہے کہ کتب خانوں کا وجود دوسری تعلیم گاہوں کی روایات کے مطابق رہا ہوگا۔ [54]

متھلا

متھلا برہمن تہذیب کا عظیم الرتبت مرکز تھا جس نے کرناٹک حکمرانوں (1150ء سے 1395ء) اور کامیشور خاندان کے راجاؤں (1350ء سے 1515ء) کے عہد حکومت میں فروغ حاصل کیا۔ اس علمی مرکز نے قابل قدر عالم پیدا کیے مثلاً جگودھارا، گنیش، وردھمانی، شنکر مشرا واچسپتی مشرا وغیرہ۔ جگدھرا نے بہت سی کتابوں کی تفسیر و حواشی رقم کیے مثلاً گیتا، دیوی مہاتمایا میگھدوت، گیت گووند، مالتی مادھو وغیرہ۔ ریاضیات پر کتابیں لکھیں مثلاً رسیکا سروسوا اور سنگیتا سروسو۔ گنیش نے جو نو نیائے اسکول کا بانی تھا یادگار کتاب تتو چنتامنی تصنیف کی۔ شنکر مشرا نے نیائے اور اخلاقیات پر کئی فاضلانہ کتابوں کا اضافہ کیا اور مسرو مشرا نے ایک طبع زاد کتاب وشیشکا پر لکھی جس کا نام پدارتھا چندر ہے۔ [55]

اس طرح متھلا یونیورسٹی نے بھی اس وقت کے روایات کے مطابق ایک بڑی لائبریری قائم کی اور تمام مخطوطات کی حفاظت بڑی الفت اور پرواہ سے کی۔ انھیں مخطوطات سے اس قدر محبت تھی کہ انھوں نے طلباء کو کبھی اجازت نہ دی کہ وہ تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنے لکھے ہوئے مخطوطات واپس لے سکیں اور اس روایت کو بعد میں نیا نے بھی باقی رکھا۔

واسودیو کو جو ندیا کے نئے منطقی اسکول کا بانی تھا، متھلا میں اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد تتو چنتامنی اور کسم انجلی (شاعرانہ حصہ) زبانی یاد کرنا پڑا کیونکہ اسے اجازت نہ تھی کہ وہ متھلا سے تعلیم کے خاتمہ پر جاتے وقت اپنے ساتھ ان نقول کو لے جا سکے جو اس نے ان کتابوں کی کی تھیں۔ اس طرح مخطوطات جمع کرنے کے دستور کی وجہ سے متھلا میں ایک عمدہ لائبریری بن گئی۔

اس کے علاوہ مخطوطات متھلا یونیورسٹی کے آخری امتحان کا ایک اہم جز ہے۔ انھوں نے امتحان کا ایک طریقہ شروع کیا جسے سلاکھا پریکشا کہا جاتا تھا جس میں متعلم کو کسی صفحہ کی تشریح کرنا ہوتی تھی جسے سوئی سے آخر میں سیا گیا ہو۔ [56]

---

54. Bangaleer Itihasa, N.R. Ray, p. 726.

55. Ancient Indian Education, Mukherjee. pp. 596-97.

56. History of Indian Logic, Vidyabhusan, p.523.

متھلا یونیورسٹی پندرھویں صدی کے آخر تک ہندوستان کی ایک اہم درسگاہ بنی رہی۔

مغربی ہند کے اہم تعلیمی مراکز کے کتب خانے

شمالی اور مشرقی ہندوستان کی طرح مغربی ہند میں بھی بے شمار عبادت گاہیں اور مٹھ تھے۔ ان میں سے ولبھی کا مہاوہار جو مغربی گھاٹ پر واقع تھا یعنی موجودہ ہند کے "والا" مقام پر جو کاٹھیاوار میں ہے اور کنہیری عبادت گاہ قابلِ ذکر ہیں۔

ولبھی ولبھی مہاوہار کو میتریکا راجاؤں کی سرپرستی حاصل تھی جنھوں نے 475ء سے 775ء تک حکومت کی اور اس میں ہندوستان کے ہر گوشہ سے طالب علم آئے[57]۔ جس طرح نالندہ یونیورسٹی مہایان بدھ علوم کے لیے مشہور تھی اسی طرح ولبھی ہنایان بدھ تعلیمات کے لیے مشہور تھے۔ مذہبی تربیت اور تعلیم کے علاوہ یہاں دیگر غیر مذہبی علوم مثلاً شلپ ودیا (فنون)، ابھیدھرم کوش (مابعد الطبیعات)، چکتسا ودیا (طب)، ہیتو ودیا (منطق) اور غالباً گنیتم (ریاضی) وغیرہ کی تعلیم کا انتظام تھا۔ ہیوان سانگ کے بیان سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ستھرمتی اور گنامتی اس عبادت گاہ کے نگران تھے اور اس میں کئی سو سنگھرم تھے اور چھ سو راہب تھے[58]۔ ان میں سے ہر سنگھرم ایک جداگانہ کالج کی طرح تھا۔

اس مشہور تعلیمی مرکز میں پوری طرح آراستہ ایک لائبریری تھی اور اس کی تصدیق گُہاسینا کے عطیہ سے ہو جاتی ہے جو 559ء کا ہے جس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ لائبریری (سدھرمیا پستکو پاکرا) میں کتابیں خریدنے کے لیے شاہی عطیہ میں گنجائش رکھی گئی ہے[59]۔

عرب حملہ آوروں کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لیے یونیورسٹی معطل ہو گئی تھی لیکن میتریکا کے جانشینوں نے اپنی امداد جاری رکھی۔ اس طرح اس درسگاہ کا وقار قائم رہا اور اس میں بارھویں صدی تک بنگال کے دور دراز علاقوں سے طالب علم آتے رہے[60]۔

---

57. I.A. IV, p. 174
58. Watters, II, p.266.
59. I.A. VII, p.67
60. I.H.Q., 1949, p. 134.

کنہیری | مغربی کنارے پر کنہیری ایک دوسرا علمی مرکز تھا جو نویں صدی میں اموگھاورشا کے دوران حکومت میں عروج پر تھا۔ کتبہ خوانی کے ذرائع سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ گومن اودکھنا کار جو سبھا تا کا عقیدت مند پجاری تھا اور گوڑ علاقہ کا تھا اس نے اس ادارہ کی بقا کے لیے مناسب وقف قائم کیا جس کا ذکر حسب ذیل ہے:-

"بڑی عنایت اور مہربانی سے بیس (درم) مقدس و پاک ہستی کو خوش کرنے کے لیے اور تین (درم) اس عبادت گاہ کی مرمت کے لیے پانچ (درم) راہبوں کے لباس کے لیے اور ایک درم کتابوں پر خرچ کیا جائے گا۔ کل وقف چالیس درم کا ہے"[61]

کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عمارت بنائی گئی تھی اور اس خانقاہ میں رہنے والے راہبوں کے لیے شاہی عطیہ حاصل ہوا تھا۔ اس ادارہ میں لائبریری کا مقام بہت اہم تھا اور عطیہ دینے والے نے لائبریری کے لئے کتابیں خریدنے کے لیے ایک رقم مختص کر دی تھی۔

7_ مخطوطات کا شاہی ذخیرہ

زمانۂ قدیم ہی سے بادشاہوں اور امراء نے تعلیم کی سرپرستی کی اور مخطوطات کی تحریر اور تحفظ کا انتظام کیا۔ یہ روایت انیسویں صدی تک قائم رہی اور ملکی ریاستوں کے راجاؤں مثلاً الور، بیکانیر، جموں، میسور اور تنجور نے اپنی مخطوطات کی لائبریریاں قائم کیں۔

کشمیر | ہم اس سے پہلے کشمیر کی شاہی لائبریری کا ذکر کر چکے ہیں جہاں ہیوان سانگ نے دو سال کام کیا تھا۔ بادشاہ نے بیس خوش نویسوں کو مقرر کیا تھا کہ چینی سیاح کے لیے مخطوطات نقل کریں۔

کامروپ (آسام) | ساتویں صدی میں کامروپ یعنی موجودہ آسام نے ایک اولوالعزم بادشاہ پیدا کیا جس کا نام بھاسکر ورمن تھا وہ علم کا عظیم سرپرست تھا بھاسکر ورمن کا قنوج کے

---

61. 1.A. Vol. 13, p.137

ہرشں ورد ھن سے قریبی تعلق تھا اور چینی سیاح ہیوان سانگ سے قربت نے اسے بدھ یونیورسٹی نالندہ سے قریب کر دیا۔

ہرش چرتر مصنفہ بانا سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہرش وردھن نے بھاسکر ورمن کو کچھ تحائف اپنے ایک معتمد سفیر ہنگش ویگ کے ذریعہ بھیجے۔ ان تحفوں میں اور چیزوں کے علاوہ ساچی کی چھال سے بنائی ہوئی پتیوں پر لکھی مخطوطات کی جلدیں تھیں۔ یہ پتیاں پکی ہوئی ککڑی جیسی یعنی ہلکی گلابی رنگ کی تھیں (اگرو ولکالا کلپتا سنکاسینی چاسبھاستا بھنجی پستکانی پرینا پتالا پتولاتسی)۔ ادب میں ہش کی ہوئی شہادت ہمیں بتاتی ہے کہ قدیم ہندوستان میں ریاستوں کے راجہ کتابوں کو تحفہ میں دوستی و محبت کی نشانی کے طور پر بھیجتے تھے۔

مالوہ

مالوہ کے پرمار راجاؤں کی تاریخ سے جنھوں نے دسویں اور گیارھویں صدی میں حکومت کی ایک اور مثال تعلیم کی شاہی سرپرستی کی ملتی ہے۔ پرمار بادشاہ کتابوں کے عاشق تھے اور ان کے دوران حکومت میں مالوہ ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کے لیے مشہور ہوا۔

راجہ بھوج جسنے ۱۰۱۸ء سے ۱۰۶۰ء تک حکومت کی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ وہ خود بھی ایک قابل قدر مصنف تھا[62] اور اس نے ہمیشہ طلباء اور عالموں کی حوصلہ افزائی کی[63] اس کی حکومت میں بہت سے تعلیمی ادارے قائم ہوئے۔ راجا بھوج نے ایک کالج کی بنیاد ڈالی جو آج کل کمال مولا مسجد کے نام سے دھارا مقام پر ہے اور ۱۰۳۳ء میں واگ دیوی کا بت بنوایا[64] یہاں تک کہ آج بھی کمال مولا مسجد کو عوام بھوج شالہ یا بھوج کا اسکول کہتے ہیں اور اس میں ایسے نقشے ہیں جس میں حروف تہجی اور قواعد کے اصول لکھے ہیں۔ اسی عمارت میں بادشاہ نے اپنی لائبریری قائم کی جس میں بادشاہوں شاعروں اور عالموں کی تصانیف تھیں۔ ۱۱۶۰ء میں راجہ سدا راج جے سمہا نے مالوہ کو فتح کیا اور شاہی کتب خانہ کو انہل واد منتقل کیا[65]

---

62. History of Paramara Dynasty. D.C. Ganguly, pp.278-79.

63. Ain-i-Akbari (Jarrett) Vol. II, p.226.

64. History of Paramara Dynasy, D.C. Ganguly, p. 85.

65. Indian Paleography, Buhler, P93

اس طرح نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ بدھ ازم کی طرح جین ازم نے بھی مغربی ہند میں کتب خانوں کو فروغ دیا اور بڑے پیمانہ پر مخطوطات کو پڑھنے اور تحریر کرنے کو رواج دیا۔ ہندوستان کی لائبریری کی تاریخ نامکمل رہ جائے گی، اگر جین بھنڈاروں کے حوالے نہ دیئے جائیں۔ ان کے بارے میں پروفیسر پیٹرسن کہتے ہیں۔

> "مجھے نہیں معلوم کہ ہندوستان کا کوئی شہر یا دنیا کے چند شہروں کے علاوہ کوئی شہر مخطوطے کے اس قدر عظیم اور قابل قدر اور قدیم ذخیرہ پر فخر کر سکتا ہو۔ وہ اگر کسی یونیورسٹی میں ہوتے تو ان کی سخت حفاظت کی جاتی اور ان پر فخر کیا جاتا"۔

جنوبی ہند کے کتب خانے (سرسوتی بھنڈار)

جنوبی ہند زمانہ قدیم سے ہی تاریخی علاقوں میں کافی اہمیت کا علاقہ رہا ہے اور ہندوستان کی بنیادی تہذیبی یکسانیت کو برقرار رکھنے میں جنوبی ہند کا بڑا ہاتھ ہے۔

علوم اور تعلیم کے میدان میں بھی جنوبی ہند کا انداز خالص ہندوستانی رہا ہے اور یہاں بے شمار علوم کے مرکز رہے ہیں۔ یہ تمام مراکز بدھ وہاروں سے یا جین پال سے یا ہندو مٹھوں سے متعلق رہے ہیں اور علم و تہذیب کو پھیلانے میں ان کا کردار اہم رہا ہے ان تمام مراکز کے اپنے کتب خانے رہے ہیں "جن میں ہر علم کی ہر شاخ پر کتابیں تھیں اور ان کو وقتاً فوقتاً نقل کیا گیا"۔[1]

دسویں صدی سے ہندو مٹھ یا مندر اعلیٰ تعلیم کے مراکز بن گئے۔ ان بے شمار کالجوں کی جو اس زمانے میں عروج پر تھے مالی سرپرستی جائداد و جاگیر کی شکل میں شاہی عطیات سے ہوتی تھی یا امراء اور دوسرے ذرائع فلاح و بہبود سے تھے۔ ان مٹھوں کے سربراہ (مٹھ دیپاٹھی ۔ مدالیار یا جیار) ان جائدادوں کا انتظام کرتے تھے اور انکو چلانے کے ذمہ دار تھے۔

کتبوں سے اور ادبی حوالوں سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان مذہبی اداروں سے متعلق کالجوں کا انتظام کس طرح ہوتا تھا اور ہسپتال و لائبریری وغیرہ کی تنظیم کیا تھی نیز دوسرے تعلیمی اداروں کا ذکر بھی ان میں ملتا ہے مثلاً گھٹیکا، اگرہار اور برہما پوری وغیرہ۔[2]

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سرسوتی بھنڈار یا سرسوتی محل یا پستک بھنڈار کے نام سے جنوبی ہند کے

---

1. HISTORY OF SOUTH INDIA: NILKANTHA SASTRI, p.310.
2. EDUCATION IN ANCIENT INDIA: A.S. ALTEKAR, pp.282-94.

باب دوئم

(الف)

مغربی اور جنوبی ہند کے کتب خانے

1 مغربی ہند کے کتب خانے (گیان بھنڈار)
2 جنوبی ہند کے کتب خانے (سرسوتی بھنڈار)

مغربی ہند کے کتب خانے (گیان بھنڈار)

سابقہ تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی ہند اہم علمی مرکز تھا اور وہاں مذہبی اور تعلیمی ادارے کافی تعداد میں تھے۔ میتریکا دوران حکومت (پانچویں سے آٹھویں صدی) میں ہندوستان جین مذہب کے زیر اثر تھا اس لیے اس دور میں عظیم مذہبی سرگرمیاں برپا ہوئیں۔ نویں صدی سے تیرھویں صدی عیسوی تک جین مصنفوں نے گرانقدر علمی و ادبی کتب تصنیف کیں۔ مذہبی و دیگر علوم پر صاحبان قلم نے بڑی تعداد میں کتابیں لکھیں۔ نتیجتاً کتب خانے جیسلمیر، پٹن، سورت، کیمبے، احمد آباد، ڈھولکر، کرناٹی اور وجے پور میں قائم ہو گئے۔ ان کتب خانوں کو گیان بھنڈار یا علم کے خزانے کہا جاتا تھا۔

جین کلپا درم میں بیان کیا گیا ہے کہ پانچویں صدی میں جو قحط پڑا اس کی وجہ سے بڑی تعداد میں جین راہب جو جین مقدس کتب کے محافظ مانے جاتے تھے فوت ہو گئے اور جین کتب خانے اسی خلا کو پُر کرنے کے لیے وجود میں آئے۔

ویر سمبت ۹۸۰ (یعنی ۴۵۳ء یا ۴۶۶ء) ولبھی پور کاٹھیاوار میں جین راہبوں کی ایک مجلس مشاورت

بلائی گئی تھی تاکہ جین مذہبی ادب اور دوسرے علوم کی کتابوں کو ترتیب دے سکیں۔ اس مجلس کی صدارت دیورد ھگنی شماسرمن نے کی ہے[1]

یہ واقعہ "پستکاز دھنا جین اگم" یا جین اصول مذہب کی تخفیف کے نام سے مشہور ہے[2] جین مقدس ادب وغیرمذہبی ادب کو دائرہ تحریر میں لایا گیا۔ سرمن دیورد ھگنی ایک منارۂ نور کی طرح ہے جو ایام جہالت کی تاریکی کو ختم کرتا ہے اور ایک نئے عہد کا آغاز کرتا ہے جس میں تمام مغربی ہندوستان میں کتب خانوں کو فروغ حاصل ہوا۔

اس طرح جین عالموں نے حصول علم کے زبانی طریقہ کو ترک کیا اور یہ محسوس کیا کہ مذہبی علوم ہوں یا غیر مذہبی ان کو تحریر کرکے مخطوطات کی شکل میں لانا قطعاً ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میتریکا دوران حکومت میں مغربی ہند میں مذہبی کتابیں بڑے زور شور سے لکھی گئیں۔ ایسے ایسے عالم اس دور میں تھے مثلاً دھانیشور سوری جو مسترنجے مہاتیہ کے مصنف تھے۔ جتا یاسس جنھوں نے دسرا نتا دسیا دھرد پر حواشی تحریر کیے۔ تکیش جس نے نمتس تنگ برد ھنی لکھی۔ مَلّا جو نیائے چکر کے مصنف تھے ان عالموں نے اور دوسرے عالموں نے بے شمار جین کتابوں کی تصنیف، ادارت اور ترجمے کیے اس کے علاوہ پڑھنے کے دستور کو فروغ دینے کے لیے جین عبادت گاہوں میں یہ چیز لازمی کر دی گئی کہ جین راہب روز کم از کم تین گھنٹے جین مذہبی مخطوطات کا مطالعہ کریں[3]

قدیم جین مخطوطات کی تعریف اور تاریخی سوانح عمریوں مثلاً دھرم ابھیدیہ مہاکاویہ پربھاوکا، کمار پال پربندھ سکرت سمگرہ کاویہ، اپدیش ترنگنی، کمار پالا رسا، وستوپال، تیج پالا رسا وغیرہ سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ جین سرامن نے تمام ان روایات کو قبول کیا جو کتب خانوں کے فروغ کے لیے تھیں اور وہ تمام لوگ جو شہرت کے خواہاں تھے وہ بھی اس عمل کی طرف کھنچ کر آگئے۔ اس تحریک کو مضبوط کرنے کے لیے ادجانو اور گیان پوجا تیوہار شروع کیے گئے۔ اس طرح مذہبی روح پھونکنے سے مغربی ہند کی تعلیمی و تہذیبی ترقی ہوئی۔

جین لائبریری تحریک کی تاریخ میں دو بادشاہوں کے نام ہمیشہ یاد رہیں گے یعنی بدھ راج جے سمہا دیو

---

1. Jaina Chitra Kalpadruma, pp. 14-15.

2. Ancient History of Saurastra, K.J. Virji., p. 180 and History of Jaina Monachism from Inscriptions and Literature: Deo., pp. 315, 424-25,452

3. Jaina System of Education: Das Gupta, p.3

(1094ء سے 1143ء) اور شری کمار پال دیو (1143ء سے 1174ء) ۔ اس عہد میں پٹن، جو دارالحکومت تھا لائبریری سرگرمیوں کا بڑا مرکز رہا اور اس کی یہ روایت سولہویں صدی کے آخر تک برقرار رہی۔

شری سدھ راج نے تین سو خطاط مقرر کیے جو فلسفہ کی ہر شاخ کے مخطوطے لکھنے میں مصروف رہے۔ یہی وہ راجہ تھا جس نے بُدھ ہیم دیاکرن کی ایک لاکھ پچیس ہزار نقلیں طلب کیں تاکہ طلبا کو پیش کی جا سکیں۔ پربھا کا چرت اور کمار پال پربندھ میں اس سے متعلق بہت حوالے ملتے ہیں۔

پٹن کی پتا تجھا جین لائبریری میں ایک باتصویر مخطوطہ سدھا ہیا دیاکرتا نکھو درتی کا کھجور کی پتیوں پر لکھا پایا جاتا ہے۔ ان تصاویر سے وہ حقائق ملتے ہیں جو پربھا کا چترتیکا میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک میں ایک جملہ کی عبارت یہ ہے "ایک استاد اپنے شاگردوں کو قواعد پڑھا رہا ہے" اور اس کی تصویری تشریح اس کے ساتھ ہے۔

اس کے علاوہ سدھ راج جے سمہا نے مالوہ کو تقریباً 1135ء میں فتح کیا تو دھارا کے راجہ بھوج کی لائبریری کو انہل واڑ منتقل کیا اور وہاں جاکر یہ لائبریری چالوکیہ راجاؤں کی شاہی لائبریری میں شامل کر دی گئی۔ چالوکیہ راجا وشال دیو یا وشوملا (1243ء سے 1262ء) کے بھنڈارکر سے غیر مطبوعہ پُرستی "تہ میسلر" کی ایک نقل ملی جس پر ودیادھرنے نظم کی پہلی تفسیر ہنگی اور کام سوتر کی دستاویز بھی۔ جس کے مطابق جسودھرانے ہے منگلا کی تصنیف کی۔ بون (جرمنی) کی لائبریری میں راماین کا ایک نسخہ وشال دیو کے مجموعہ کتب سے نکالا گیا ہے[6]

کہا جاتا ہے کہ راجہ شری کمار پال دیو نے اکیس بڑے کتب خانے یا علم کے خزانے قائم کیے اور مخطوطات کو سنہری حرفوں میں لکھنے کا حکم دیا اس کے حوالے کمار پال پربندھ" اور "اپدیش ترنگنی" میں ملتے ہیں۔

جین منتریوں میں جنہوں نے مخطوطات اور کتابیں لکھنے میں دلچسپی لی شری وستو پال، تاج پال، پاتھد لیشا اور مدن منتری بہت مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ جین منتریوں نے مخطوطہ نویسی کو فروغ دیا اور جین علوم کو خزانے کے قیام میں مدد دی ان میں دل شاہ، اسر بھٹ، واگ بھٹ اور کرم شاہ قابل ذکر ہیں۔ وستو پال نے اٹھارہ کروڑ کی لاگت سے تین بڑے کتب خانے قائم کیے تھے۔

شاہوں اور شاہزادوں کے جوش و خروش نے سماج کے سربرآوردہ لوگوں کو بھی اس کی طرف راغب کیا اور انھوں نے مغربی ہند میں کتب خانے قائم کرنے میں مدد دی۔ لیکن اس باب کا قابل افسوس پہلو یہ ہے کہ مذہبی

---

4. INDIAN PALEOGRAPHY, BUHLER, p.93

5. JAINA CHITRA KALPADRUMA, pp. 90-94.

6. G.O.S. VOL. LXXVI, p.33

جاہلانہ تعصب اور فرقہ وارانہ حسد نے جین علم و دانش کے خزانوں کو تباہ کر دیا۔

اجے پال جو کمار پال کا جانشین تھا جین مذہب سے نفرت کرتا تھا اس نے اس مذہب کی تمام نشانیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی اودیان اور دوسرے جین منتریوں نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے جین مخطوطات کا ایک بڑا حصہ پٹن سے جیسلمیر اور دوسرے مقامات پر منتقل کر دیا۔ بہت سے مخطوطے جو کھجور کی پتیوں پر لکھے آج جیسلمیر میں محفوظ ہیں وہ پٹن ہی کے بچے کھچے ہیں۔

بہت سے جین کتب خانے جو دستو پال نے قائم کیے تھے بڑی بے رحمی سے مسلمانوں نے برباد کر دیئے تیرھویں صدی کے آخر میں جب گجرات مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تو بہت سے قابل قدر مخطوطوں کے خزانے اس لیے جل گئے کہ مسلمانوں نے تباہی کی[8] بدھ مذہب کے متعصب لوگوں نے بھی جین مخطوطات کے خزانے جلانے میں حصہ لیا[9]

کرنل ٹوڈ کے زمانہ سے گجرات خصوصاً پٹن مخطوطات تلاش کرنے والوں کا اڈا بن گیا۔ روپیہ کے لالچ میں آ کر کتب خانوں کے محافظوں نے مخطوطات کے ذخیرے فروخت کر ڈالے، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے جین مخطوطے دوسرے ملکوں میں یا ہندوستان کے دیگر صوبوں میں چلے گئے[10] پھر بھی باوجود ان تمام نشیب و فراز کے آج بھی گجرات، راجپوتانہ اور پٹن میں جین مخطوطوں کے بہت سے اہم ذاتی ذخیرے موجود ہیں۔

پٹن میں جو جین بھنڈار ہیں ان میں جین مخطوطوں کی ایک تفصیلی فہرست شری لال چند بھگوان داس گاندھی نے تیار کی ہے اس کی بنیاد پر پٹن میں لائبریریوں کی ایک فہرست حسب ذیل ہے:

1۔ سنگھوی پدا ذخیرہ جو تپاگچھا کی شاخ لگھو پوشالیکا سے متعلق ہے اس میں 413 مخطوطے کھجور کی پتیوں پر لکھے ہیں۔

2۔ 2688 کاغذی مخطوطوں اور 137 کھجور کی پتیوں کے مخطوطوں کا ذخیرہ وکھرٹ جی سیری دفوفالیہ وڈا میں ہے۔ یہ پٹن کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔

3۔ 744 کاغذی مخطوطے اور چار کھجور کی پتیوں پر جو وادی پارس ناتھ مندر میں محفوظ ہیں۔

---

7. G.O.S. VOL. LXXVI, p.33

8. Naisadhacharita of Sriharsa: K.K. Hindiqui (Ed.), Deccan College, Poona, p. XIX.

9. G.O.S. VOL. LXXVI, p.37.

10. G.O.S. VOL. LXXVI, p.34.

کاغذ پر جو مخطوطے ہیں وہ پرانی کھجور کی پتیوں والے مخطوطات کی نقلیں ہیں اور ان کا ترجمہ سمت 1480 سے سمت 1490 کے درمیان کھراترا گچھا میں جو اس وقت مذہبی سربراہ تھا اس کے حکم پر کیا گیا تھا۔

4۔ 3035 کاغذ کے مخطوطے اور 22 کھجور کی پتیوں والے مخطوطے اور ایک کپڑے پر لکھا مخطوطہ گلیسری میں ہیں۔ اس ذخیرہ میں جینیوں کی مقدس کتابیں اور جین داس کی بہت سی کتابیں قدیم گجراتی زبان میں موجود ہیں۔

5۔ ساگر کا اپسار یا ذخیرہ اور بھو ساگر کے ذخیرہ میں بالترتیب 1309 اور 108 مخطوطات ہیں۔

6۔ مرکا مودی ذخیرہ میں 4 2 کاغذ پر اور 2 کھجور کی پتیوں پر مخطوطے ہیں ڈاکٹر کلہورن نے 1880-81ء میں بمبئی گورنمنٹ کے لیے 75 کھجور کی پتیوں والے مخطوطے خریدے جو اسی کا حصہ تھے اب وہ ساگر کے اپسار یا ذخیرہ میں شامل ہیں۔

7۔ بھابھا پد لائبریری میں 522 اور 1814 یعنی کل 2339 مخطوطات ہیں۔

8۔ دستا مانک ذخیرہ جو اس وقت ساگر اپسار یا میں شامل ہے اس میں 52 مخطوطات ہیں۔

9۔ کھیتر دسی میں 76 کھجور کی پتیوں پر لکھے مخطوطات ہیں۔

10۔ مہا لکشمی پد میں 8 کھجور کی پتیوں پر لکھے اور چند کاغذ پر نوشتہ مخطوطے شامل ہیں ان میں سے ایک لکشمن کی کلیات ہے۔

11۔ اوداسی پد میں دو کھجور کی پتیوں پر لکھے اور چند کاغذ پر مخطوطے ہیں۔

12۔ ہمت دجے جی کا ذاتی مخطوطات کا ذخیرہ۔

13۔ لاون دجے جی کا کاغذی مخطوطات کا ذخیرہ۔

جین بھنڈاروں کے تنقیدی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں نہ صرف اپنا مذہبی لٹریچر تھا بلکہ دوسرے مذاہب اور دیگر مضامین پر مخطوطات تھے۔ جین کتب خانوں کا تفصیلی مطالعہ یعنی ان کا نظام، تحفظ اور سامان تحریر دوسرے ابواب میں کیا جائے گا۔

جین بھنڈاروں کے مخطوطات جن کا سائز 3، 2 انچ سے 1/2 32 انچ ہے۔ زیادہ تر سدھ راج، کمار پال، دشال دیو اور سارنگ دیو کے دوران حکومت میں لکھے گئے۔ سب سے قدیم مخطوطوں کی تاریخ 1063ء ہے لیکن اس سے قبل غیر معلوم مخطوطے بھی ملے ہیں اور سب سے آخری کھجور کی پتیوں والے مخطوطے 1497ء کے ہیں۔

1059ء میں ادے دتا نے خوبصورت نیل کنٹھیشور مندر ادے پور میں تعمیر کیا۔ اس مندر کے صحن کے چاروں کونوں پر چھوٹے مندر بنوائے اور صحن کے چاروں کونوں پر مربع دیدیاں بنوائیں تاکہ وید پڑھے جا سکیں" وید پڑھنے کے لیے ہر ایک کمرہ مربع شکل کا ہے۔ اور اس کی چھت چار عظیم ستونوں پر قائم ہے اور چھت حسب دستور ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے پتھروں کی ہے۔ ہال کے چاروں طرف ایک ایک شہ نشین ہے۔ اور ان میں سے دو شہ نشینوں کو جالی لگا کر بند کر دیا گیا ہے۔ ہر شہ نشین میں اٹھی ہوئی پتھر کی ایک سل ہے اور وہ پڑھنے والے کے لیے بیٹھنے کی جگہ کا کام دیتی ہے"[66]

کونہ والے مندر اور پڑھنے کے کچھ کمرے محمد تغلق نے تباہ کیے اور ان کے کھنڈرات پر اس نے مسجد بنوائی۔

---

66. History of Pamara Dynasty, D.C Gangoly, p.262.

علاقہ میں لائبریریوں کا وجود تھا اور تعلیمی اداروں کے جدانہ ہونے والے حصہ کی طرح رہیں۔ جنوبی ہند میں 1913ء کا کتبہ 277 اور 1916ء کے کتبے نمبری 604۔ 671 اور 695 ان عطیات کو بتاتے ہیں جو مندر کے کالجوں کو دی گئیں۔

1913ء کے کتبہ 277 سے ظاہر ہوا کہ 108 فاضل برہمن خاندانوں کے لیے ایک وقف بنایا گیا جس میں لائبریری قائم کرنے کا بھی ذکر تھا۔ اور 1916ء کے کتبہ 679 سے ظاہر ہوا کہ ایک عطیہ مندر کالج کی لائبریری کو دیا گیا جو تینا دیلی ضلع میں ہے۔

راجہ ترلوکیہ ملا مغربی چالوکیہ حکمراں تھا اس کے زمانہ میں (1058ء) کی تانبے کی ایک تختی سے ایک تعلیمی ادارہ کی تفصیلی معلومات حاصل ہوتی ہیں کہ کس طرح شاہی سرپرستی میں ناگائی کے مقام پر تعلیمی ادارہ قائم ہوا[3] یہ ادارہ رہائشی تھا اور اس میں اساتذہ اور طلباء کے قیام و طعام کا انتظام تھا اور اس میں ایک بڑی لائبریری تھی جس کے تحت چھ (سرسوتی بھنڈاریکا) تھے۔ اس کتبہ سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ زمین کس طرح تقسیم کی جائے۔

"35 متر زمین اماترا اور دگوجے (زیرین غار) جو ناگا وادی مقام پر ہے بھٹ درشن کے مفسر کے لیے 30 متر زمین نیائے کے مفسر کے لیے، 4 متر زمین پربھاکر کے مفسر کے لیے اور 30 متر ہر ایک لائبریرین کے لئے ہے"[4] یہ اطلاع قابل قدر ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لائبریرین کی تنخواہ، درحیثیت علمی مرکز میں کیا تھی۔ لائبریری کے محافظین بھی ادارہ کے دوسرے اساتذہ کی طرح اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے اور ان کی تنخواہ بھی استادوں سے کچھ زیادہ کم نہ تھی۔

ان حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ سرسوتی بھنڈاروں کے لائبریرین کا مقام مندر کالجوں اور دوسرے تعلیمی اداروں میں باعزت تھا۔

شری رنگم کے رنگ ناتھ مندر کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسوتی کی تین مورتیوں دیاس دید بھگوان اور بہاگر یو کو منڈپ میں لائبریری کے قریب نصب کیا گیا تھا[5] اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پاپّی کے نیل کنٹھ نائک نے ان مورتیوں کو نصب کرایا تھا۔ اور نیل کنٹھ ویر رام ناتھ (1269ء) قبل مسیح کا ہمعصر تھا[5]
اور تو ہیر دل مندر جو کوچی ودم نورد میں ہے اس کا کتبہ 9 مارچ 1359ء کا ہے جس سے معلوم

---

3. INSCRIPTION OF NAGAI: HYDERABAD ARCHAEOLOGICAL SERIES No.8
4. ANNUAL REPORT OF THE SOUTH INDIAN EPIGRAPHY, 1938-39, NO. 139, p.95
5. ANNUAL REPORT OF THE SOUTH INDIAN EPIGRAPHY, 1938-39, No.139, p.95
6. J.I.H., VI, 33, p.197.

ہوتا ہے کہ ایک شخص وشنوداس تھا جس کا خطاب برہم تنتر سوتنتر جیار تھا اس نے ایک مٹھ بنوایا جس میں لائبریری کے لیے ضروری گنجائش رکھی گئی تھی۔ اخراجات کو پورا کرنے کے لیے زمین مندرجہ ذیل الفاظ میں عطا کی گئی تھی۔

" ایوا تیدینا پستکا نگلم وندم اپکرا انتا نگلم"[7] ظاہر ہے کہ یہاں "پستکا نگلم" کا مطلب ہے مخطوطات کے بنڈل اور "اپکرا انتا نگلم" لائبریری کے دوسرے سامان کے لیے استعمال ہوا ہے۔

مندرجہ ذیل اقتباسات جو جنوبی ہند کی کتبہ خوانی کی رپورٹ بابت سال 37-1936ء سے لیے گئے ہیں ظاہر کریں گے کہ راجاؤں نے سرنگیری مٹھ کی لائبریری کی تعمیر نو اور دیکھ بھال میں کتنی دلچسپی لی ہے۔

"پیرودرو کے دنتیالہ گاؤں میں جو جنوبی کنارا ضلع سے متعلق ہے وہ بکا کی ملکیت ہے جو ہری ہر دوئم کا بیٹا ہے اور اس کی تاریخ شک سمبت 1328 یعنی 1406ء اگست ہے۔ یہ بادشاہ وجے نگر سے حکمرانی کرتا تھا جبکہ اس کا گورنر باچپا (ساکن گوا) بارا کرد میں رہتا تھا۔ یہ باچپا یا باچنا اوڈیا منگلورد اور بارا کرد ریاستوں کا تین سال تک دیورائے اول کے زیر نگیں گورنر تھا۔ (کتبہ 609 - 30-1929ء) اس کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ برہم ہارا گاؤں عطیہ دیا گیا جو بارا کرند میں ہے اور دوسرے گاؤں کی آمدنی مثلاً کنیانہ، پیتامہ اور ہلیم جی جو پرانیکا کوی کرشنا بھٹ واقع سرنگیری کے لیے اور سرنگیری مٹھ کی لائبریری (پستک بھنڈار) کی تعمیر نو اور دیکھ بھال کے لیے ہے یہ اس زمانہ کی بات ہے جب نرسمہا بھارتی ودیا جو غالباً ودیا رانئے تیرتھ کا جانشین تھا اس مٹھ کا مذہبی سربراہ تھا۔ یہ گرو جسے دوسرے ریکارڈ (کتبہ 369 - 1927ء) میں عطیہ دار کہا گیا ہے کنڈاپور تعلقہ کا ہے اور اسی تاریخ کا ہے کوی کرشنا بھٹ کے بیٹے کوی شنکر بھٹ کا ذکر دوسرے ریکارڈ (284) جو اسی گاؤں کا ہے اس کی تاریخ شک سمبت 1354 ہے دروودھی کرت 1441ء میں ایک زمین کے عطیہ کا ذکر ہے، جو بارا کرد اور تالو حکومت کے گورنر چنڈا پا نے دیا۔ یہ عطیہ زیر فرمان راجہ دیورائے مہالائے تھا جو وجے نگر سے حکمرانی کرتا تھا۔ اسی علاقہ کے اور ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گورنر کافی مشہور تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کوی کرشنا بھٹ کے جانشین شولنگ کی پوجا کرانے کے ذمہ دار رہے، یہ لنگ اس مقام پر نصب تھا جہاں ودیا رانا کا گرو ودیا تیرتھ کی سمادھی تھی۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ راجہ بکا مہاراج نے شک سمبت 1328 ویایے (اگست 1406ء) میں کچھ گاؤں پرانیک کوی کرشنا بھٹ کو دیئے تاکہ سرنگیری مٹھ سے متعلق

---

7. J.I.H., VI. 33, p.197.

لائبریری کی تعمیر نو اور دیکھ بھال ہو سکے ۔ مذکورہ بالا اطلاع سے ہمیں دوسرے لائبریری کے محافظوں کے نام معلوم ہوتے ہیں ایک کوی کرشن بھوٹ اور دوسرا اس کا بیٹا کوی شنکر بھوٹ جس کا ذکر اسی گاؤں کے کتبہ شک سمبت 1354 در ودھی کرت (1431ء) میں ہے ۔

ڈاکٹر برنیل نے تانجور مہاراجہ سرفوجی کی سرسوتی محل لائبریری کو دنیا کی ایک بڑی لائبریری کہا ہے زمانہ حال تک یہ بے مثال لائبریری تانجور کے راجاؤں کی ملکیت تھی (تحتی ملا) [8] ۔

تیلگو نائک جو سولہویں صدی میں تانجور پر حکومت کرتے تھے علم و ادب کے عظیم سرپرست تھے ۔ انھوں نے اس لائبریری کا آغاز اس طرح کیا کہ تیلگو میں لکھے سنسکرت مخطوطے جمع کیے ۔ مراٹھوں نے اٹھارھویں صدی میں اسی علاقہ کو فتح کیا اس زمانہ میں اس لائبریری کو فروغ ہوا ۔ تانجور مہاراجہ سرفوجی کو اگرچہ سنہ 1799ء میں تخت و تاج سے محروم کر دیا گیا لیکن انھوں نے اپنے دربار کو تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز بنائے رکھا اور لائبریری کی سرپرستی کی ۔ انھوں نے سنہ 1820ء سے سنہ 1830ء تک اپنے بنارس کے سفر کے دوران اس لائبریری میں بہت قابل قدر اضافے کیے ۔ جمبوناتھ بھوٹ کا جو تانجور کے برہمن عالم خاندان کا فرد تھا ذاتی کتب کا ذخیرہ بھی سنہ 1921ء میں اس لائبریری میں شامل ہو گیا ۔

کتب خوانی کی سالانہ رپورٹ بابت سال سنہ 1898-99ء سے جمبوناتھ ذخیرۂ کتب کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات نقل کرتا ہوں ۔

> "وہ اپنے تین بھائیوں میں سب سے بڑا اور ایک ایسے خاندان کا جانشین ہے جس کا اثر و رسوخ بادشاہ پر بہت زیادہ تھا جبکہ تانجور میں مراٹھا سلطنت قائم تھی جب دربار کی لائبریری میں بنارس اور دوسرے شمالی ہند کے مقامات سے مخطوطے حاصل کیے گئے تو جمبوناتھ نے اپنے اثر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ذخیرہ مخطوطات میں سنسکرت کتب کا اضافہ کیا اسی لیے قدیم سنسکرت مخطوطے

---

8. (a) PROCEEDINGS AND TRANSACTIONS OF THE 3rd ORIENTAL CONFERENCE 1924, p.713

A Descriptive Catalogue of Sanskrit Mss. in the Tanjore Maharaja Serfoji's Saraswati Mahal ~~Library~~ Library, Tanjore by P.S.P. Sastri, Vol. 1.

اس میں کافی ہو گئے جنھیں عالباً شمالی ہند میں نقل کیا گیا تھا ان کتب کا افراد خاندان نے جو کافی عالم و فاضل تھے خود ترجمہ بھی کیا۔ اس ذخیرہ کے موجودہ مالک نے بتایا کہ یہ (حیرت ناک ذخیرۂ کتب) کس طرح وجود میں آیا۔ یہ تمام مخطوطے ہندی رسم الخط میں الگ الگ اوراق کی شکل میں ہیں "

سرسوتی محل لائبریری جس کی سرپرستی راجہ سرپھوجی نے کی اس کے بارے میں مندرجہ ذیل معلومات رابنسن کی تحریروں سے حاصل ہوتی ہیں جو بشپ ہیبر کے ساتھ تانجور گئے۔

راجہ نے ہم سے لائبریری میں ملاقات کی ایک بڑا کمرہ جس میں خوبصورت سجے ہوئے ستونوں کی تین قطاریں تھیں ایک طرف مراٹھا خاندان کے راجاؤں کی قلمی تصویریں شاہ جی سے شواجی تک آویزاں ہیں۔ دس الماریاں ہیں جن میں عمدہ ذخیرۂ کتب بزبان فارسی فرانسیسی، انگریزی، جرمن، یونانی اور لاطینی ہیں اور دو الماریوں میں مراٹھا اور سنسکرت مخطوطے ہیں اور قریب کے کمرے میں ہوا کا پمپ، بجلی پیدا کرنے والی مشین، ہاتھی دانت کا ایک ڈھانچہ، آلات نجوم اور بہت سی کتابوں کی الماریاں ہیں جس میں کئی مضمونوں پر کتابیں ہیں اور کافی کتب طب پر ہیں۔ جو کچھ عرصہ تک مہاراجہ کی پسندیدہ مطالعہ کی کتابیں تھیں " 9

1929ء میں اس ذخیرہ میں نادر ذخیرے شامل ہو گئے جو تانجور کے کنگل کار اور چنگ ادھوت خاندانوں کی ملکیت تھے۔

اول الذکر 50ء برس اور آخر الذکر 100 برس پرانا ہے۔ کنگل کار خاندان کے ذخیرہ میں جو سنسکرت کے فاضل اور عالم تھے اور سنسکرت قواعد میں مہارت خاص رکھتے تھے ان کی تصنیف کردہ دستخط شدہ نیز دوسروں کی لکھی ہوئی قلمی کتب شامل ہیں اس کی ممتاز صفت یہ ہے کہ یہاں سنسکرت قواعد پر کافی کتب ہیں۔ چنگ ادھوت خاندان جس کے جانشین تردودا مارودور ضلع تانجور میں سکونت پذیر ہوئے ان کے ذخیرہ میں ویدانت اور بھگتی پر بہت تصانیف ہیں۔ ان دونوں ذخیروں میں بہت سی ایسی قلمی کتابیں تھیں جو اب

---

9. TANJORE MAHATHA RULE IN THE CARNATIC. HICKEY, p.330

اس لائبریری میں موجود نہیں ہیں۔

سنہ 1868ء میں حکومت ہند اور اس کے ذریعہ حکومت مدراس کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی کہ سنسکرت مخطوطات کا معائنہ اس کی خرید اور تحریر اور فہرست سازی نہایت اہم مسئلہ ہے (کارروائی حکومت ہند۔ محکمہ امور داخلہ (عوامی) نمبر 48-4338 مورخہ شملہ 3 نومبر سنہ 1868ء)

نہ صرف زبانوں کی کثرت میں بلکہ مضامین کی کثرت میں بھی مشرقی طرز کے کتب خانوں میں تانجور لائبریری اپنی مثال آپ ہے۔[10]

نامور فاضل ڈاکٹر برنل کی مسلسل کوششوں سے تانجور دربار کی شاہی لائبریری میں موجود سنسکرت مخطوطات کا ایک اشاریہ لندن میں سنہ 1878-80ء میں تین جلدوں میں شائع ہوا۔ شروع میں مسٹر پکفورڈ نے جو سنسکرت کے پروفیسر تھے سنسکرت مخطوطات کی فہرست سازی شروع کی لیکن خرابی صحت کی وجہ سے سنہ 1870ء میں انھیں یہ ملک چھوڑنا پڑا۔ ڈاکٹر برنل کی فہرست اب تانجور لائبریری کی کتب کی واحد رہنما ہے مگر نامکمل ہے وہ اپنی فہرست میں چار ہزار مخطوطات کو شامل نہیں کر پائے۔

اس لائبریری میں مخطوطات کی کل تعداد پچیس ہزار ہے اس کے علاوہ یورپی زبانوں میں بھی کتابیں ہیں۔ مخطوطات کے ذخیرے میں گیارہ زبانوں کی قلمی کتابیں ہیں اور یہ یا تو کھجور کی پتیوں پر ہیں، یا کاغذ پر ہیں۔

اس لائبریری کی اہمیت کے بارے میں سنہ 1873ء میں ڈاکٹر برنل نے حکومت مدراس کو مندرجہ ذیل تحریر بھیجی تھی:۔

> "یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس لائبریری پر جتنا وقت صرف کیا جائیگا کیا وہ اس کی مستحق بھی ہے۔ میں بغیر کسی تذبذب کے کہہ سکتا ہوں کہ یہ اس کی مستحق ہے۔ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ سنسکرت کی تمام اہم قلمی کتابیں کسی نہ کسی شکل میں یہاں موجود ہیں۔ تانجور لائبریری اس لحاظ سے عدیم المثال ہے اس میں بہت سی وہ عمدہ قلمی کتابیں جن کا ہمیں علم ہے اور چند

---

10. Reports on Sanskrit Manuscripts in Southern India. Edited by Hultzch. 1905

نئی بھی ہیں تانجور لائبریری میں ان تمام تصانیف کے مخطوطے موجود ہیں جنہیں میں نے کہیں اور دریافت کیا تھا۔ یہ بات بھی بہت اہمیت کی حامل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ لائبریری جلد یا بدیر حکومت کو حاصل ہونی چاہیئے اور اس کی فہرست کی تکمیل ایک گراں قدر املاک کو محفوظ کر دے گی۔ سنسکرت مخطوطے ایک عرصہ تک بنگے رہے ہیں اور ان کی نقلیں لینا بھاری رقم صرف کر کے ہی ممکن ہو سکتا ہے جہاں تک میں اندازہ لگا سکتا ہوں مخطوطات کا ایسا ذخیرہ جیسا تانجور کتب خانے میں ہے پچاس ہزار پونڈ صرف کیے بغیر جمع نہ ہو سکے گا۔ بہت سی قلمی کتابیں بلا شبہ بے نظیر ہیں۔[11]

11. Proceedings and Transactions of the 3rd Oriental Conference, Madras, 1924, p. 714.

باب دوئم

(ب)

ہندوستان کے قدیم کاغذات

قدیم ہندوستان میں کتب خانوں کے ساتھ، ساتھ سرکاری کاغذات کا ذخیرہ بڑھتا گیا۔ کاغذات کے بارے میں سب سے پہلا حوالہ ہمیں ارتھ شاستر میں ملتا ہے جہاں اکش پٹالا[1] کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ شاما شاستری نے اس کا ترجمہ کیا ہے "دفتر حسابات" جس کو موناہن[2] اور آر دکشیتار[3] نے تسلیم نہیں کیا ہے۔ ان کے نزدیک اس کا مطلب ہے "عام کاغذات کا کمرہ" کاغذات کی طبقاتی تقسیم اور بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے معنی زیادہ قابل قبول ہیں۔

موریہ خاندان کے شاہی دفتر کے کاغذات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ لیکھا یعنی خطوط اور سنا یعنی کلی تحریر نامے۔ اول الذکر کو پھر کئی حصوں میں بانٹا گیا ہے:

(الف) نندا (الزام)

(ب) پرشنسا (تعریف)

(س) پرکچھا (تحقیق)

---

1. Arthasastra, Shamsastry, Book I, Ch. VII, pp. 61
2. Early History of Bengal, Monahan p. 45
3. Hindu Administrative Institutions, V.R.R.Dikshitar, pp.203-4

(د) اکھیان (تفصیل)

(ج) پرارتھنا (درخواست)

(چ) پرتیاکھیان (انکار)

(ح) ابجیہ (تشہیر)

(خ) پرتی شُرودہ (بندش)

(ڈ) اجنا (حکم)

(ذ) سنتوم (صلح)

(س) ابھیا وا پتی (امداد کا وعدہ)

(ش) بھترسنم (دھمکی)

(ن) انونائے (ترغیب)

ملکی تحریر ناموں کی تقسیم حسب ذیل ہے:۔

(الف) پرجنا پنا، یعنی نوٹس

(ب) اجنا، یعنی حکم

(س) پریدان، یعنی عطیہ

(ج) پریہار، یعنی تخفیف

(چ) نسہرتی، یعنی لائسنس اجازت نامہ

(ح) پردرتی لیکھ، یعنی ہدایت۔

(خ) پرتی لیکھ، یعنی جواب

(د) سروترگا یعنی اعلان عام[4]

اس کے علاوہ عوامی اخراجات کے کاغذات۔ باغی بادشاہوں کے نام تادیبی تحریروں کی نقول در صلح ناموں کو سرکاری کاغذات کے محافظ خانوں میں رکھا جاتا تھا۔[5]

اس سے قبل کے باب میں ہم بُردہ کاغذات کا ذکر کر چکے ہیں جن کو ہیوان سانگ نے بیان کیا ہے، اور

---

4. Arthasqstra, Shamaastry, Book II, Ch. X, pp. 71-75.

5. Archives in India; Sailen Ghosh, p.9

نیل پتا یا شاہی احکام کا ذخیرہ کہا ہے ۔ اس کے علاوہ شکرنیتی ایک اور قابل قدر حوالہ کی کتاب ہے جس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ریکارڈ کا دفتر کس طرح کا تھا۔ کس قسم کے کاغذات محفوظ کیے جاتے تھے اور اس دفتر میں مختلف حصے کیا تھے اور ان کے الگ الگ نگراں افسران کون تھے [6]

گپتا عہد حکومت اور اس کے بعد کے ادوار میں مخطوطات کے محفوظ رکھنے کی روایت جاری رہی ۔ کتبات کے حوالوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ گپتا شہنشاہوں اور اس کے بعد کے بادشاہوں نے سرکاری کاغذات کے محافظ مقرر کیے اور ان کو اکش پاٹلا اسیکرت اکش پاٹلا کاس اور مہا اکش پاٹلیکاس کہا جاتا تھا [7] ۔ بھیم دیو دوئم (بکرمی سمت 1283) کے کادی عطیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کا یہ محکمہ 1226ء تک کام کرتا تھا [8] شمالی ہند میں کالاچوری، گاہاڈوالا اور سیناخاندانوں میں بھی اسی قسم کی تنظیم تھی اور کاغذات کے محافظ کو اکش پاٹلیکا اور مہاکش پاٹلیکا کہا جاتا تھا [9] ۔

بالائی علاقہ دکن اور مغربی ہند کے ست راپ (دوسری صدی عیسوی) بھی اپنے کاغذات کو درج رجسٹر رکھنے کی روایت کو قائم رکھتے تھے۔ ان تمام کاغذات کی نقلیں سرکاری دفتر میں ریکارڈ میں رکھی جاتی تھیں جسے پھلکاوار کہا جاتا تھا [10]

جنوبی ہند میں چولا خاندان کے بادشاہوں نے کھجور کی پتیوں پر تحریر کردہ ریکارڈ (اولائی) کو محفوظ رکھنے کے لیے دفتر قائم کیے تھے اور ان کے افسران کو ترومندر اولائی یا اولائی نائیگم کہا جاتا تھا [11] ۔ آخرالذکر افسران اوّل الذکر سے اعلا مانے جاتے تھے اور وہ احکام کی جانچ اور منظوری کے ذمہ دار تھے ان احکام اولائی کو اس وقت ٹیٹے کہا جاتا تھا۔ اس دفتر میں شاہی احکام کے علاوہ زمین کے کاغذات زمینی معائنہ کے ریکارڈ اور بقایاکی میزانیں رکھی جاتی تھیں ۔

1442ء میں عبدالرزاق نے دجے نگر سلطنت کا دورہ کیا اس کے دورے سے متعلق کاغذات سے یہ

---

6. Sukraniti, Tr.by B.K. Sircar, Ch.IV, Sec.V, No.362-63.
7. Corpus Inscriptionum Indicarum. V. III, pp. 190 (No.39 Plate XXV).
8. Corpus Inscriptionum Indicarum. V. III, pp. 190 , note 2.
9. Indian Antiquary, Vol. VI, pp. 200
10. E.I. Vol. 8, p. 82.
11. The Struggle for Empire; R. C. Mazumdar (Ed). Vol. 5, pp.274 & 276-77.

صاف ظاہر ہے کہ دفتر کاغذات تیس فٹ لمبا اور چھ فٹ چوڑا تھا۔ یہاں ریکارڈ رکھے جاتے تھے اور خوشنویس کاتب بیٹھتے تھے۔ یہ کمرہ وزیر کے دفتر کے مقابل تھا[12] کلاوی حکومت میں بھی جو سلطنت وجے نگر کے زیر نگیں تھی اسی قسم کا دفتر تھا جہاں تانبے کی تختیاں، کھجور کی پتیوں والی تحریریں کوتا اور کاغذ کی کتابیں تھیں[13]
سنہ 1637ء میں پیٹر منڈی نے اس دفتر کو دیکھا جسے غالباً میسور کے حیدر علی نے سنہ 1763ء میں تباہ کر دیا تھا[14]

12. History of India, Elliot, V. IV.pp. 107-8.

13. Indian Archives, Vol. I, No.I, pp. 7-15.

14. Travels in Europe and Asia, Peter Mundy, Vol. III, pp.98

باب سوئم

عہدِ سلطنت کے شاہی اور اہم ذاتی کتب خانے

گجرات کے آزاد سلطانوں کے کتب خانے

اب ہم ان ہندوستانی کتب خانوں کا ذکر کریں گے جو مسلمانوں کی آمد اور فتوحات کے بعد وجود میں آئے۔

ہم ترک، افغان عہد (۱۲۰۶ء سے 1526ء) سے آغاز کرتے ہیں جبکہ سلطان عوام کا حکمران پناہ دہندہ اور بہی خواہ سمجھا جاتا تھا۔ "سلطان تمام معاملات پر حاوی ہے، وہی عوام کے حقوق کا نگراں ہے، وہی مجرموں کو سزا دیتا ہے وہ ایک قطب ستارہ کی مانند ہے جس کے گرد تمام معاملات دین و دنیا گھومتے ہیں، وہ خدا کی کائنات میں ایک محافظ ہے اس کا سایہ خدا کے بندوں کے لیے چھتری کا کام کرتا ہے، وہ بری چیزوں کا انسداد کرتا ہے مظلوموں کی مدد کرتا ہے، ظالموں کی بیخ کنی کرتا ہے اور کمزوروں کی حفاظت کرتا ہے"[1]

احمد بن محمد سے عبدالرب کے مذکورہ بالا مقولے سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ سلطان تمام انتظامی معاشی مذہبی اور تہذیبی سرگرمیوں کا سرچشمہ ہوتا تھا۔ وہ اعلیٰ ترین سربراہ ہوتا اور اس کے ادبی ذوق اور تعلیمی حوصلہ افزائی سے شعراء فلسفی اور سائنس دانوں کو امداد حاصل ہوتی تھی اور پوری مملکت میں اسکول کالج اور لائبریریوں کے قیام میں مدد ملتی تھی۔ اس کے برعکس اس کے منشار کے خلاف ہوتا تو فضلاء، علماء اور اداروں کو کافی نقصان پہنچتا۔ ان دنوں شاہی اعانت ہی تہذیبی سرگرمیوں اور اداروں کے قیام کی ضامن ہوتی تھی۔ کیونکہ بادشاہ کی ذات ہی حکومت مجسم ہوتی اس لیے اس کے کردار کی اس سلسلہ میں بہت اہمیت تھی۔

---

1. Administration of the Sultanate of Delhi: I.H.Qureshi, p.47

سلاطین دہلی۔ چھوٹے مسلم حکمراں اور وزراء نے عموماً اسلامی علوم کی حوصلہ افزائی کی اور مکتب یعنی ابتدائی اسکول اور مدرسے یعنی اعلیٰ علمی درسگاہیں اور کتب خانے قائم کیے اور مسجدیں بنوائیں۔ ابتدائی مسلم حکمرانوں کی راجدھانی غزنی سے لاہور منتقل ہوئی پھر لاہور سے دہلی۔ اس لیے یہ مقامات غزنی کے نمونہ پر علوم کا مرکز بنے۔ مختلف مسلم ملکوں سے علماء دہلی، جالندھر، فیروز آباد اور دوسرے مقامات پر جمع ہوئے جس کی وجہ سے یہ مشہور تعلیمی اور تمدنی مراکز بنے اور رفتہ رفتہ دارالسلطنت دہلی عدیم المثال عالموں کی موجودگی کی وجہ سے رشک بغداد بنا، قاہرہ کا مدمقابل بنا اور قسطنطنیہ کا ہم پلہ کہلایا۔[2]

خلجی سلاطین علوم کے عظیم سرپرستوں میں تھے۔ انھوں نے دہلی کی شاہی لائبریری قائم کی تغلق اور لودی حکمرانوں میں محمد بن تغلق فیروز شاہ اور سلطان سکندر لودی خود بڑے عالم تھے انھوں نے فیاضانہ طور سے عالموں اور شاعروں کی اعانت کی اور کالج قائم کیے جن سے مسجدیں بھی متعلق تھیں۔ علائی دروازہ کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علاؤالدین خلجی علوم و مذاہب کے مراکز کا حامی اور درسگاہوں اور عبادت گاہوں کو تقویت دینے والا تھا۔[3] جس طرح قرون وسطیٰ کے یوروپ میں گرجاگھر اور عبادت گاہوں نے تعلیم کو فروغ دیا اسی طرح مسجدوں اور خانقاہوں نے عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں تعلیم کو عام کیا۔

زیر بحث دور میں علم کے تمام شعبوں میں کافی ترقی ہوئی۔ مسلم بادشاہوں نے عربی فارسی زبان کے تمام علوم کے لیے فیاضی سے کام لیا۔ فارسی تصنیفات نے جو تاریخ، ادب اور مذہبیات پر تھیں ہندوستانی طرز فکر کو متاثر کیا اور تاریخ نویسی کے علم کو باضابطہ بنایا۔ بہت سی سنسکرت تصانیف کا جو علم موسیقی، رقص، نجوم اور رومانی شاعری پر تھیں فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ وجے نگر، وارنگل اور گجرات کے راجاؤں نے سنسکرت کی سرپرستی کی اور جینیوں نے بھی اس دور میں قابل قدر علمی اضافہ کیا۔ نتیجہ کے طور پر بے شمار قلمی کتابیں تحریر ہوئیں اور ملک کے مختلف حصوں میں ان کے ذخیرے ہو گئے۔[4]

ترک افغان بادشاہوں کا دور حکومت امن اور علمی روشنی کا دور تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس زمانہ میں بہت سے ہندو اور بدھ کتب خانے جو موجود تھے تباہ ہوئے جس طرح یوروپ میں اصلاحی دور میں روم کے کلیسا کے خلاف کارروائیوں سے عبادت گاہوں سے متعلق کتب خانے برباد ہوئے تھے۔

---

2. Advanced History of India: Mazumdar, Roychoudhury and Datta, P.409

3. Archaeology of Delhi: Car Stephen, p.56

4. The History and Culture of the Indian People: Mazumdar, Vol. 6, Ch. XV

چھوٹے حکمراں خاندانوں مثلاً بنگال، جون پور، مالوہ، گولکنڈہ، احمد نگر اور بیجاپور نے دہلی کے سلطانوں کی پیروی کی۔ اس زمانہ کے صاحب علم اشخاص میں فارسی کے مشہور اور ممتاز عالم امیر خسرو کا جو شاہی کتب خانے کے محافظ تھے، منہاج الدین اور ضیاءالدین برنی کا جو مشہور تاریخ داں تھے۔ مولانا معین الدین عمرانی کا جنھوں نے تفسیر حسینی پر حواشی تحریر کیے اور جو مفتی بھی تھے خصوصیت سے ذکر کرنا چاہیے۔

محمد غوری اور کچھ دوسرے سلاطین مثلاً قطب الدین اور بختیار نے جارحانہ تعصب کی وجہ سے ہندو اور بدھ تعلیمی مرکزوں، مندروں، عبادت گاہوں، درسگاہوں اور کتب خانوں کو تباہ کیا اور تمام راہبوں اور طلبا کو قتل کروادیا۔ لیکن اس تباہی کی تلافی انھوں نے اس طرح کی کہ مسجدیں، کالج اور کتب خانے بنوائے تاکہ اسلامی تعلیم اور مذہب پھیلے تھے

اس دور حکومت میں جسے غلام خاندان کا عہد حکومت کہا جاتا ہے سلطان فیروز شاہ، التمش، سلطانہ رضیہ، ناصرالدین اور بلبن کے نام ان کے ادبی ذوق اور علم کی سرپرستی کے لیے بہت اہم ہیں۔ سلطان ناصرالدین کے لیے مشہور ہے کہ وہ اپنے ذاتی خرچ کے لیے جو پیسے حاصل کرتا تھا وہ اس کی خوشنویسی کی اجرت ہوتی تھی۔ بلبن کا عہد حکومت غیر معمولی ادبی سرگرمیوں کے لیے مشہور ہے جبکہ ایران و خراسان کے سولہ مفرور شہزادوں نے جو صاحبانِ علم بھی تھے منگولوں کی یورشں سے بھاگ کر دہلی میں پناہ لی۔ شہزادہ محمد جو غیاث الدین کا بیٹا تھا، بہت علم دوست تھا اس کی سرپرستی کی وجہ سے بے شمار ادبی انجمنیں وجود میں آئیں۔ شہزادہ محمد شاہنامہ، دیوانِ ثنائی اور دیوانِ خاقانی وغیرہ سے اشعار سنا کرتا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ غلام خاندان کے سلاطین کی براہ راست سرپرستی سے دہلی علم کا مرکز بن گیا۔ خطاطی و خوشنویسی کا سماج میں اہم مقام تھا جس کی وجہ سے کثرت سے کتابیں نقل کی گئیں اور کتب خانوں میں محفوظ کی گئیں۔

شاہی محل کے نظم و نسق پر نظر ڈالنے سے ہمیں ان کے طرز زندگی اور پسند و ناپسند کا پتہ چلے گا۔ شاہی گھرانوں کی دیکھ بھال کے لیے بہت بڑا عملہ تھا جو کئی محکموں میں تقسیم تھا اس میں ہر محکمہ کو کارخانہ کہا جاتا تھا۔ عموماً ممتاز افراد ان محکموں کی سربراہی پر مامور کیے جاتے تھے۔

فیروز شاہ کے وقت میں محل کا اندرونی نظم و نسق چھتیس محکموں پر مشتمل تھا لیکن وقتاً فوقتاً ان محکموں کی تعداد بدلتی رہتی تھی۔ عفیف نے جن کارخانوں کا ذکر کیا ہے ان میں کتاب خانہ بھی تھا جو کتابدار (لائبریرین) کے زیر انتظام ہوتا تھا، جسے مصحف بردار بھی کہا جاتا تھا[6]

---

5. Tabaqati-Nasiri by Minhajus Siraj: Raverty. p. 552.

6. Administration of the Sultanate of Delhi: I.H. Qureshi, p. 67

مندرجہ بالا دو عبارتوں سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ سلاطین دہلی شاہی محل میں باقاعدہ لائبریری رکھتے تھے اور اس کا نگراں لائبریرین ہوتا تھا جس کے ذمہ سوائے لائبریری کے معاملات کے کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا تھا۔

اس طرح سلطان دہلی نے غزنوی خاندان کی روایت کو برقرار رکھا تاکہ دربار کی شان و شوکت قائم رہے و اسلامی تعلیمات کو فروغ حاصل ہو۔

جلال الدین خلجی خاص طور سے قابل ذکر ہے وہ خود ایک مصنف اور شاعر تھا اس لیے اس کے گرد امیر خسرو، تاج الدین عراقی، خواجہ حسن، مؤید دیوانہ، امیر ارسلان قلی، اختیار الدین باغی اور باقی خطیر کی ایسی ممتاز شخصیتیں رہیں۔[7]

جلال الدین نے دہلی میں شاہی لائبریری قائم کی اور امیر خسرو کو اس کا لائبریرین مقرر کیا۔ سلطان نے اس عہدہ کو بڑی اہمیت دی اور ایک صحیح آدمی کا انتخاب کیا۔ امیر خسرو کو نہ صرف لائبریرین مقرر کیا بلکہ قرآن بردار بھی بنایا۔ امیر خسرو کو ایک عظیم عالم اور شاعر مانا جاتا تھا۔ سلطان ان کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا سلطان نے انھیں دربار کا ایک رکن بنایا اور یہ شاہی امتیاز بخشا کہ وہ دربار میں سفید لباس پہن سکیں بحیثیت شہزادہ بھی کیقباد کے دور حکومت میں سلطان نے امیر خسرو کی پنشن مقرر کی اور شاہی انعامات سے نوازا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ شاہی کتب خانے کے نگراں کا عہدہ بڑا قابل قدر اور ذمہ داری کا عہدہ تھا۔[8] علاء الدین نے جو دوسرا سلطان تھا اپنے ابتدائی دور میں تعلیم کی کوئی خاص سرپرستی نہیں کی لیکن آخری دور میں بڑی سنجیدگی سے تعلیمی امور کی اعانت کی۔[9]

اس دور میں جو شعراء اور فلسفی بہت نامور تھے ان میں عظیم صوفی اور عالم نظام الدین اولیاء بہت اہم تھے۔ دہلی میں ان کا مقبرہ مسلمانوں کے لیے آج بھی نہایت مقدس ہے۔ ان کی بھی ایک لائبریری تھی جو جائداد موقوفہ تھی اور ہر ایک عالم کے لیے کھلی تھی یہ لائبریری ان کی خانقاہ غیاث پور دہلی میں تھی جو آج کل نظام الاولیاء کے نام سے مشہور ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی سراج عثمان کے بارے میں لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اس کے بعد انھوں نے کافیہ، مفصل، قدوری اور مجمع البحرین قاضی رکن الدین سے پڑھیں اور ان میں دستگاہ حاصل کی۔ شیخ نظام الدین

---

7. Promotion of Learning in India During the Muhammadan Rule : N.N. Law, p. 30

8. Tarikhi-Firuj-Shahi, Elliot III, p. 144

9. Archaeology of Delhi: Car Stephen, p. 56.

کی وفات کے بعد تیس سال تک انھوں نے دوسرے علوم حاصل کیے اور شیخ
کی لائبریری سے جو وقف تھی کچھ کتابیں لے گئے خرقہ اور خلافت نامہ جو
انھوں نے شیخ سے حاصل کیا تھا اس کو ساتھ لے گئے"۔[10]

شیخ سراج عثمان جو مقدم سراج الدین کے نام سے مشہور ہیں، شیخ نظام الدین اولیا کے اولین مرید تھے وہ جب لکھنوتی سدھارے تو اپنے ساتھ اپنے مرشد کی لائبریری سے کچھ قیمتی کتابیں بھی لے گئے۔[11]

تغلق خاندان کے بادشاہوں نے ایک نیا باب کھولا۔ ان میں سب سے پہلا سلطان غیاث الدین امن و آشتی کا زیادہ صاحبانِ علم کا دلدادہ تھا اس کی ہمدردیاں علما و علمی اداروں کے ساتھ تھیں لیکن وہ اپنے مختصر دورِ حکومت میں مستقل اہمیت کا کوئی کام نہ کرسکا۔ محمد تغلق جو اس خاندان کا دوسرا بادشاہ تھا اپنے علم و فضل اور خطاطی کے لیے مشہور تھا۔

اُن کی ذہانت اور لیاقت نے ہر اس شخص کو متاثر کیا جو ان کے قریب آیا وہ فنونِ لطیفہ کے دلدادہ متمدن، فاضل اور بلند پایہ شاعر تھے۔ منطق، نجوم، فلسفہ، ریاضی اور طبیعیات میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ وہ سکندر نامہ اور تاریخ محمودی جیسی تصنیفات سے کامل واقفیت رکھتے تھے۔ فنِ شعرگوئی میں کوئی سلطان سے بہتر نہ تھا: فارسی شاعری پر انھیں قدرت حاصل تھی اور انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں فارسی کلام کا بہت استعمال کیا ہے"۔[12] خان اعظم خان قتلغ خریطہ دار تھے یعنی سلطان کے قلم کاغذ وغیرہ کے حامل تھے۔ اور امیر تحبہ شاہی دوات دار تھے۔[13]

اس سلطان کی سرپرستی میں دہلی پورے ایشیا میں ایک عظیم علمی و تمدنی مرکز بن سکتی تھی لیکن سلطان کی متلون فطرت اور بدمزاجی نے ایسا ہونے نہ دیا۔ اس کا یہ خیال کہ دارالخلافہ دہلی سے دیوگیر منتقل کیا جائے شہرِ دہلی اور اس کے علمی مرکزوں کے لیے باعثِ تباہی بنا۔ ابن بطوطہ نے جو ۱۳۳۴ء میں دہلی آیا دہلی کو بالکل ویران و اجاڑ حالت میں پایا۔

فیروز شاہ نے دہلی کے قریب فیروز آباد میں نیا دارالسلطنت بنوایا جہاں اس نے مستحکم بنیادوں پر

---

10. Akhbar-ul-Akhyar, p.81, Printed at Meerut 1173 A.H. as quoted in Islamic Culture, Vol. 19, No.4, 1945.

11. Promotion of Learning in India During the Muhammadan Rule: N.N. Law, p. 37

12. History of the Qarannah Turks in India: Iswari Prasad p. 311.

13. History of Qarannah Turks in India: Iswari Prasad p. 311.

اپنے اختیارات کی داغ بیل ڈالی وہ علم و ہنر کا سرپرست تھا۔ اس نے فتوحات فیروز شاہی تصنیف کی۔ مطہر جیسا تاریخ داں اور تاتار خاں جیسا عالم اس کے ارد گرد تھے۔ سلطان نے مدرسے اور مسجدیں تعمیر کرائیں اور انکے لیے اوقاف قائم کیے اس نے قدیم عوامی اداروں کی مرمت اور تجدید کی اور آئندہ ان کی دیکھ بھال کیلیے ضروری انتظامات کیے۔

سلطان نے اپنے غلاموں تک کو تعلیم دلوائی "کچھ غلاموں کا وقت قرآن شریف پڑھنے میں اور اسکو حفظ کرنے میں صرف ہوتا اور کچھ غلاموں کا مذہبی تعلیم حاصل کرنے یا کتابوں کو نقل کرنے میں"۔[14]

اس دور میں مسلم حکمراں، وزرار نیز ہندو راجاؤں نے کتب خانوں کو قائم اور برقرار رکھا ان کے ذاتی کتب خانے زیادہ تر مندروں میں قائم ہوتے تھے۔ ابتدار کے مسلم حکمرانوں نے کتب خانوں کے لیے الگ عمارتیں نہیں بنوائیں قابل قدر مخطوطات اور کتابیں مسجدوں، خانقاہوں اور تعلیمی اداروں میں رکھی جاتی تھیں۔

نگر کوٹ کے جوالا مکھی مندر میں ایک عمدہ لائبریری تھی جس میں تیرہ ہزار کتابیں تھیں۔ فیروز شاہ نے جب نگر کوٹ فتح کیا تو علمار کو بلایا اور کچھ کتابوں کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ مترجمین میں سے ایک اعزالدین خالد خانی شاعر بھی تھا جس نے ان کتابوں میں سے ایک کا جو طبیعات پر تھی فارسی میں ترجمہ کیا اور سلطان نے اس کا نام رکھا "دلائل فیروز شاہی"۔[15]

فیروز شاہ کے فاضل درباریوں میں ایک تاتار خاں تھا وہ مفسر بھی تھا۔ "کہا جاتا ہے کہ جب اس نے تفسیر لکھنے کا ارادہ کیا تو پہلے بہت سی تفسیریں جمع کیں اور علمار کا ایک گروہ اکٹھا کیا مختلف تفسیروں میں بعض آیتوں یا جملوں کی تفسیر میں جو اختلافات اور تضاد تھے ان کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا پھر ان پر اپنی تفسیر میں روشنی ڈالی ایسے سب مقاموں کے اس نے اپنی تفسیر میں باقاعدہ حوالے دیئے ہیں اس طرح بڑی محنت و جانفشانی سے اس نے اپنی تفسیر لکھی۔ اسی طرح تاتار خاں نے فتاوی پر تمام کتابیں جمع کیں اور فقہار میں مسائل کے بارے میں جو اختلافات تھے ان کو جدا جدا بیان کیا۔ اس طرح اس نے فتاوی تیس جلدوں میں

---

14. Promotion of Learning in India During the Muhammadan Rule: N.N. Law. pp.54-55.

15. Promotion of Learning in India During the Muhammadan Rule: N.N. Law. pp. 54-55

مکمل کیا۔[15a]
اس تفصیل سے صاف ظاہر ہے کہ تاتار خاں کی ذاتی لائبریری تھی جس میں فتاویٰ کے موضوع پر قیمتی کتابیں تھیں۔

ستمبر 1388ء میں فیروز شاہ کا انتقال ہوا اس کے بعد ملک میں خوں ریزی اور انتشار برپا ہوگیا بدایونی لکھتا ہے "آئے دن ان دونوں بادشاہوں میں جنگیں ہوتی رہیں اور ہندوستان بھر میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں اپنے اپنے ملک و بادشاہ کے ساتھ وجود میں آگئیں۔"[16] 1398ء کے خاتمہ پر امیر تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا اور ملک کے بڑے حصہ میں غارت گری اور لوٹ مچائی۔ لیکن وہ زیادہ دن نہ ٹھہرا اس کے جانے کے بعد ایسا قحط اور وبا دارالسلطنت پر نازل ہوئے کہ شہر بالکل تباہ ہوگیا جو باشندے شہر سے چلے گئے تھے وہ ختم ہوگئے پورے دو مہینے تک کسی پرندہ نے یہاں پر نہیں مارا۔"[17]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شاہی دارالسلطنت جو بغداد اور قاہرہ سے مقابلہ کرتے تھے کس طرح بار بار برباد ہوئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے تمام تعلیمی ادارے اور کتب خانے بھی تباہ ہوگئے۔

سیّد سلطانوں نے 1414ء سے 1451ء تک حکومت کی اس کے بعد لودی خاندان برسر اقتدار آیا اس دور میں تصنیفات، تالیفات اور ترجمہ کے کام میں نیا جوش پیدا ہوا اور ہندوؤں نے اسلامی ادب کے مطالعہ پر خاص توجہ صرف کی۔

سلطان سکندر لودی نے جو خود ایک شاعر اور بڑا صاحب علم تھا علوم کی حوصلہ افزائی کی۔ بہت سے غیر ملکی علماء اس کے دربار میں کھنچکر آگئے۔ اس کے عہد حکومت میں ایک کتاب ہندوستانی طریقۂ علاج پر لکھی گئی اس کا نام 'طب سکندری' تھا اسے سنسکرت کتابوں سے ترجمہ کرکے میاں بھاوا نے ترتیب دیا تھا۔ اسی نے عمدہ خوش نویس اور قابل آدمی جمع کیے اور ہر علم پر کتابیں تحریر کرائیں۔ اس نے خراسان سے کتابیں منگوائیں انھیں فاضل آدمیوں میں تقسیم کیا۔ مصنفین اس طرح کار تصنیف میں مشغول رہے۔"[19]

15.a Tarikh-i-Firishta, Vol. 1,p.148, Lucknow Edt. As quoted in Islamic Culture, Oct. 1945.

16. Oxford Students History of India: V.Smith, p. 119

17. Advanced History of India, P.337

19. The Qaqi'ati-Mushtaqi: Rizqullah Mustaqi. Elliot IV, p. 451.

1510ء میں محمد بن شیخ ضیاء نے ایک فارسی لغت تصنیف کی اس کا نام تھا تحفۃ السعادت یا فرہنگ سکندری۔ اس کتاب کو شاہ سکندر لودی سے منسوب کیا۔ اس کے علاوہ اس عہد میں بہت سے مسلم علوم کا فروغ ہوا جس میں فلسفہ بھی شامل ہے۔ سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا گیا۔ اس طرح سکندر لودی کی نظر عنایت سے اس کی پوری سلطنت میں بے شمار کتب خانے وجود میں آئے۔

امراء اور درباریوں نے اسی طرح تعلیم کی سرپرستی کی اور اپنے اپنے کتب خانے قائم کیے۔ غازی خان کی جو ابراہیم لودی کے دربار میں تھا ذاتی لائبریری تھی جسے 1525ء میں بابر نے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ تزک بابری کی یہ سطر اس بات کو ثابت کرے گی:

"پیر کے روز قلعہ میں ٹہلتے ہوئے میں غازی خان کی لائبریری میں پہنچا۔"[20] یہ لائبریری دہلی کے قلعہ میں تھی۔

شیخ سعد اللہ جو شیخ رزق اللہ مشتاقی کا باپ تھا۔ ایک مؤرخ تھا جو لودی خاندان کے ساتھ رہا وہ مذہبی عالم اور کتابوں کا شائق تھا اس کی ایک بڑی اور قابل قدر لائبریری تھی[21]

سلاطین کشمیر نے بھی شاہان دہلی کے نقطۂ نظر کی پیروی کی وہ بھی علوم کے عظیم سرپرست بنے۔ زین العابدین نے 1420ء سے 1470ء جو کشمیر کا سلطان تھا بہت سے ادبی ادارے اور کتب خانے قائم کیے۔ بڑی حد تک اس نے فن کتاب سازی کو فروغ دیا اور اسی مقصد کے لیے تکنکی اسکول قائم کیے جہاں لوگوں کو کاغذ سازی جلد سازی اور دوسرے متعلقہ فن سکھائے جاتے تھے۔[22]

2- گجرات کے آزاد سلاطین کے کتب خانے

تغلق سلطنت کے ختم ہو جانے کے بعد 1407ء میں مظفر خاں نے گجرات میں سلطان کی حیثیت سے اپنی حکومت قائم کی یہ آزاد سلاطین ایک سو اسّی (180) سال تک گجرات پر حکمراں رہے۔ اس خاندان کے بادشاہ صرف عظیم منتظم اور عمارتیں بنانے والے ہی نہ تھے، بڑے علم دوست اور شائقین کتب بھی تھے 1411ء م

---

20. Tuzuki- Baburi, Persian Mss., Shib Academy Azamgarh. As quoted in Islamic Culture, Oct. 1945, p. 331
21. E.W., Vol. 12, No.1: Indian Culture in the Late Sultan period.
22. Kashmir under the Sultans. Mohibbul Hasan. p.261.

میں احمد شاہ نے جو مظفر خاں کا پوتا تھا احمد آباد جیسے تاریخی شہر کی بنیاد ڈالی۔ سلاطین گجرات کی سرپرستی میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں اور یمن، حجاز، مصر اور ایران سے علماء ان کے دربار میں آئے ان بیرونی علماء نے اپنی تصانیف کو شاہان گجرات سے منسوب کیا۔

سلطان محمود بیگڑہ (1458ء سے 1511ء) نے بہت سی مسجدیں اور مدرسے تعمیر کرائے وہ کتابوں کا بڑا شائق تھا اور اس کی لائبریری کے نگراں سید عثمان تھے جن کو شمع برہانی بھی کہا جاتا تھا۔ احمد آباد کے قریب عثمان پور کے مدرسہ میں یہ لائبریری واقع تھی [23]۔

دوسرا حکمراں مظفر ثانی (1511ء سے 1526ء) بھی علم کا سرپرست تھا اس نے مصنفین کو بہت انعامات دیئے۔ وہ عمدہ کتابوں کا اس قدر شیدا تھا کہ جب مندو کے سید علی خاں بارانا نے بادشاہ کو ابن حجر عسقلانی کی کتاب فتح الباری شرح بخاری کا نادر نسخہ پیش کیا تو اس نے سید علیخاں کو بروچ کا گورنر بنا دیا۔ بادشاہ نے قرآن شریف کے دو نسخے مکہ اور مدینہ کو ہدیۃً ارسال کیے [24] جسے اس نے خود سنہری روشنائی سے لکھا تھا۔

امرائے گجرات نے بھی سلاطین گجرات کی روایت کو برقرار رکھا۔ سلطان محمد شاہ سوئم (1538ء سے 1554ء) نے آصف خاں ایسے عالم اور مدبر کو مکہ سے واپس بلوایا تاکہ وہ انتشار کی شکار گجرات ریاست کے وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالے۔ آصف خاں کی شہرت بحیثیت بلند پایہ منتظم بہت تھی وہ کتابوں کا بھی شیدائی تھا۔ مکہ سے اس کے ساتھ منتخب عمدہ کتابیں بھی کافی تعداد میں آئی تھیں۔ بدقسمتی سے ہندوستانی ساحل پر اس کا جہاز تباہ ہو گیا اور کتابیں ضائع ہو گئیں۔ [25] ان میں سب سے قیمتی خود مصنف کے قلم کا لکھا مشکوٰۃ کا نسخہ تھا [26]، یہ کتاب احادیث کا ایک مشہور انتخاب ہے۔

---

23. Literary and Cultural Activities in Guzarat Under the Khiljis and the Sultanate: Muhammad Ibrahim Dar, p.45

24. Literary and Cultural Activities in Guzarat Under the Khiljis and the Sultanate: Muhammad Ibrahim Dar, p.46.

25. A History of Gujrat, M.S. Commisariat, p. 426.

26. Literary and Cultural Activities in Gujarat, p.49

سیدی سعید مشہور ماہر تعمیرات نے 1572-73ء میں احمد آباد میں سیدی سعید مسجد تعمیر کی اس کی ایک عمدہ لائبریری بھی تھی[27] اس نے اپنا ذاتی جہاز مصر بھیجا تھا تاکہ جو کتابیں وہ اپنی لائبریری کے لیے چاہتا ہے منگا سکے۔ واپسی میں جہاز کیمبے میں پھنس گیا اس طرح بہت سی کتابیں وہاں تلف ہوگئیں۔[28]

اس زمانہ میں گجرات نے بڑے بڑے عالم، درویش، مصنف اور مؤلف پیدا کیے ان میں سے ایک علی متقی بھی تھا۔ ایک عظیم علم دوست اور استاد کامل ہونے کے ناطے وہ اپنے شاگردوں کو کتابیں اور روشنائی وغیرہ خود دیتا تھا۔ اس نے طلبا کی آسانی کے لیے سیوطی کی جمع الجوامع کو از سر نو ترتیب دیا۔ اس طرح اس نے علوم فقہ کی شاندار خدمت انجام دی۔[29]

---

27. Literary and Cultural Activities in Gujarat, p.49
28. Literary and Cultural Activities in Gujrat, p.49
29. Literary and Cultural Activities in Gujrat, p.54.

باب چہارم

مغلوں چھوٹی مسلم ریاستوں اور مراٹھوں کے کتبخانے

اور معاصر ہندو علمی مراکز

2 - مغل قدیم سرکاری کاغذات کے محافظ خانے ۔

3 - چھوٹی مسلم ریاستوں کے کتب خانے ۔

(الف) بہمنی سلطنت ۔

(ب) بیجاپور۔

(ج) بنگال ۔

(د) گجرات ۔

(ھ) جون پور ۔

(و) خاندیش ۔

(ز) اودھ ۔

4 - مراٹھا حکمرانوں کے کتب خانے و سرکاری کاغذات کے محافظ خانے

5 - ہندو علمی مراکز سے وابستہ کتب خانے ۔

تیموریہ خاندان کی تہذیبی تاریخ ترک ۔ افغان عہد کی روایات کی معراج ہے تیموریہ خاندان کے بادشاہ

تعمیرات کے بڑے شائق اور علوم کے عظیم سرپرست تھے۔ اورنگ زیب کو چھوڑ کر تمام مغل بادشاہوں نے علم و ادب فنون اور موسیقی کے فروغ میں دلچسپی لی۔ کتاب سازی اور کتب خانوں کو اس دور میں خاطر خواہ فروغ حاصل ہوا۔[1]

ظہیر الدین محمد بابر ایک عالم اور ادبی ذوق کا حامل تھا اس نے فقہ اور شاعری کے فن کے متعلق کئی کتابیں لکھی ہیں[2]۔ اس نے فن خطاطی کی حوصلہ افزائی کی اور خود ایک نیا طرز تحریر ایجاد کیا۔ جسے خطِ بابری کہا جاتا ہے[3]۔ بابر کتابوں کا شیدائی تھا، اور اپنی لائبریری میں خصوصی دلچسپی رکھتا تھا۔ ۱۵۲۵ء میں اس نے غازی خاں کی لائبریری کو اپنے قبضہ میں لیا، اسے توقع تھی کہ اس میں بہت سی عمدہ کتابیں ہوں گی لیکن اسے سخت مایوسی ہوئی۔ جیسا کہ اس کے ذیل کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے:۔

"مجموعی طور پر مجھے اس میں بیشتر اہم کتابیں نہیں ملیں حالانکہ سرسری طور پر اس لائبریری کو دیکھ کر بادی النظر میں مجھے اس سے بڑی توقعات تھیں" اس نے بعض منتخب کتابیں ہمایوں اور کامران میں تقسیم کر دیں[4]۔

قابل اور ادبی ہستیاں ہمیشہ بابر کی مصاحبت میں رہا کیں اور شہنشاہ ان کی حوصلہ افزائی کرتا رہا ان میں خوندمیر کا نام قابلِ ذکر ہے وہ ہرات میں کتب خانہ کے محافظ تھے، اور بنگال کی مہم میں بابر کے ساتھ تھے[5]۔

اس کے دورِ حکومت میں "شہرتِ عام" یا محکمۂ تعمیرات عامہ کے فرائض میں شامل تھا کہ وہ مکاتب (اسکول) اور مدارس (کالج)[6] بنوائے۔ ایسی ہر درس گاہ کی اپنی لائبریری بھی ہوتی تھی[7]۔

بابر کو ایک شاہی کتب خانہ[8] اور اپنا ذاتی کتب خانہ قائم کرنے میں بڑا انہماک تھا جہاں وہ اپنی

---

1. Ferishta, Vol. II pp. 61 and 65; also Muntakhabul-Tawarikh V.I. (Ranking), p.449.
2. Talbot's Memoirs of Babur, p.97
3. Talbot's Memoirs of Babur, p.276
4. Elliot's History of India (as told by its own historians) iv.pp. 141 and 143.
5. Tawarikh of Sayyid Maqbar 'Ali as stated in advanced history of India, p.578.
6. Society and Culture in Moghul Age, Chopra, p. 162.
7. Babur Nama (Beveridge), p. 460.
8. I.C. Oct, 1945, p. 331.

پسند کی منتخب اور باتصویر کتابیں رکھتا تھا، اپنی ذاتی لائبریری میں کام بھی کرتا تھا، بابر نے کتابوں کو باتصویر بنانے کے فن کو ایجاد کیا یہ فن اس کے بیٹے اور پوتے کے عہدِ حکومت میں کافی ترقی کر گیا۔[9]

بابر کا بڑا بیٹا ہمایوں ۱۵۳۰ء میں تخت نشین ہوا، اس میں اپنے خاندان کی بہترین صفات موجود تھیں اپنے باپ کی طرح وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور علوم و فنون سے بے حد دلچسپی رکھتا تھا۔ بہ حیثیت جلاوطن شہنشاہ کے جب وہ ایران میں مقیم تھا تو وہ شاہ طہماسپ کے دربار کی ادبی و فنی سرگرمیوں سے بہت متاثر ہوا، اس نے مفردات کی خصوصیات پر چند کتابیں لکھیں اور وہ علوم جغرافیہ اور نجوم کے مطالعہ کا خاص شوق رکھتا تھا۔[10] ہمایوں کے دوسرے پسندیدہ مضامین میں ادب اور شاعری تھے اپنے بزرگوں کی طرح وہ شعراء اور اہلِ فلسفہ سے مباحثے کیا کرتا تھا۔[11] فرشتہ تحریر کرتا ہے کہ شہنشاہ نے سات بڑے بڑے ہال تعمیر کرائے اور سات سیاروں پر ان کے نام رکھے، سیارۂ زحل و مشتری کے نام پر جو کمرے تھے ان میں وہ صاحبانِ ادب کا استقبال کرتا تھا جیسے خوندمیر جو تاریخ داں اور سابق محافظِ کتبخانہ ہرات تھے جو ہر جو مشہور مصنف تھے، امیر البحر سیدی علی رئیس جو ترکستانی عالم، شاعر اور ماہرِ نجوم تھے اپنے سفری روزنامچہ میں امیر البحر رئیس نے لکھا ہے :۔

"میں نے اپنا کام شروع کیا اور اپنے نجومی مشاہدات کو دن رات بغیر آرام لیے کام کر کے ختم کر لیا۔ شاعری اور سیاسی معاملات میں آج کل کافی جوش پایا جاتا ہے اسی وجہ سے مجھے شاہ کے حضور رہنا پڑا۔"[12]

ہمایوں کتابوں کا بڑا شیدائی تھا، اس کے باپ بابر نے اس کے ذوق کی حوصلہ افزائی غازی خاں کے ذخیرۂ کتب سے اسے منتخب کتابیں تحفہ میں دے کر کی ہمایوں کا ذوقِ کتب بینی اس درجہ بڑھا ہوا تھا، کہ وہ میدانِ جنگ میں بھی چنی ہوئی کتابیں اپنے ساتھ رکھا کرتا۔ بنگال اور گجرات کی مہمات میں وہ لائبریری اپنے ساتھ لے گیا۔[13] یہاں تک کہ جب اس نے شیر شاہ سے شکست کھائی اور وہ کیمپ میں خیمہ زن ہوا تب

---

9. Promotion of Learning in India During the Muhammadan Rule: Law, p. 126
10. Promotion of Learning in India During the Muhammadan Rule: Law, p. 127
11. Promotion of Learning in India During the Muhammadan Rule: Law, p. 128
12. I.C. Oct. 1945, P.332.
13. I.C. Oct. 1945, P.332.

بھی اس کے ساتھ کچھ کتابیں اور ایک محافظ کتب موجود تھا[14] اس زمانے میں جب وہ ادھر اُدھر پناہ لیتا پھر رہا تھا، ایک رات ایک جنگلی قبیلہ کولی نے اس کے خیموں پر حملہ کیا اور سب مال واسباب لوٹ لے گئے جس میں تاریخ تیمور رنگ بھی تھی[15]۔ اس کی تصدیق ابوالفضل کی تحریر سے بھی ہوتی ہے۔ بہت سی نادر کتب جو اس کی حقیقی ساتھی تھیں اور جو بادشاہ کے قبضہ میں رہتی تھیں کھو گئیں، ان میں تیمور نامہ مترجمہ ملا سلطان علی بھی تھا جس کو استاد بہزاد نے باتصویر کیا تھا وہ اب شہنشاہ کی لائبریری میں ہے[16]۔ کتب خانے قائم کرنے میں شہنشاہ کی حوصلہ افزائی کا اظہار اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ اس نے اپنی موت سے کچھ پہلے پرانے قلعہ دہلی کی ایک تفریح گاہ کو لائبریری میں تبدیل کر دیا تھا۔ پرانے قلعہ میں یہ عمارت شیر شاہ نے 1541ء میں بطور تفریح گاہ بنوائی تھی اور اس کا نام شیر منڈل رکھا تھا[17]۔ بادشاہ کے کتب خانے کے محافظ لال بیگ یا باز بہادر کے والد نظام تھے[18]۔

ہمایوں نے آگرہ میں جو عالی شان عمارت بنوائی اس کا نام خانۂ طلسم تھا، اس کا خاص حصہ تین عمارتوں پر مشتمل ہے ان میں ایک خانۂ سعادت درمیان میں ہے اور وہ ہشت پہل ہے اس کے بالائی کمرے میں لائبریری تھی جہاں جا نماز، کتابیں، قلم دان، جزدان، باتصویر کتابیں اور خوب صورت خطاطی کے نمونے رہا کرتے تھے[19]۔

شہنشاہ پرانے قلعۂ دہلی میں واقع لائبریری کی سیڑھیوں سے نیچے گرا، اور 25 جنوری 1556ء کو غروبِ آفتاب کے وقت وفات پائی[20]۔

اتنے کم عرصہ میں جو انتشار سے بھرا ہوا بھی تھا ہمایوں کا کردار کتب خانوں کے قیام میں اور کتابوں کے شوق کو عام کرنے میں قابلِ تعریف رہا۔

---

14. Noer's Akbar (Beveridge), p. 136
15. Akbar Nama (Beveridge) Vol. I. pp. 309- 10.
16. Akbar Nama (Beveridge) Vol. I, pp. 309-310.
17. Cambridge History of India, Vol. IV, p. 309
18. Tuzuki-Jahangiri (Rogers and Beveridge), p. 21
19. I.C. Vol. 33, p. 55
20. Cambridge History of India, Vol. IV, p. 69

اکبر جو مغل شہنشاہوں میں عظیم ترین تھا ہمایوں کے بعد تخت نشین ہوا۔ پانی پت کی دوسری جنگ میں جو نومبر 1556ء میں ہوئی اس نے افغان باب کو ختم کیا اور ہندوستان میں اصل مغل دور کا آغاز ہوا۔

نوجوان شہنشاہ نے شروع میں جو حکومت کی اس پر اس کے اتالیق بیرم خاں اور شاہی خاندان کی خواتین کا اثر تھا۔ 1561ء میں بیرم خاں نے وفات پائی اور 1562ء میں اکبر کی والدہ کا انتقال ہوا، اس وقت سے اکبر اپنی وفات تک (1605ء) حکومت کے سلسلہ میں بالکل آزاد رہا۔ سکندر اعظم کی سی بے خوف طاقت سے اس نے پورے شمال ہند کو فتح کر لیا، اور اس علاقہ جنگ و جدل میں امن اور خوش حالی لایا، یہ سماجی اور اقتصادی تبدیلی تہذیبی زندگی کی تمام شاخوں میں خصوصاً مصوری اور تصنیفات میں فروغ و ترقی کی ضامن بنی۔ دوسری زبانوں سے کتابیں خوب ترجمہ کی گئیں اور کتب خانے قائم کیے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہی لائبریری کے علاوہ "جس کی اس وقت کوئی نظیر نہ وہاں نہ دنیا میں کہیں تھی" بے شمار ذاتی کتب خانے اور تعلیمی اداروں سے وابستہ کتب خانے اپنے عروج پر پہنچے۔

اکبر خود پڑھا لکھا نہ تھا مگر نہایت مہذب اور شائقِ علوم تھا، اس کا ذوق نفیس اور روادارانہ تھا، اس میں ایک خاص ذہانت تحقیق بھی، "میرے والد (اکبر) ہر مذہب کے علماء خصوصاً ہندوستان کے ذہین پنڈتوں سے تبادلۂ خیالات کیا کرتے تھے۔ وہ تعلیم سے بے بہرہ تھے مگر عالم فاضل لوگوں سے مسلسل گفتگو کرتے کرتے انکی زبان اس قدر شستہ ہو گئی تھی کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چل سکتا تھا کہ وہ بالکل ناخواندہ ہیں، وہ نظم و نثر کی باریکیوں کو اتنی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اس سے بہتر ممکن نہ تھا[21]۔" یہ تحریر جو اپنے باپ کے متعلق بیٹے اور جانشین کے قلم سے ہے اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ اکبر کا ذہنی رجحان علم و دانش کی طرف کس قدر تھا، اس نے نہ صرف علمی مباحث سے اپنے کو ایک موزوں ہستی بنا لیا بلکہ ایک عمدہ لائبریری بھی رکھی اور قابل تجربہ کار آدمی اس کام کے لیے مقرر کیے کہ وہ اسے کتابیں پڑھ کر سنائیں۔ اس سلسلے میں ابوالفضل لکھتا ہے: "حضور والا کی لائبریری کئی حصوں پر مشتمل ہے کچھ حصے محل شاہی کے باہر ہیں اور کچھ اندر، تجربہ کار افراد روزانہ کتابیں لاتے اور بادشاہ کے حضور پڑھ کر سناتے ہیں جنھیں وہ اول سے آخر تک سنتے ہیں، جس صفحہ پر پڑھنے والا ختم کرتا ہے حضور اپنے قلم سے وہاں ایک نشان لگا دیتے ہیں اور صفحات کی تعداد کے مطابق پڑھ کر سنانے والوں کو تحائف سے نوازتے ہیں جو سونے چاندی کے سکے کی صورت میں ہوتے ہیں۔ مشہور کتابوں میں مندرج تاریخی واقعات یا سائنسی معلومات یا

21. Tuzuki-Jahangiri (Rogers and Beveridge), p. 33.

فلسفہ کے دلچسپ نکات کوئی ایسے نہیں جن سے شہنشاہ واقف نہ ہوں۔ وہ کتاب سنتے ہوئے تھکن محسوس نہیں کرتے چاہے سمجھنے کے لیے دوبارہ سننا پڑے بلکہ اسے اور دلچسپی سے سنتے ہیں اس طرح اکبر مختلف فلسفوں، ادبی اسلوب اور تاریخی واقعات سے واقف ہوا۔[22]

اکبر کو شاہی کتب خانہ اپنے باپ سے ورثہ میں ملا اور اپنی علم دوستی اور کتب نوازی کی بدولت اس نے لائبریری کو کافی وسعت دی (پلیٹ نمبر ۱/۱) یہ ذخائر کتب زیادہ تر ذاتی کتب خانوں سے حاصل ہوئے مثلاً گجرات، جون پور، کشمیر، بہار، بنگال اور دکن کے کتب خانوں سے ملے[23] اس کے علاوہ اکبر کے دربار میں جو تصنیفات و تراجم ہوتے اور وزیروں اور اعلیٰ افسران نے تحفہ کے طور پر جو کتابیں اکبر کو پیش کیں ان سے بھی لائبریری میں اضافہ ہوا۔

فیضی کی لائبریری میں 4300 مخطوطے تھے اس کی موت کے بعد یہ ذخیرہ شاہی لائبریری میں منتقل کر دیا گیا[24] اور ان مخطوطوں کو درج کر کے شاہی ذخیرۂ کتب کے ساتھ ان پر نمبر دیے گئے۔ فیضی کے کتابوں کے تین حصے اور ایک ایک تصنیف کے کئی کئی نسخے تھے، مثلاً نل دمن کے ایک سو ایک نسخے تھے[25]

فتح گجرات کے دوران اعتماد خاں گجراتی کی لائبریری شہنشاہ نے حاصل کر لی اور اس کو شاہی لائبریری کا حصہ بنا دیا گیا[26] گجرات کی مکمل تسخیر کے بعد مرزا خانِ خاناں دوبارہ دربار میں داخل ہوئے اور چونتیسویں سال انھوں نے شہنشاہ کو بابر کی چغتائی یادداشتوں کا فارسی ترجمہ پیش کیا جو واقعاتِ بابری کے نام سے موسوم ہے[27]۔

بادشاہ کے حکم سے بہت سی سنسکرت اور دوسری زبانوں کی اہم تصانیف فارسی میں ترجمہ کی گئیں۔ مہابھارت کا ترجمہ فارسی کے فضلا مثلاً نقیب خاں، مولانا عبدالقادر بدایونی اور شیخ سلطان تھانیسری نے کیا، اس میں ایک ہزار اشعار تھے اور اس کو رزم نامہ یعنی کتاب جنگ کا نام دیا گیا۔ بدایونی نے 1582ء میں

---

22. Ain-i-Akbari (Blochman) Vol:I,pp. 109-110.
23. I.C.Oct. 1948, p. 332.
24. Aini-Akbari (Blochman), Vol. I, P.550
25. Tarikhi-Badauni (Elliot), p.548.
26. Tarikhi-Badauni (Elliot), p.519.
27. Ain-i-Akbari (Blochman), p. 355

چار سال کی لگاتار جانفشانی کے بعد رامائن کا ترجمہ کیا، حاجی ابراہیم سرہندی نے اتھر وید کا ترجمہ کیا۔ فیضی نے لیلاوتی کا جو ہندو ریاضی کی کتاب تھی اور مکمل خاں گجراتی نے تاجک کا ترجمہ کیا جو علم نجوم کی مشہور کتاب تھی، مرزا عبدالرحیم خان نے بابر کی یادداشت کو ترکی سے فارسی میں منتقل کیا، مولانا شاہ محمد شاہ آبادی نے تاریخ کشمیر کا کشمیری سے ترجمہ کیا، مجمع البلدان کا جو شہروں اور ملکوں پر ایک کتاب تھی، کئی علماء نے عربی سے ترجمہ کیا، اس کے علاوہ نل دمن کلیلہ دمنہ اور تاریخ الفی کا جو ایک ہزار سال کی تاریخ تھی کئی عالموں نے مل کر ترجمہ کیا۔[28]

مذکورہ بیان سے بخوبی واضح ہے کہ اکبر کے عہد میں ترجمہ کا ایک مستقل شعبہ تھا اور بہت سی اہم کتابیں شاہی کتب خانہ میں داخل کی گئیں تھیں۔[29] اکبر کے ذاتی اور شاہی کتب خانے بہت سی اور بھی (نئی) تصانیف سے مالا مال تھے، اہم مصنفین میں سے غزالی، فیضی، محمد حسین نظیری نیشاپوری، اور سید جلال الدین عرفی شیرازی وغیرہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ جیروم زیویر نے جو ایک ممتاز عیسائی پادری تھا عیسائی مذہب اور فلسفہ پر فارسی میں کتابیں لکھیں اور انھیں بادشاہ اکبر اور جہانگیر کو پیش کیا۔[30]

اکبر نے تحریر میں حسن کے اضافہ کے لیے فنِ خوش نویسی و خطاطی کی حوصلہ افزائی کی وہ مصور کتابوں کو جو خوشخط لکھی گئی ہوں بہت پسند کرتا تھا۔ آئینِ اکبری کے مصنف سے روایت ہے کہ اکبر کے زمانہ میں آٹھ طرزِ تحریر رائج تھے جیسے ثلث، طوقی، محقق، نسخ، ریحان، رقاع، غبار اور طالیق۔[31] اکبر نستعلیق طرزِ تحریر کا دلدادہ تھا اور اس نے اس فن کے ماہر استاد محمد حسین کشمیری کو زرین قلم کا خطاب دیا تھا۔[32] اکبر چونکہ خوشخط کتابوں کا شوقین تھا اس لیے ان عمدہ سے عمدہ چھپی ہوئی کتابوں کی کوئی پروا نہ کرتا تھا جو عیسائی مشنِ اوّل نے اکبر کو پیش کی تھیں۔[33] لیکن اکبر شائع شدہ کتابوں سے ڈیوک فیڈریگو شاہ اربینو کی طرح برسرِ پیکار نہ تھا جس نے کبھی چھپی کتابوں کو نہ خود حاصل کیا نہ اپنے ذخیرۂ کتب میں شامل ہونے دیا۔[34]

---

28. Ain-i-Akbari (Blochman), p.112.
29. Tarikhi-Badauni (Elliot), p. 374.
30. I.C. Vol. 35, No. 3, pp. 170-176.
31. Ain-i-Akbari (Blochman), pp. 106-107.
32. Akbar the Great Moghul, Smith, p.426.
33. Akbar the Great Moghul, Smith, p.426.
34. History of the book, Svend Dahl, p. 109.

اول عیسائی مشن نے اکبر کو ایک ضخیم اور مجلد انجیلِ مقدس پیش کی جو چار زبانوں یعنی عبرانی، کلدی لاطینی اور یونانی میں تھی اور سات جلدوں پر مشتمل تھی۔ اس متعدد زبانوں والی شاہانہ بائبل کی ادارت مونٹانس نے کی تھی اور اسے پلینٹن نے 1569-1572ء میں شاہ فلپ ثانی کے لیے اینٹ ورپ میں شائع کیا تھا اس کتاب کو اکبر نے عیسائی پادریوں کو واپس کر دیا اور یہ 1857ء تک لکھنؤ کی کیتھولک لائبریری میں موجود رہی۔ اس طرح اکبر کے پاس بہت سی یوروپی کتابیں تھیں اور اس نے 1595ء میں تیسرے عیسائی مشن کے پادریوں کو انھیں دکھایا تھا۔ اکبر نے پادریوں سے کہا کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق اس سے کتابیں لے سکتے ہیں، عیسائی پادریوں نے اکبر کی لائبریری سے شاہی نسخۂ انجیل، شماؔ اور سینٹ تھامس اکیونس کی تصانیف، ڈامینگو ڈی سوٹو کی کتابیں، فورسگلیون کے سینٹ انٹونیو کی تصانیف، پوپ سلویسٹر (متوفی 1003ء) کارڈینل کیجی ٹان (1470ء تا 1524ء) سینٹ فرانسس کی کرونیکا، پوپ سلسلہ کی تاریخ، پرتگال کے قوانین، انفانسو البوقرق کی تفسیر، برازیل کے پادری جوآن ایسپلیٹا کی تحریریں (جوآن جیروم زیویر کا رشتہ دار تھا اور 1555ء میں جس نے وفات پائی) اگنیٹس کی کتاب اگزرسیٹیا اسپریچولیا، پادری امانوئل الواریز (1582ء تا 1526ء) کی تحریر کردہ کتاب دستور العمل سماجیات اور لاطینی قواعد وغیرہ اور دوسری وہ کتابیں جن کے ایک سے زیادہ نسخے تھے حاصل کیں۔[35]

پادریوں نے یوروپی کتب کے علاوہ حضرت عیسیٰ کی زندگی پر اور عیسائی مذہب پر فارسی ترجمے پیش کیے، اکبر ان کتب کا بہت قدر دان تھا اور اکثر ان کو پڑھا کرتا تھا۔ جب پادری پگنیرو 1605ء میں آگرہ میں تھا اور پادری زیویر بھی وہیں موجود تھے تو انھوں نے شاہ کو ایک کتاب بہ زبانِ فارسی پیش کی جس میں حضرت عیسیٰ کی زندگی، معجزات اور عیسائی اصول دین کا ذکر تھا، بادشاہ نے خود اس کی فرمائش کی تھی کہ اس موضوع پر کتاب پیش ہو۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اکبر ان کتب کی کتنی عزت کرتا تھا اور اس نے عظیم سپہ سالار اگیس کوا (عزیز کوکا) سے اکثر ان کتابوں کو پڑھوا کر سنتا تھا اور بہت فرحت حاصل کرتا تھا اس نے پادری سے اس کا دوسرا نسخہ طلب کیا اس کتاب کا اتنا چرچا ہوا کہ عمائدین اس کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک امید نظر آنے لگی کہ اس کتاب کے ذریعہ غیر عیسائی لوگوں میں خدا کے بیٹے حضرت عیسیٰ کی معرفت بڑھے گی، اس کتاب کے بعد بادشاہ نے حضرت عیسیٰ کے روحانی جانشینوں کی زندگی پر کتاب طلب کی۔[36]

---

35. The Jesuits and the Great Mōgul, Maclagan, pp. 191-192.

36. J.A.S.B. Vol. X,1914,p.65.

جارج اینکنگ کے پاس جو آکسفورڈ سے متعلق تھے اور کلکتہ یونیورسٹی کے مجالس امتحانات کے سابق سکریٹری بھی تھے زیویر کا فارسی ترجمہ جو حضرت عیسیٰ کے جانشینوں کی زندگی پر تھا موجود تھا۔ اس کتاب میں مختلف مقام پر شاہی مہر محمد اکبر بادشاہ غازی ۱۰۱۳ھ یعنی ۱۶۰۶ء موجود ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب اکبر کے شاہی کتب خانہ میں تھی۔[37]

شہنشاہ کو خوبصورت (مخطوطے) اور باتصویر کتب بہت پسند تھیں۔ اکبر نے شاہی کتب خانے کے لیے باتصویر مخطوطہ رزم نامہ حاصل کیا اس پر اس کے چالیس ہزار پونڈ خرچ ہوئے اس کا ایک نسخہ جے پور دربار لائبریری میں موجود ہے۔ شاہی سرپرستی کی وجہ سے بے شمار قابل اور ماہر خطاطوں نے اس فن کو کمال تک پہنچانے میں اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔

ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں ان خطاطوں کے نام اور فن کا ذکر کیا ہے۔[38] اس عہد میں سو[100] سے زائد مصور فن کے ماہر بن گئے۔[39] اکبر کی لائبریری میں بے شمار کتابیں ایسی تھیں جن میں مصوری کے نادر نمونے تھے۔ بارہ جلدوں پر مشتمل کتاب داستانِ حمزہ تھی۔ جس میں ایک ہزار چار سو تصاویر تھیں۔ اس کے کتب خانے میں چنگیز نامہ، ظفر نامہ، رزم نامہ، رامائن، نل دمن، کلیلہ دمنہ وغیرہ کتابیں سب باتصویر تھیں۔[40] فنِ مصوری کی حوصلہ افزائی کے لیے شہنشاہ نے ایک شاہی تصویر خانہ قائم کیا تھا۔[41]

۱۶۰۵ء میں اکبر کی وفات ہوئی۔ اس کی موت کے بعد آگرہ کے شاہی قلعہ میں شاہی املاک کی ایک فہرست بنائی گئی دو یوروپی مصنفین مزیق اور ڈی لیکٹ نے اس فہرست کی نقل شاہی کاغذات سے حاصل کی جس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ شاہی کتب خانہ میں چوبیس[24000] ہزار باتصویر مجلد کتابیں موجود تھیں۔ اس کتب خانہ کی قیمت تقریباً 6,463,731 روپیہ تھی۔ ایک اوسط کتاب کی قیمت 27 سے 30 پونڈ تک تھی اور اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ پونڈ میں کتب خانہ کی قیمت 737,169 پونڈ ہوئی۔[42] ملا پیر محمد جو اکبر کے استاد بھی

37. J.A.S.B. Vol. X, 1914, p. 71.
38. Ain-i-Akbari (Blochman), pp. 107-109
39. Ain-i-Akbari (Blochman), p.114.
40. Ain-i-Akbari (Blochman), p. 115.
41. Promotion of Learning in India During the Muhammaden Rule, Law, p. 154.
42. J.R.A.S. (The Treasures of Akbar) April, 1915.

تھے اس کتب خانہ کے نگراں تھے۔[43]

شاہی خزانۂ کتب کے علاوہ اس زمانہ میں اور بھی بہت سے کتب خانے تھے جو وزرا، بزرگین عمائدین شہر یا رانیوں کی ذاتی ملکیت تھے۔ اکبر کی ایک ملکہ جن کا نام سلیمہ سلطان بیگم تھا بہت لائق اور تعلیم یافتہ تھیں ان کی ایک ذاتی لائبریری تھی۔[44] ملکہ نے بہت سی فارسی نظمیں مخفی کے نام سے لکھیں۔[45] بدایونی بہت پریشان ہوا جب اس کی ایک زیرِ ترتیب کتاب "بتیس شاہی تخت"[32] غائب ہو گئی بعد میں معلوم ہوا کہ سلیمہ بیگم اس وقت اس کا مطالعہ فرما رہی تھیں۔[46] گل بدن بیگم نے جو شہنشاہ بابر کی صاحبزادی اور "ہمایوں نامہ" کی مصنف تھی اپنی ذاتی لائبریری کے لیے کافی کتابیں جمع کیں۔[47]

امراء کے کتب خانوں میں عبدالرحیم خانخاناں کا ذاتی کتب خانہ تھا وہ ایک عالم تھے اور آغازِ ملازمت میں احمد آباد کے گورنر بھی رہے۔ شیخ فیضی کے کتب خانے بھی قابلِ ذکر ہیں۔ خانخاناں کی ذاتی لائبریری اتنی بڑی تھی کہ اس میں ۹۵ ملازمین تھے، ملازمین میں کتب خانہ کا نگراں، جلد ساز، خطاط اور مترجم شامل تھے۔ لائبریری میں زیادہ تر ایسی کتابیں تھیں جو مصنفین کے قلم کی لکھی ہوئی اور اُن ہی کی پیش کی ہوئی تھیں۔ طالبانِ علم اس کتب خانہ میں آتے اور اپنی پیاس بجھاتے تھے۔[48] مولانا ابراہیم نقاش جو ایک عالم، مصنف، جلد ساز اور سنہری قلم خطاط تھے، خانخاناں کی لائبریری میں کتاب دار کے عہدہ پر مامور تھے، میر باقی کتب خانہ کے ناظم یعنی افسرِ اعلیٰ تھے۔[49] نعمت اللہ جو مخزنِ افغانی کے مصنف تھے خانخاناں کی لائبریری میں نگران تھے بعد میں انھوں نے شہنشاہِ جہانگیر کے دربار میں تاریخ نویس کی حیثیت سے کام کیا۔[50]

---

43. Tarikhi-Akbari. Ms. in the Asiatic Society of Bengal, leaf 42 as quoted by Law in Promotion of Learning in Muslim India, p. 141.

44. J.I.H. Vol. 31, p. 162.

45. Ain-i-Akbari (Blochman), p. 322.

46. Lowe' Badauni, pp. 186, 389.

47. Humayun Namah, Mrs. Beveridge, p. 76.

48. Society and Culture in the Moghul Age. Chopra. p. 165

49. I.C. Oct. 1945, p. 333.

50. Niamatullah's History of the Afgans, N.B. Roy. P.V.

مغلیہ عہد کے شیوخ بھی کتابوں کے بڑے شائق تھے۔ شیخ فیضی کی ذاتی لائبریری میں ۴۳ ہزار کتابیں تھیں۔ ان کے بعد یہ ذخیرۂ کتب آگرہ میں شاہی لائبریری کو منتقل کر دیا گیا۔[51] (پلیٹ نمبر ۴)

سپہ سالار منعم خاں، خانخاناں اکبر کے زمانہ میں جونپور کا گورنر تھا جس نے دریائے گومتی پر جونپور کے نزدیک پل تیار کرایا تھا، وہ بہت علم دوست تھا اور اس کا محبوب ترین مشغلہ اپنی لائبریری کے لیے کتابیں جمع کرنا تھا۔ بہادر خان ازبک اس کا دوست تھا جس نے کلیاتِ سعدی کا ایک نسخہ اسے تحفہ میں دیا، اس نے اپنی لائبریری کے لیے مرزا کامران کا دیوان بھی خریدا تھا۔[52]

اکبر کی وفات کے سات روز بعد سلیم تخت نشین ہوا، تاج پوشی آگرہ میں ہوئی اس نے اپنا لقب "نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی" اختیار کیا۔ جہانگیر اگرچہ عیش پسند تھا مگر ذوقِ نفیس اس کی فطرت اور کچھ اعلیٰ صفات اپنے باپ اکبر اور پر دادا بابر سے ورثہ میں اس نے حاصل کیں تھیں۔ تزکِ جہانگیری سے جہانگیر کے ادبی ذوق اور کتابوں سے دلچسپی کا پتہ لگتا ہے۔ جہانگیر علوم کا سرپرست بھی تھا اس نے تعلیم کو فروغ دیا اس نے حکم دیا کہ لاولد دولت مندوں کی وفات پر ان کا مال اور جائداد مدرسوں، خانقاہوں اور کتبخانوں کی تعمیر پر صرف ہو۔ اس نے ان مدرسوں کی بھی از سرِ نو تعمیر کی جو تیس سال کے طویل عرصہ سے وحشی پرندوں اور جانوروں کی رہائش گاہ تھے ان میں وہ طلباء اور مدرسین نظر آنے لگے۔[53] اس طرح شاہی سرپرستی کی بدولت آگرہ مرکزِ علوم اور علماء و عقلاء کا مسکن رہا۔

جہانگیر نے نہ صرف اس عظیم شاہی لائبریری کو جو ورثہ میں ملی تھی قائم رکھا بلکہ اس میں اور اضافہ کیا اور ایک تصویر خانہ بھی بنوایا، اس کے عہد میں مکتوب خاں، لائبریری اور تصویر خانہ دونوں کے نگراں تھے۔[54] شاہی کتب خانہ کے علاوہ جہانگیر کی ذاتی لائبریری بھی تھی اسے کتابوں سے اتنی اُلفت تھی کہ جب

---

51. Ain-i-Akbari (Blochman) Vol.I p. 550.

52. I.C. Oct. 1945, p. 337

53. Ta'rikhi-Jan Jahan by Jan Jahan Khan Ms. In the Asiatic Society of Bengal as quoted by Law in Promotion of Learning in Muslim India, p. 175.

54. Tuzuki-Jahangiri, Rogers and Beveridge, p. 12.

وہ گجرات گیا تو اس کی ذاتی لائبریری بھی اس کے ساتھ گئی وہاں اس نے اپنی لائبریری میں سے علماء کو کتابیں بطور تحفہ دیں۔ جہاں گیر نے اس کو یوں بیان کیا ہے۔

"۱۵ ارتاریخ بروز منگل گجرات کے عمائدین دوسری بار مجھ سے ملنے آئے میں نے ان کو خلعت بخشے اور زمین اور زادِ راہ بھی دیا اس کے بعد انھیں جانے کی اجازت دی، ان میں سے ہر شخص کو میں نے اپنی ذاتی لائبریری میں سے ایک ایک کتاب دی مثلاً تفسیر کشاف، تفسیر حسینی، روضۃ الاحباب۔ ہر ایک کتاب کی پشت پر میں نے گجرات میں آمد کی تاریخ اور کتابیں بطورِ تحفہ دینے کی تاریخ درج کی۔"[55]

لائبریری میں اضافے نیز اپنے جذبۂ کتب نوازی کی تسکین کے لیے جہاں گیر بہت گراں قیمت پر مخطوطے خرید لیا کرتے تھے۔ مارٹن نے لکھا ہے کہ "جس مخطوطے کو جہانگیر نے تین ہزار اشرفیاں ادا کر کے خرید یعنی دس ہزار پونڈ، اس کو اگر پیرس میں فروخت کیا جاتا تو دو ہزار پونڈ میں بھی نہ بک سکتا۔ صدیوں تک قدیم و نادر کتابوں کی قدر کا یہ سلسلہ چلتا رہا اور ان کے لیے بڑی بڑی رقمیں ادا کی جاتی رہیں جیسے آج کل اہلِ امریکہ ریمبرینڈس (Reaembrandts) اور وان ڈائکس (Van Dycks) کے لیے ادا کرتے ہیں۔"[56]

جہاں گیر نے کتابوں کو باتصویر بنانے کے فن کی کافی حد تک سرپرستی کی، جس طرح اس کے باپ اکبر کو بڑی قلمی تصویروں سے دلچسپی تھی۔ جہاں گیر نے اس خیال سے کہ پڑھنے والے صرف بیان و تفصیل کو اتنا پسند نہ کریں گے، "جہاں گیر نامہ" کو باتصویر بنانے کے لیے مصور مقرر کیے کہ ان جانوروں کی بڑی تصویریں بنائیں جو مقرب خاں نے انھیں گوا کے سمندری ساحل سے لا کر پیش کی تھیں۔[57]

عظیم شاہی لائبریری کو درست رکھنے کے لیے بڑا عملہ تھا جس میں نقل نویس بھی شامل تھے۔ جب جہاں گیر نے اپنی تزک مکمل کر لی تو کتب خانے کے کاتبین کو حکم دیا کہ وہ اس کے بہت سے نسخے تیار کریں اور ملک کے عمائدین میں تقسیم کر دیں۔ شاہ جہاں کو پہلی نقل پیش کی گئی۔ جہاں گیر نے فنِ خطاطی کی بھی سرپرستی کی اور اپنے

---

55. I.C.Oct. 1945, p. 338

56. Miniature Pairtings and Painters of Persia, India and Turkey, Vol. I, p. 58.

57. Waqi'ati-Jahangiri, Elliot, V. I, p. 331.

عہد کے ممتاز خطاطوں کی قدر و منزلت کی۔ شہنشاہ نے شیخ فرید بخاری کو جو عظیم خوش نویس تھے خلعت سے نوازا، جواہرات والی تلوار، قلم اور قلمدان وغیرہ دیئے اور "میر بخشی" کا خطاب عطا کیا، انھوں نے کہا کہ میں تمہیں صاحب السیف والقلم سمجھتا ہوں[58]۔

نور جہاں ملکۂ جہانگیر انتہائی مہذب اور کتابوں کی دلدادہ تھی۔ اس کی ذاتی لائبریری تھی اس نے تین سنہری مہریں دے کر دیوانِ کامران خریدا تھا، وہ نسخہ ابھی خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ اس کتاب کے صفحۂ اول پر یہ عبارت درج ہے، "تین سنہری مہریں اس خزانہ کی قیمت ہے" نواب نور النساء بیگم[59]۔

شیخ فرید بخاری جہانگیر کے دربار کے عمائدین میں سے تھے وہ ایک عرصہ تک للپور و احمد آباد کے گورنر رہے، ان کی ایک ذاتی لائبریری تھی جس کے لیے انھوں نے دیوانِ حسن دہلوی خریدا تھا، یہ دیوان بھی آج خدا بخش لائبریری پٹنہ کی ملکیت ہے[60]۔

شاہجہاں نے بھی اپنے اجداد کی طرح علم و ادب کی سرپرستی کی، اس نے علماء فضلاء کی حوصلہ افزائی کی اور تحائف دیئے۔ بہت سے شعراء، ماہرینِ دینیات اور تاریخ داں اس کے عہد میں فروغ پاتے رہے، ان میں قابلِ ذکر عبدالحمید لاہوری مصنف بادشاہ نامہ محمد صالح مصنف اعمال صالح، عنایت خاں مصنف شاہجہاں نامہ ہیں۔ شاہجہاں کے بڑے بیٹے دارا شکوہ کی سرپرستی میں بہت سی اہم کتابیں لکھی گئیں اور فارسی میں ترجمے کیے گئے۔

ان اہم تصنیفات و تراجم کے علاوہ چار ضخیم لغات مرتب کی گئیں اور ان کا شاہجہاں کے نام سے انتساب کیا گیا، یہ لغات تھیں (الف) فرہنگ راشدی (ب) منتخب اللغات شاہجہانی مرتبہ عبدالرشید ٹھٹھوی (ج) چہار عنصر دانش مرتبہ امان اللہ اور شاہد صادق مرتبہ محمد صادق، ان میں سے آخری لغت مذہبی، فلسفی، سیاسی اخلاقی اور انسانی مسائل سے متعلق ہے[61]۔

شہنشاہ نے دہلی میں ایک شاہی کالج کی بنیاد ڈالی اور قدیم کالج کی جو دارالبقا کے نام سے مشہور تھا مرمت کروائی۔ یہ چیز قدرتی ہے کہ ان اداروں میں کتب خانے ہوں گے، اگرچہ بادشاہ خاص طور سے کتابیں

---

58. Tuzuki Jahangiri, Rogers and Beveridge, V.I, p. 13

59. Ms. of Diwan -i- Kamran. Khuda Bux Library, Patna.

60. Catalogue of the Mss of Khuda Bux Library, V.I, p.248

61. History of Shah Jahan, B.P. Saksena, pp. 252-57.

جمع کرنے اور کتب خانوں کو فروغ دینے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا لیکن جو کتابیں اسے رات گئے سنائی جاتی تھیں ان کو غور سے سنتا تھا۔ سرجادو ناتھ سرکار لکھتے ہیں "ساڑھے آٹھ بجے وہ حرم میں واپس آتا، دو تین گھنٹے عورتوں کے مجرے سننے میں صرف کرتا، پھر وہ اپنے بستر پر آرام کے لیے لیٹتا اور کتابیں سنتے سنتے سو جاتا، بہترین پڑھنے والے پردہ کے پیچھے بیٹھتے، یہ پردہ انھیں شاہی خواب گاہ سے جدا کرتا تھا۔ وہ بلند آواز میں کتابیں پڑھتے یہ کتابیں عموماً سفرنامے، درویشوں اور پیغمبروں کی سوانح اور بادشاہوں کی تاریخی کتابیں ہوتی تھیں مگر بے بہا معلومات رکھتی تھیں، ان میں شاہ تیمور کی سوانح حیات اور بابر کی خود نوشت سوانح حیات اس کی محبوب اور پسندیدہ کتابیں تھیں[62]۔

جان البرٹ فان مانڈیلسلو (SOHANN ALBERT MANDELSLO) ایک نوجوان جرمن اپریل 1638ء میں سورت آیا اور اسی سال کے آخر میں اس نے احمد آباد، بمبئی، آگرہ اور لاہور کا دورہ کیا اس نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ شاہ جہاں کی شاہی لائبریری میں 24000 ہزار عمدہ مجلد کتابیں تھیں[63]۔ لائبریری کے سربراہ کو دارغۂ کتب خانہ کہا جاتا تھا[64]، عبدالرحمٰن، راشد علی خطاط، میر صالح، میر سید علی، اعتماد خاں، عنایت خاں ولد ظفر خاں کے نام اس عہدہ کیلیے لیے جاتے ہیں[65]۔ اس زمانہ میں آگرہ اور دہلی میں کچھ عمدہ کتب خانے تھے جس کے نگراں پادری تھے[66]، ان کتب خانوں میں پادریوں کی تصنیف کردہ مشرقی زبانوں میں کتابیں بھی تھیں اور مشرقی مذہبی مخطوطات بھی تھے، آگرہ کالج کی لائبریری کو جزوی طور پر شاہجہاں کی ہدایت پر لٹوایا اور جلوا دیا گیا اور 1759ء میں احمد شاہ ابدالی نے دہلی کی اس لائبریری کو لوٹا[67]۔

پادری ہنری بُوسی پہلی بار 1650ء میں دہلی گیا اس کا مقصد یہ تھا کہ عیسائی مبلغین کی مغل دربار میں دوبارہ رسائی ہو سکے، اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے شہزادہ دارہ سے اور دربار کے چند عمائدین سے رابطہ قائم کیا، کچھ مسلم وزراء کی ذاتی لائبریریوں میں عیسائی لٹریچر موجود تھا۔ پادری بُوسی نے مسلمانوں کے ایک ایسے اُستاد سے گفتگو بھی کی، جس کا ایک بڑا کتب خانہ تھا جس میں عیسائی مذہب کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں

---

62. Anecdotes of Aurangzeb and Historical Essays, J. Sarkar, p. 174.

63. Mandelslo-Harris Travels, Vol. II, p. 118

64. History of Shah Jahan. B.P. Saksena, p. 277.

65. History of Shah Jahan. B.P. Saksena, p. 277.

66. The Jesuits and the Great Moghul, Maclagna, p. 139.

موجود تھیں۔[67]

جون ۱۶۵۸ء میں اورنگ زیب تخت نشین ہوا، وہ صاحبِ عقل و فہم ذہین مصنف، اعلیٰ منتظم، بہادر سپاہی اور نیک مسلم بادشاہ تھا۔ اُس نے اسلامی تعلیمات کو بڑھایا، بہت سے اسکول اور کالج قائم کیے، پرانے مدرسوں کی مرمت کروائی، اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنے گورنروں کو حکم دیا کہ ہندو مندروں اور اسکولوں کو مسمار کردیں، اور ہندو مذہبی رسموں کا خاتمہ کردیں۔[68]

اورنگ زیب بہت مذہبی تھا، وہ پابندی کے ساتھ آخر شب میں 2 بجے نماز کے بعد قرآن پڑھتا یا اُسے نقل کرتا، اسلامی قانون کی کتابیں یا مذہبی رسائل اور کتابچے پڑھتا تھا۔[69] اس کی آخری وصیت سے یہ صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ اپنے قرآن کے نقل شدہ نسخوں کے ہدیہ سے اس نے تین سو پانچ روپے جمع کیے تھے۔[70]

چونکہ اورنگ زیب قوانینِ شریعت اور عقائدِ اسلامی پر یقین راسخ رکھتا تھا اس لیے اس نے حکم دیا کہ ملا نظام کی قیادت میں فتاویٰ عالمگیری جمع کیا جائے، تفسیر، حدیث اور فقہ پر کتابیں اکٹھا کی جائیں، ان کتب سے شاہی لائبریری کو مزین کیا گیا،[71] اور اس نے محمود گاواں کے مجموعۂ کتب کو بیدر سے حاصل کرکے شاہی لائبریری میں داخل کیا۔[72]

اپنے پیشروں کی طرح اورنگ زیب نے بھی ممتاز خوش نویسوں کو نوازا، شہزادہ داراشکوہ اور شہزادی زیب النساء کو آقا عبدالرشید نے جو ایک مشہور و معروف خطاط تھے خوش نویسی کی تعلیم دی تھی۔ شہنشاہ نے یہ فن شاہی لائبریری کے نگراں سید علی تبریزی سے حاصل کیا۔[73]

محمد علی صالح شاہی لائبریری کے ناظم تھے اور محمد منصور اور سید علی الحسینی اس کے مہتمم جن میں سے اوّل الذکر مہتمم کو مکرمت خان کا خطاب دیا گیا تھا۔[74]

---

67. The Jesuits and the Great Moghul, Maclagna, p. 116.
68. Anecdotes of Aurangzib and Historical, Essays, J.Sarkar p.11
69. Anecdotes of Aurangzib and Historical, Essays, J. Sarkar p.131.
70. Anecdotes of Aurangzib and Historical, Essays, J. Sarkar p.52
71. Promotion of Learning in Muslim India, Law, p.193
72. J.I.H. Vol.31, p. 165.
73. I.A. Vol.8, No.2, p.44
74. I.C. Oct. 1945, p.339

شہنشاہ کی دختر زیب النساء نہایت متمدن خاتون تھی وہ ایک شاعرہ تھی، اُسی کی درخواست پر ملا صفی الدین نے امام رازی کی تفسیر کبیر کا فارسی ترجمہ کیا اور اس کا نام زیب التفاسیر رکھا۔ وہ کتب جمع کرنے کی شائق تھی، اہلِ علم کے لیے ایک بڑی لائبریری (مآثر عالمگیری) اپنے طور پر قائم کی تھی۔[75]

3 مارچ 1907ء کو اورنگ زیب کی وفات ہوئی اس کے بعد مغلیہ حکومت کا زوال شروع ہوا تخت کے لیے اس کے بیٹوں میں خوں ریز جنگ شروع ہو گئی، اس کے جانشینوں میں بہادر شاہ (1707ء سے 1712ء) محمد شاہ (1719ء سے 1748ء) اور شاہِ عالم ثانی (1759ء سے 1806ء) متمدن تھے اور ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ان سب نے باوجود قسمت کے نشیب و فراز اور 1733ء میں نادر شاہ کے حملہ کے مغلیہ روایات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ بہادر شاہ نے کچھ اور کالج قائم کیے اور اہلِ علم و فضل حضرات کی حوصلہ افزائی کی

نادر شاہ نے محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان پر حملہ کیا اور شہر دہلی میں قتلِ عام کا حکم دیا۔ اس نے شاہی تاج کے تمام جواہرات، مشہور ہیرا کوہِ نور، تختِ طاؤس اور شاہی لائبریری سے بہت سی قیمتی فارسی قلمی کتابیں جو مصور تھیں اپنے قبضہ میں لے لیں اور ساتھ لیتا گیا۔

شاہِ عالم نے شاہی کتب خانہ کی شان و شوکت کو بحال کرنے کی کوشش کی اور اس کے لیے بہت خلوص سے کتابیں جمع کیں، عبرت نامہ میں لکھا ہے "غلام قادر نے جو شیطان بہ شکلِ انسان تھا، نہایت ظالمانہ انداز سے بادشاہ کو آنکھوں سے محروم کیا اور جواہر خانہ میں داخل ہو کر جواہرات سے لبریز ایک صندوقچہ قرآن کے کئی نسخے اور ایک بڑا ٹوکرا بھر کر شاہی لائبریری سے کتابیں نکال کر لے گیا"[76]

اس عہد کی دوسری قابلِ ذکر لائبریریوں میں مہاراجہ میسور چکا دیو رایا (1672ء سے 1704ء) مہاراجہ جے پور سوائے سنگھ ثانی (1699ء سے 1713ء) کے قیمتی کتب خانے تھے، چکا دیو رایا کی لائبریری کو جس میں نادر سنسکرت فلسفیانہ و تاریخی کتابیں تھیں ٹیپو سلطان نے تباہ کی۔ جے سنگھ علم نجوم میں گہری دلچسپی رکھتا تھا، اس نے نجوم پر یورپ تک سے کتابیں منگوائیں، جے سنگھ کے کتب خانہ میں اقلیدس کی کتابیں، جیومیٹری اور ٹرگنامیٹری کی کتابیں، لاہائر کی ٹیبولی اسٹرانامیکل (Tabulae Astronomical)

---

75. Medieval Indian Culture. Yussuf Hussain, p.91

76. Promotion of Learning in India During the Muhammadan Rule, Law, pp.198-99.

اور فلیمسٹیڈ کی ہسٹوریا (Flamsteads Historia) وغیرہ کتابیں موجود تھیں[77]۔ اس کی موت کے بعد جے سنگھ کی لائبریری اس کے بیٹے جگت سنگھ نے ایک طوائف کو دے دی اور اس طرح یہ تباہ ہو گئی۔ اس کتب خانہ کی کتابیں طوائف کے ذلیل رشتہ داروں میں تقسیم کر دی گئیں[78]۔

مغلوں کے آخری دورِ حکومت میں پادری حضرات ہندوستان سے بہت سی کتابیں فرانس لے گئے اور لوئی پانزدہم (1729ء سے 1775ء) کو پیش کیں[79]۔

2۔ مغل سرکاری کاغذات کے محافظ خانے

بغداد اور قاہرہ کی روایات کے مطابق شاہانِ مغلیہ نے بھی اہم سرکاری کاغذات کو محفوظ کیا۔

مغل حکومت کو کاغذی راج کہا جاتا ہے کیونکہ بیشتر سرکاری معاملات کو کاغذ پر تحریر کر لیا جاتا تھا[80]۔

مغلیہ درباروں میں بہت سے وقائع نویس اور محرر ہوتے تھے جو تمام سرکاری امور اور احکام کو تفصیل سے رقم کرتے۔ اکبر کے دربار میں ایسے ۱۴ وقائع نویس تھے[81]۔ اس بیان کی تصدیق "ڈوجری" (Du Jarric) اور ابوالفضل کی تحریروں سے بھی ہوتی ہے۔

واقعہ نویس کے فرائض کے بارے میں ابوالفضل لکھتا ہے :۔ "ان کا کام ہے کہ احکام و افعالِ شاہ کو رقم کریں اور محکموں کے سربراہ جو رپورٹ دیں اسے درج کریں[82]۔" ڈوجری کی تحریر سے ہمیں مندرجہ ذیل معلومات حاصل ہوتی ہیں، "بادشاہ کے ساتھ مختلف سکریٹری ہوتے ہیں ان کا کام ہے کہ ہر وہ لفظ جو بادشاہ کی زبان سے نکلے درج کریں[83]۔" اورنگ زیب کے عہد میں واقعہ نویسوں کی ہفتہ وار رپورٹیں شب میں نو بجے خواتین افسران شاہ کو سنایا کرتیں تاکہ بادشاہ اپنے ملک میں ہونے والے واقعات سے باخبر رہے[84]۔ مانوکی ساکن وینس

---

77. Society and Culture in Mughal Age, Chopra. p.165.

78. Astronomical Observatories of Jai Singh, Kaye, p.2

79. J.B.H.S. Vol. VI. pp.68-93.

80. Mughal Administration, Sarkar, p.10

81. I.A. Vol. 8, p.46.
82. I.A. Vol. 8, p.33

83. Akbar and the Jesuits: De Jarric Pierre: (Tr.by Payne) p.[illegible]
84. Storia Do Mogor II (Tr.Irvin), p.331.

تحریر کرتا ہے کہ اورنگ زیب نے جب ایران میں سفارت خانہ قائم کیا تو اس میں حسبِ معمول افسران یعنی واقعہ نویس اور خفیہ نویس بھیجے[85]۔

مغلیہ سرکاری کاغذات کے دفاتر مندرجہ ذیل سرکاری کاغذات محفوظ کیا کرتے تھے[86]۔

1۔ واقعہ یعنی شاہی دربار کی روزآنہ رپورٹ۔

2۔ شاہی احکام۔

3۔ سرکاری خط و کتابت۔ اس میں شاہی خطوط، شاہی خاندان کے خطوط، عمائدین کی باہمی خط و کتابت اور بادشاہ سے خط و کتابت، افسران کے خطوط فتح نامے اور طومار وغیرہ شامل تھے۔

4۔ مختلف محکموں کے جاری کردہ احکام۔

5۔ متفرق ریکارڈ یعنی وصیت نامے۔ اعداد و شمار، سرکاری اعمال کی تفصیل اور خبر نامے وغیرہ۔

6۔ درباری تاریخ میں منشیوں کے روزنامچے شامل تھے۔

عہدِ مغلیہ میں مذکورہ بالا کاغذات مرکزی دار الخلافہ میں اور ریاستی حکومت کے دفتروں میں محفوظ کیے جاتے تھے۔ دفتر خانہ ایک داروغہ کے تحت ہوتا تھا جو سرکاری کاغذات کا ذمہ دار ہوتا تھا، صوبائی دفتر خانے وزیرِ خاص یا دیوان کے تحت ہوتے جو الگ الگ صوبوں سے متعلق تھے۔

مغلوں کے زمانہ میں ہمسایہ حکومتوں کے ریکارڈ اور کاغذات بھی دفتر خانوں میں محفوظ کیے جاتے تھے۔ اس کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ ایران کے شاہ طہماسپ کے فرمان کی ایک نقل اکبر کے آگرہ کے دفتر خانے میں موجود ہے اور ایک بغیر تاریخ کا شاہجہانی فرمان جو بیجاپور یا گولکنڈہ سلطنت سے متعلق ہے، باگانگر حیدرآباد کے دفتر خانہ میں ہے[87]۔

اکبر کے دفتر خانہ کی عمارت اب تک فتح پور سیکری میں موجود ہے۔ یہ ایک بڑا ہال ہے جس کی لمبائی ½40 فٹ اور چوڑائی ½20 فٹ ہے اس کے دالان پر چھت ہے اور سامنے ایک صحن ہے، یہ ایک چبوترہ پر بنایا گیا ہے جو اکبر کی خواب گاہ سے جنوب کی طرف واقع ہے[88]۔

---

85. Storia De Mogor II (Tr.Irvin), p.331.
86. I.A.Vol.8, p.51.
87. I.A.Vol.8, p.53
88. I.A.Vol.8, p.53

یورپی سیاح ولیم فنچ سنہ 1611ء جونس ڈی لیکٹ (Joannes de Laet) سنہ 1593ء سے سنہ 1649ء اور سبسٹین منریق (Sebastian Manrique) نے آگرہ کے دفتر خانہ کو دیکھا تھا۔[89] اسی قسم کے ریکارڈ رکھنے کے کمرے دہلی کے لال قلعہ میں اورنگ زیب اور بہادر شاہ کے عہد میں بھی موجود تھے۔

3۔ چھوٹی مسلم ریاستوں کے کتب خانے

اب تک لائبریری کے فروغ کے سلسلہ میں ترک، افغان اور مغل حکمرانوں نے جو کردار ادا کیا اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی مسلم حکومتیں وجود میں آئیں اور انھوں نے کتب خانوں کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ عہد وسطی کے ہندوستان میں لائبریری کے ارتقا کا جائزہ مکمل کرنے کے لیے چھوٹی حکومتوں کی مساعی کا ذکر ذیل میں کیا جائے گا۔

بہمنی سلطنت

بہمنی سلطنت جس کی بنیاد ایک افغانی مسمی حسن کانکوئی نے سنہ 1317ء میں ڈالی اس سلسلہ میں خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ بہمنی بادشاہوں نے سنہ 1526ء تک حکومت کی ان کی سلطنت ایک سمندر سے دوسرے سمندر تک پھیلی ہوئی تھی وہ علوم کے سرپرست تھے انھوں نے بہت سے کالج اور لائبریریاں قائم کیں۔ مجاہد شاہ بہمنی نے سنہ 1378ء میں یتیموں کی تعلیم کے لیے ایک کالج قائم کیا۔[90] احمد شاہ نے ایک شاندار کالج گلبرگہ کے قریب قائم کیا۔[91] محمد شاہ بہمنی ثانی نے بیدر میں ایک عالیشان کالج قائم کیا جو بہمنی سلطنت کی عظمت رفتہ کی ایک خوبصورت یادگار ہے۔[92] ان سب کالجوں کی اپنی اپنی لائبریریاں تھیں۔ بیدر کالج کی لائبریری میں طلبا اور استادوں کے استعمال کے لیے تین ہزار کتابیں تھیں۔[93] ان اداروں کے کتب خانوں کے ساتھ ساتھ امراء، وزراء کے ذاتی کتب خانے بھی تھے۔ محمود گاواں جو تین پشتوں تک بہمنی سلطنت میں

---

89. I.A.Vol.8, pp.53-54.

90. Promotion of Learning in India During the Muhammadan Rule, Law, p.82

91. Ferishta, Vol.II (Brigg), p.402.
92. Ferishta, Vol.II (Brigg), p.510.
93. Ferishta, Vol.II (Brigg), p.514.

قاسمی بادشاہوں کا وزیر رہا تھا۔ نہایت سادہ مزاج اور علم دوست آدمی تھا۔ محمد شاہ سوئم ۱۴۶۳ء سے ۱۴۸۲ء کی فوجی فتوحات محمود گاواں کی ایماندارانہ اور دانشمندانہ پالیسی کا نتیجہ تھیں۔ جب محمود گاواں اس مہم سے فتح مند واپس ہوا تھا تو اسے اعلیٰ عہدہ پر فائز کیا گیا۔ بادشاہ کی والدہ نے اسے اپنا بھائی بنایا بادشاہ نے اپنا لباس اسے بطور خلعت دیا اور تین ہفتے شرف میزبانی بخشا۔

فرشتہ نے ایک کہانی بیان کی ہے کہ محمود گاواں پر جب یہ تمام شاہی نوازشیں ہوئیں تو اس کے جواب میں اس نے جو کچھ کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتب خانوں کے بارے میں اس کا کیا رویّہ تھا۔

"محمد شاہ جب اس کے گھر سے رخصت ہوا تو محمود گاواں اپنے کمرہ میں واپس آیا۔ اپنا شاندار لباس اتارا، زمیں بوس ہو کر زار و قطار رو دیا پھر باہر آ کر اس نے درویشوں کا لباس پہن لیا۔ اس نے مذہبی پیشواؤں اور عالموں کو بلوایا جن میں بیدر کے سادات بھی شامل تھے ان میں اپنی دولت اور جواہرات تقسیم کر دیئے اپنے لیے صرف ہاتھی، گھوڑے اور کتب خانے رکھے اور کہا کہ بحمد اللہ میں لالچ سے بچ گیا اور اب میں خطرہ سے آزاد ہوں۔"

ملّا شمس الدین نے دریافت کیا کہ گھوڑے ہاتھی اور کتب خانہ کے علاوہ ہر شے اس نے فقراء میں کیوں تقسیم کر دی؟ اس نے جواب دیا "جب بادشاہ میرے مہمان بنے اور ان کی والدہ نے مجھے اپنا بھائی کہا تو میرے ارادوں نے میری عقل پر قابو پانا شروع کیا اور میرے دماغ کے اندر نیکی اور بدی کے جذبات میں جنگ شروع ہو گئی، میں بادشاہ کی موجودگی کے باوجود پریشان ہو گیا جب بادشاہ نے از راہِ مہربانی اس کی وجہ دریافت کی تو میں نے اپنے رویّہ کی پردہ داری کرتے ہوئے بیماری کا بہانہ کیا۔ بادشاہ نے مجھے آرام کرنے کی ہدایت کی اور محل واپس چلے گئے۔" محمود گاواں نے کہا کہ "اسی لیے میں نے اس دولت کو اپنے سے جدا کر دیا جو ایک برائی کا ذریعہ تھی" اس نے کہا کہ لائبریری کو میں نے اس لیے روکا کہ اسے طلباء استعمال کریں اور ہاتھی گھوڑے اس کی ملکیت نہ تھے بلکہ بادشاہ کی ملکیت تھے جو وقت ضرورت اس کے تصرف میں دے دیئے جاتے تھے"۔

اس دن کے بعد اس نے ہمیشہ سادہ لباس پہنا جب وہ معاملات ملکی سے فرصت پاتا تو اپنی مسجد اور درسگاہ میں چلا جاتا اور اپنا وقت علماء فضلا اور صاحبانِ تقویٰ کی صحبت میں گذارتا تھا۔[94]

محمود گاواں نے ذاتی کتب خانہ اپنے پاس رکھا اس میں اس کی موت کے وقت تک (یعنی اپریل ۱۴۸۱ء) 35 ہزار قلمی کتابیں تھیں جسے طلباء اور علماء ہمیشہ استعمال کر سکتے تھے۔[95]

---

94. Perishta (Briggs) II, pp. 486-87.
95. Hadiqatul Aqlim, Ms. in A.S.B. leaf 39.

بیجاپور| بیجاپور اور گولکنڈہ کو ایسے لائق بادشاہ پیدا کرنے کا فخر حاصل ہے جنھوں نے صاحبانِ علم کی سرپرستی کی اور تعلیمی ادارے اور کتب خانے قائم کیے۔ ماقبل اسلام بیجاپور بحیثیت مرکزِ علم خاصا مشہور تھا اس کی تین منزلہ سنگی عمارت جس میں ایک کالج تھا ماضی کی زندہ مثال ہے بعد میں اس کو مسجد بنا دیا گیا۔

عادل شاہی حکمراں علم کے سرپرست اور شائقین کتب تھے۔ رفیع الدین نے جو علی عادل شاہ اوّل (1558ء سے 1580ء) کا مقرب اور اعلا عہدہ دار تھا اپنی کتاب تذکرۃ الملوک میں بیان کیا ہے کہ علی عادل شاہ اوّل کو کتب بینی کا کتنا ذوق تھا۔ وہ لکھتا ہے :-

"سلطان کو کتابیں پڑھنے سے بڑی رغبت تھی انھوں نے ملک کے ہر ہر شاخ پر کتابیں جمع کیں کہ لائبریری بھر جائے۔ تقریباً ساٹھ آدمی جس میں خوش نویس، مصوّر، جلد ساز اور کتب کے سجانے والے شامل تھے۔ دن بھر لائبریری کے کام میں مشغول رہتے تھے[96] بادشاہ کتابوں کا اتنا شائق تھا کہ سفر یا فوجی مہم میں بھی کتابیں اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ اس نے (یعنی عادل علی شاہ اوّل نے) اتنی کتابیں منتخب کیں کہ اس سے چار صندوق بھر گئے جنھیں وہ محل میں بھی ساتھ رکھتا اور سفر میں بھی لے جاتا تھا۔ اتفاق سے ایک بار سفر میں ان کے جاتے جاتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی، چشموں اور دریاؤں میں ایسا سیلاب آگیا کہ تھوڑی دور راستہ طے کرنا دشوار ہو گیا۔ ان حالات میں فوج منتشر ہو گئی۔ جب بادشاہ منزلِ مقصود پر پہنچا تو اسے کتابوں کے صندوق یاد آئے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ صندوق شاہی خزانے کیساتھ دوسرے راستہ سے واپس ہو گئے اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں وہ ہیں اور قیام پذیر ہیں اس پر وہ بہت ناراض ہوا اور کہا "میں نے تم سے ہزار بار کہا ہے کہ کتابوں کے صندوق کسی بھی حالت میں مجھ سے جدا نہ کیے جائیں مگر میرے کہنے کا تم پر کوئی اثر نہ ہوا" فوراً ایک درباری کو روانہ کیا گیا کہ لائبریری واپس لے کر آئے اور جب تک وہ صندوق وہاں پہنچ نہ گئے وہ برابر مضطرب رہا۔"[97]

فرشتہ جو ایک عظیم مؤرخ اور تاریخ فرشتہ کا مصنف تھا اس کو ابراہیم عادل شاہ ثانی نے اپنی شاہی لائبریری میں کام کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ حال میں تلاش شدہ رقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہندو عالم دمی پنڈت بن انت جو بیجاپور کے خاندانِ شیش سے متعلق تھا وہ شاہی لائبریرین تھا

---

96. Sardha Satabdhi Special volume of the J.A S. Bombay, Vols. 31 and 32, p.97.
97. Sardha Satabdhi Special volume of the J.A.S. Bombay, vols. 31 and 32, p.98.

کاغذات سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ قیمتی شاہی مخطوطات کے تحفظ کے لیے نارد بن گنگادھر اور حسین خاں 1567ء میں اور منجن خاں 1575ء میں عادل شاہی اعلا افسران کی صف میں تھے وہ اس بات کے ضامن تھے کہ پنڈت دمن کی نگرانی میں جو کتب و مخطوطات ہیں محفوظ اور باقی رہیں۔ لائبریرین کی سالانہ تنخواہ ایک ہزار ہن یا تقریباً 3500 روپے تھی۔ یقین کیا جاتا ہے کہ لائبریرین دمن پنڈت نے جو انت کا پوتا تھا بیجاپور اس وقت چھوڑا جب محمد عادل شاہ نے (1627ء سے 1656ء) چاہا کہ وہ اسلام قبول کرلے[98]

شاہی لائبریری کے بارے میں فرگوسن اپنی کتاب میں لکھتا ہے :-

"اس کی کچھ کتابیں ہر اس شخص کے لیے جو عربی فارسی ادب سے واقف ہے عجیب اور دلچسپ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تمام قیمتی مخطوطے گاڑیوں میں بھر کر اورنگ زیب لے گیا جو باقی بچا وہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے لیکن اس عمارت کے نگراں مفادات کے لیے وہ قیمتی ہے جو فخر اور افسردگی کے ساتھ آنے والوں کو اس کی زیارت کرواتے ہیں"[99]

شاہی لائبریری کے کھنڈرات عصری محل بیجاپور میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

بنگال

مرشد قلی جعفر خاں نواب بنگال 1704ء سے 1725ء صاحب علم و فن تھا اور ان حضرات کی قدر و منزلت کرتا جو علم و فضل اور نیکی میں ممتاز ہوتے وہ نہایت عمدہ خوش نویس تھا[100] اتنا متمدن اور مہذب نواب جو روزانہ کچھ گھنٹے قرآن شریف کی نقل کرنے میں صرف کرتا تھا اور دو ہزار قاری اور خوش الحان حضرات کی تلاوت قرآن شریف اور دوسرے مذہبی کاموں پر مامور تھے کفالت کرتا تھا یقیناً اس کی ذاتی لائبریری ہوگی[101] علی وردی خاں 1740ء سے 1751ء تک مسند بنگال پر متمکن رہا اس نے بھی علوم کی سرپرستی کی اور مرشد آباد میں اس کا دربار صاحبان علم کا مرکز بن گیا ان میں سے ایک عالم میر محمد علی تھے جن کی لائبریری

---

98. Sardha Satabdhi Special volume of the J.A.S. Bombay, vols. 31 and 32, pp.106-107.

99. Architecture of Bijapur Ferguson, p.75.

100. Stewarts' History of Bengal, p.463.

101. Stewarts' History of Bengal, p.41

میں دو ہزار کتابیں تھیں۔[102]

گجرات سلطان احمد جو گجرات کا آزاد حکمران (1554ء سے 1561ء) تھا۔ تعلیم کا دلدادہ تھا اس نے اسکول کالج اور کتب خانے قائم کیے۔ سلطان احمد کی شاہی لائبریری کے متعلق تاریخ بدایونی میں لکھا ہے کہ اپنے باپ کی وفات کے بعد مظفر شاہ نے اس لائبریری سے کتابیں نکال کر مدرسۂ شمع برہانی کے طلبا کو دے دیں۔[103] جب اکبر نے گجرات فتح کیا تو اسی لائبریری میں سے کچھ کتابیں اپنے دربار کے عمائدین میں تقسیم کیں۔

شاہی لائبریری کے علاوہ بہت سی ذاتی لائبریریاں بھی تھیں۔ سیّد محمد شاہ عالم (متوفی 1475ء) گجرات کے عظیم درویش تھے ان کی ذاتی لائبریری تھی۔[104] ان کے جانشین سیّد بدر جعفر عالم کے زمانہ میں لائبریری کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ اوّل الذکر نے عرب اور ایران سے نادر کتب جمع کیں اور آخر الذکر نے ایک مدرسہ قائم کیا لائبریری اس کالج کا ایک حصہ تھی۔[105]

جون پور پندرھویں صدی کے دوران شرقیہ ریاست جون پور ایک اہم مرکزِ علم بن گئی اس کا ہندوستان کی ذہنی قیادت کا دعویٰ اس طرح درست کہا جا سکتا ہے کہ یہاں بہت سے علما اور مذہبی مصلحین پیدا ہوئے جنھوں نے عوام کی اور مختلف تحریکوں کی رہنمائی کی۔ جون پور کو ہندوستان کا شیراز کہا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں یہاں جداگانہ رجحان کے بیس مدارس قائم ہوئے اور ہر مدرسہ میں سیکڑوں طلبا تھے۔[106]

مشرقی بادشاہ دانشمند حکمراں تھے انھوں نے اہلِ قلم اور عالموں کی سرپرستی کی جون پور میں کئی عمدہ کتب خانے قائم ہوئے۔ تمدنی امتیاز اور اچھے کتب خانوں کی شہرت کے باعث ہندوستان کے مختلف حصوں سے صاحبانِ علم یہاں آئے۔ ان میں سے مولوی معشوق علی اور مفتی سیّد ابوالبقا کے ذاتی کتب خانے بہت مشہور تھے اوّل الذکر کتب خانہ میں پانچ ہزار کتابیں تھیں۔[107]

---

102. Siyarul-Mutakhkhirin: Tr.Sayyid G.H.Khan, Vol.2,p.63 n.

103. I.C. Oct. 1945, p.341.
104. I.C. Oct. 1945, p.341.
105. I.C. Oct. 1945, p.343.

106. Humayun Badshah, S.K. Banerjee, pp.179-180
107. I.C. Vol.XX.p.15

خاندیش | سلاطین دکن طاقتور مغلوں کی یورش کے مقابل اپنی حفاظت نہ کر سکے اکبر نے خاندیش کو فتح کرلیا اور ۱۶۰۱ء میں یہ ریاست سلطنت مغلیہ میں شامل کرلی گئی۔

خاندیش کے سلطان عالموں، شاعروں اور صوفیوں کی قدر کرتے۔ ان کی ایک عمدہ لائبریری بھی تھی مورخ فرشتہ نے اس لائبریری کو دیکھا اور اس کی کچھ کتابوں سے استفادہ کیا۔ ان میں سے ایک کتاب سے فرشتہ نے فاروقی حکمرانوں کی تاریخ نقل کی ہے[108]۔ برٹش میوزیم میں ایک خط ہے جو ملک فیضی نے راجہ علی خاں سلطان خاندیش کے نام لکھا تھا اور اس کی لائبریری میں موجود تغلق نامہ سے چند صفحات کی نقل مانگی تھی[109]۔

اودھ | مغلیہ سلطنت کے زوال کے زمانہ میں مملکت کے مختلف حصوں میں علاحدگی کا جذبہ پیدا ہوا اور صوبائی گورنروں نے دربار دہلی سے آزاد ہونے کا اعلان کر دیا۔ ایسے گورنروں میں صوبہ داران دکن، اودھ اور بنگال اہم تھے۔ ۱۷۲۴ء میں سعادت خاں جو گورنر اودھ تھا سلطنت اودھ کا بانی بنا۔ سعادت خاں کے جانشینوں نے آٹھ پشتوں تک اودھ پر حکومت کی اور دارالسلطنت لکھنؤ رہا۔

نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ء سے ۱۷۹۵ء) کی دریا دلی اور علم پرستی کی بدولت لکھنؤ میں مدرسے کتب خانے اور فنون کے اسکول قائم ہوئے۔ اس طرح لکھنؤ اسلامی تہذیب کا نہایت اہم مرکز بن گیا اور دہلی کی تہذیبی برتری کا حریف ثابت ہوا۔

لکھنؤ اور اس کے قرب وجوار میں جو کتب خانے قائم ہوئے اس میں شاہی لائبریری قابل ذکر ہے۔ اسپرنگر ایک انگریز ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ آیا اس سے ہمیں شاہی لائبریری کے بارے میں جو قدیم دولت خانہ نزد گومتی میں واقع تھی مندرجہ ذیل اطلاع ملتی ہے۔ اسپرنگر لکھتا ہے:-

"میں لائبریری میں علامہ تفضل خاں کے ہمراہ گیا۔ اس میں تقریباً تین لاکھ کتابیں ہیں اور ہر سو کتابوں پر ایک ملازم ہے"

"مختلف زبانوں عربی، فارسی اور انگریزی کی نثری اور منظوم دونوں قسم کی کتابیں وہاں موجود ہیں۔ خوش نویسوں کے قطعات کے علاوہ وہاں ہندوستان، یورپ اور ترکی کے مصوروں کے شاہکار اس کثرت

---

108. Ferishta II, p. 227
109. I.O. Vol.XX, p.6

سے تھے کہ ان سب کو مشاہدہ کرنے کے لیے عمرِ نوح درکار ہوگی۔ مجھے بے شمار ادبی کتابیں دیکھنے کا موقع ملا مثلاً بلارک، مسالک، مفاتیح کشکول اور بحرالانوار وغیرہ"

"اس میں خاصی کتابیں وہ ہیں جو خود مصنفین کے قلم کی لکھی ہوئی تھیں اور پوچھنے پر مہتمم نے کہا کہ ایسی تقریباً سات سو قلمی کتابیں لائبریری میں ہیں جب دہلی تباہ ہوئی تو مغلیہ لائبریری کا بڑا حصہ لکھنؤ کی شاہی لائبریری میں آگیا۔"

> "سچ تو یہ ہے کہ اس لائبریری میں اس قدر قیمتی کتابیں ہیں کہ شاہی لائبریری کے بیش بہا جواہرات بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"[110]

ایس۔ اے ظفر نادر لکھتے ہیں کہ انھوں نے ہندوستان کی مختلف لائبریریوں میں ایسی کتابیں دیکھی تھیں جن پر شاہی کتب خانہ لکھنؤ کی مہر تھی۔ اس بیان سے اسپرنگر کے بیان کی تصدیق ہو جاتی ہے۔[111]

سنہ 1789ء کے قریب مرزا سلیمان شکوہ جو شاہ عالم کے تیسرے بیٹے تھے لکھنؤ کی طرف فرار کر کے آ گئے۔ نواب آصف الدولہ نے ان کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ وہ خود ایک شاعر تھے اور شعراء و مصنفین کی سرپرستی کرتے تھے۔ ان کی لائبریری میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے دیوان کے کئی نسخے تھے۔ رام پور کی لائبریری میں اس دیوان کے کئی نسخے ہیں جن پر مرزا سلیمان شکوہ کی مہر ثبت ہے۔[112]

4۔ مراٹھا حکمرانوں کے کتب خانے اور سرکاری کاغذات کے محافظ خانے۔

اس عہد کی روایات کے عین مطابق مراٹھوں نے بھی علوم کی حوصلہ افزائی کی اور صاحبانِ علم کو دکشنا پیش کی۔ اس مد پر وہ خاصی بڑی رقم خرچ کیا کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انعام و اکرام کے باعث مراٹھا سلطنت کے بڑے شہروں میں اور دارالسلطنت پونا میں سنسکرت کے بہت سے علمی مراکز بن گئے اور ہندوستان کے مختلف حصوں سے عالم و فاضل حضرات وہاں آئے۔ آخری پیشوا باجی راؤ ثانی ہر سال "دکشنا" (مالی امداد) پر چار لاکھ روپے خرچ کیا کرتا تھا۔[113]

---

110. I.G. Vol.XX, p.8
111. I.G. Vol.XX. p.7
112. I.G. Vol.XX, p.8

113. Administrative System of the Marathas, S.N.Sen, p.471

یہ بالکل فطری تھا کہ ان تمدنی سرگرمیوں کے باعث مراٹھا مملکت میں لائبریریاں اور سرکاری کاغذات کے محافظ خانے وجود میں آئے۔ 48-1747ء میں بالاجی باجی راؤ نے اپنی لائبریری کے لیے 36 مخطوطے اور دے پورے فراہم کیے اور 59-1755ء میں اس نے پندرہ اور قلمی کتابیں خریدیں، پیشواؤں نے نہ صرف مخطوطے جمع کیے بلکہ قدیم نادر مخطوطوں کو نقل بھی کروایا۔ 66-1765ء میں مادھو راؤ اوّل ہر ماہ اپنی لائبریری کے مخطوطات نقل کرنے پر اکتیس سو روپے خرچ کیا کرتا تھا۔[114]

مغلوں کی طرح مراٹھے بھی شاہی دفتر یا حضور دفتر کے، جس میں سرکاری کاغذات، دستاویزیں، حسابات بڑی احتیاط کے ساتھ محفوظ کیے جاتے تھے، کافی بڑا عملہ رکھتے تھے۔ اس دفتر میں دو سو سے زائد کارکن یا کلرک تھے۔[115] اس کے علاوہ ہر ایک گاؤں میں ایک پاٹل ہوتا تھا جس کی تحویل میں وہاں کے کاغذات ہوتے تھے۔ گاؤں کے کاغذات کے محافظ کو کلکرنی کہا جاتا تھا۔ پیشوا حکمرانوں کے کاغذات مصدقہ اور درست ہونے کے اعتبار سے معیار کا درجہ رکھتے تھے۔ پیشوا باجی راؤ ثانی کے عہد تک دفتر خانہ کی شاندار روایات قائم رہیں اس کے بعد دفتر خانہ نہ صرف لاپرواہی کا شکار ہوا بلکہ اس کا عملہ بھی تقریباً ختم ہو گیا اور لوگوں کو چھوٹ مل گئی کہ وہ کاغذات چاہیں تو گھر لے جائیں یا جو چاہیں کریں۔"[116]

5- ہندو علمی مراکز سے وابستہ کتب خانے

بنارس، ترہٹ، متھلا، ندیا اور دوسرے اہم ہندو مراکز نے ہندوستان میں عہد وسطیٰ میں لائبریری کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ ان علمی مرکزوں کے کتب خانوں میں دینیات، فلسفہ، طب، سائنس اور تاریخ پر مخطوطات کے ذخیرے موجود تھے۔ ڈاکٹر فرائرے جو سترھویں صدی کا ایک سیاح تھا ان کتب خانوں کو دیکھا جن میں سنسکرت مخطوطات بھرے ہوئے تھے۔" "اور وہ مذہبیات پر روشنی ڈالتے تھے۔"[117]

اپنے ہندوستان کے سفر کے دوران برنیئر (1656ء سے 1668ء) بنارس آیا اس خط میں جو اس نے شیراز (ایران) سے مانسر چیپلین کے نام 4 اکتوبر 1667ء کو لکھا تھا وہ بنارس میں سنسکرت تعلیم کا ذکر کرتا ہے۔

---

114. Administrative System of the Marathas, S.N.Sen,p.472
115. Administrative System of the Marathas, S.N.Sen,p.267
116. Administrative System of the Marathas, S.N.Sen,p.271
117. Travels in India in the 17th Cy.,p.392.

سترھویں صدی میں بنارس سنسکرت علوم کا مرکز اور نامی گرامی عالموں کا وطن بن گیا تھا۔ کاوندراچندرودیا (Kavindra Chandrodaya) میں 69 پنڈتوں کی فہرست ملتی ہے۔[118] کاوندراچاریہ اسوقت پنڈتوں میں ممتاز تھے اور شاہجہاں اور اس کا بیٹا دارا ان سب پنڈتوں کی قدر کرتے تھے۔

کاوندر چندرا ایک مشہور ویدک عالم تھا اور سنسکرت علوم کی ہر شاخ میں خوب دستگاہ رکھتا تھا۔ وہ گوداوری کے کنارے پیدا ہوا تھا لیکن اس نے بنارس کو اپنا وطن بنایا۔ اس نے پنڈتوں کے اس وفد کی قیادت کی تھی جو شاہجہاں کے پاس بنارس اور الہ آباد کے یاتریوں پر لگائے گئے ٹیکس کے خلاف احتجاج کے لیے گیا تھا اس نے شاہجہاں کو متاثر کیا اور یہ ٹیکس مسترد کرا دیا۔ شاہجہاں نے اس کو سرود یاندان کا خطاب دیا اور دو ہزار روپیہ پنشن کے طور پر دیئے لیکن اورنگ زیب نے اس کو ختم کر دیا۔ کاوندرا کے پاس اعلیٰ مخطوطات کا ذخیرہ تھا۔ لائبریری کا کیٹلاگ مضمون وار تھا۔ یہ کیٹلاگ بنارس کے ایک مٹھ سے حاصل کیا گیا (کاوندرا چاریہ سوچی پتر) اور گائیکواڑ کے مشرقی سلسلۂ کتب میں نمبر 17 کے طور پر شائع کیا گیا۔ کتب خانہ کے مالک کی موت کے بعد لائبریری منتشر ہو گئی اس کی بہت سی قلمی کتب کو آج بھی پہچانا جا سکتا ہے جن پر درج ہے:۔

"سرود یاندان کاوندراچاریہ سرسوتی نام پستکم"۔

جب برنیر بنارس پہنچا تو کاوندرا نے اس کا یونیورسٹی لائبریری میں پرجوش خیر مقدم کیا[119]، جہاں اس نے چھ ممتاز عالموں کو مدعو کیا تھا کہ برنیر سے تبادلۂ خیالات کیا جائے اس نے لکھا ہے:۔

"اس لائبریری کے پاس خود اپنے مصنفین ہیں جن کی تصانیف فلسفہ پر اور طب پر ہیں جو منظوم ہیں ان تصانیف اور دیگر مضامین پر ان کی تصانیف سے ایک بڑا ہال بھرا ہوا ہے۔"[120]

ان کتب خانوں کا تحفظ ایک جذبہ، لگن اور محبت سے کیا گیا۔ واقعی ایسی قلمی کتابیں جمع کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ برنیر نے لکھا ہے:۔ ...." وہ کتابیں بہت ضخیم تھیں جو مجھے بنارس میں

---

118. Kavindra-candrodaya, Ed.H.D.Sharma and Mr. M.M. Patkar, Poona, 1939.

119. Bernier and Kavindiacarya Saraswati at the Mughal Court, (Studies in Indian Literary History Vol.II by P.K.Gode, Singhi Jain Series, pp.364-379).

120. Bernier, F.Travels, in the Moghul Empire (A.D.1656-1668) Eng. Ed. Constable, A., p.335

دکھائی گئیں وہ اتنی کمیاب تھیں کہ میں باوجود اصرار اور کوشش کے ایک نسخہ بھی ان سے خریدنے میں کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ غیر مسلم ان کو اتنی احتیاط سے چھپاتے ہیں کہ کہیں مسلمانوں کے ہاتھ نہ پڑ جائیں اور جلا دی جائیں جیسا کہ اس سے پہلے اکثر ہوا ہے"۔[121]

اس بیان کی تصدیق ایک دوسرے سیاح تھیونات کے بیان سے ہوتی ہے جو لکھتا ہے:۔

"ان کے پاس اپنے مذہب پر بہت سی کتابیں ہیں -
اور برہمن ان کے نگران ہیں"۔[122] -

ہندو عالموں نے اپنی زندگی میں ایسے مخطوطاتی ذخیروں کی بے حد احتیاط حفاظت کی لیکن انکے بعد یہ ذخیرے منتشر ہو گئے اور ان میں سے بعض اس دور کے بیرونی حکمرانوں کے ہاتھوں برباد ہوئے۔

---

121. Bernier, F.travels, in the Moghul Empire (A.D.1656-1668) Eng. Ed. Constable, A., p.335-36.

122. Travels of Mr. de Thevenot, Book III; ch.1, p.90

باب پنجم

جنوبی ہند اور بنگال میں ابتدائی یورپی باشندوں کے کتب خانے اور ٹیپو سلطان کی لائبریری

1 — جنوبی ہند میں ابتدائی یورپی باشندوں کے کتب خانے۔
2 — ٹیپو سلطان کی لائبریری۔
3 — بنگال میں ابتدائی یورپی باشندوں کے کتب خانے۔
4 — موجودہ لائبریری تحریک کا آغاز۔

1 — جنوبی ہند میں ابتدائی یورپی باشندوں کے کتب خانے

سترھویں صدی اور اٹھارھویں صدی میں یورپی باشندوں کے آبسنے کی وجہ سے ہندوستان میں کتب خانوں کا فروغ ہوا۔ عیسائی پادریوں نے مذہب پھیلانے کے خیال سے یہ کوشش کی کہ علوم کا فروغ ہو، انھوں نے چھاپہ خانہ کی ابتدا کی اور کتب خانے قائم کیے۔ اس طرح یہ وہ زمانہ تھا جس میں دو مختلف تہذیبوں کا میل اور قدیم و جدید کا سنگم ہوا۔ اس عہد میں دور رس نتائج کی حامل تبدیلیاں ہوئیں اور ایک نیا تہذیبی افق ابھرا جس میں قرونِ وسطیٰ کا غروب اور عہدِ حاضر کا آغاز ہوا

سولھویں صدی ہی سے عیسائی پادریوں نے جنوبی ہند میں بہت سی ہندوستانی زبانیں سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے نہ صرف مذہبیات اور فلسفہ پر کتابیں لکھیں بلکہ بہت سے اور مضامین پر

بھی قلم اٹھایا۔[3] انھوں نے جنوبی ہند کی زبانوں کی لغت مرتب کرنے اور اسے شائع کرنے میں بھی مدد دی۔[4]
انھیں کی کوششوں سے جنوبی ہند میں تامل صحافت وجود میں آئی۔[4] لیکن مدراس میں انگریزوں کی بستی میں 1661ء
تک کوئی لائبریری نہ تھی۔ کیپٹن ولیم وہائٹ فیلڈ کی بھرپور کوششوں سے مدراس میں انگریزی بستی میں پہلی
لائبریری قائم ہوئی۔ اس کے پاس کام کا زیادہ بار نہ تھا اس لیے اس نے مقامی تاجروں اور گورنمنٹ افسران
کے تعاون سے ایک رقم اکٹھا کی۔ اس رقم سے کیلکو کپڑے کی ایک گانٹھ خریدی اس کو انگلینڈ جانے والے جہاز
پر لاد دیا تاکہ کپڑا لندن میں فروخت ہو سکے۔ اس کی فروخت سے جو رقم حاصل ہوئی اس کو کتابیں خریدنے پر صرف
کیا گیا۔[5] کمپنی ریکارڈ میں دربار کی تفصیلات پر 20 فروری 1662-63ء میں مندرجہ ذیل تجویز ملتی ہے:-

> "یہ حکم دیا گیا کہ باقی رقم جو کیلکو فروخت کر کے حاصل ہو وہ 6 ریال
> (سکے جو اس وقت رائج تھے) کتابوں کی قیمت ادا کر کے بھیج دی
> جائے۔ کیلکو فورٹ مدراس میں فیکٹرس نے گورنر کے سپرد کی
> تھی کہ انگلینڈ میں فروخت کی جائے"۔[5]
>
> "وہ کپڑا 85 پاؤنڈ میں بکا۔ اس سے کتابیں خریدی گئیں
> اور باقی 23½ سنہری سکے وہائٹ فیلڈ کو واپس کر دیے گئے۔
> دوسرے سال ڈائرکٹروں نے 20 پونڈ کی کتابیں خریدیں اور
> انھیں مدراس بھیجا کہ وہ مدراس کی سرکاری لائبریری
> میں استعمال ہوں۔ اس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کی لائبریری
> مدراس فورٹ میں قائم ہوئی"۔[6]

اس کے بعد کمپنی کے ڈائرکٹر مختلف اوقات میں کمپنی کے کتب خانوں کے لیے کتابیں بھیجا کیے

---

1. M.U.Sec.A. Vol.22, No.2 1951. Jan. pp.138-139
2. I.L. Vol. 14, No.1, 1959. Jan. pp.15-22.
3. J.M.U.Sec. A.Vol.22, No.2.1951. Jan., p.137
4. Church in Madras: Rev. Frank Penny, Vol.:, pp.38-39.
   And also promotion of learning in India by early European Settlers upto 1800 A.D., Law, p.87.
5. The Library Movement; Diverse. Hands, Madras Library Association, p. 133.
6. Church in Madras; Rev Frank Penny, Vol.1, pp.38-39

سنہ 1669ء میں پانچ پونڈ کی رقم کی منظوری دی کہ مسٹر تھامس بل کے لیے کتابیں خریدی جائیں۔ یہ کتابیں بھی فورٹ سینٹ جارج لائبریری میں شامل کر دی گئیں۔ والٹر ریک نے جو ایک اور مسٹر تھامسولی پٹم میں وفات پائی اس کا ذخیرۂ کتب بھی اس لائبریری کے لیے سنہ 1671ء میں خرید لیا گیا۔ نئے چیپلین مسٹر پورٹ مین نے سنہ 1675ء میں درخواست کی کہ لائبریری میں اور کتابوں کا اضافہ کیا جائے۔ ڈائریکٹروں نے اس کی منظوری دی مگر سینٹ جارج کے گورنر سے درخواست کی کہ تمام ذخائر کتب کی ایک فہرست انھیں ارسال کر دی جائے۔

یہ درخواست ان الفاظ میں ہے :-

"جن کتب کی خرید کی خواہش مسٹر پورٹ مین نے کی تھی وہ ہم اپنی لائبریری میں ایک اضافہ کے طور پر بھیجتے ہیں لیکن ہم محسوس کرتے ہیں کہ مسٹر چیپلین نے صرف کتب کے اضافہ کے لیے کہا ہے آپ واپس آنے والے جہازوں سے ایک مکمل فہرست اپنی کتابوں کی بھیج دیں جو پچھلے ہٹم اور خلیج میں ہیں"[7]

مندرجہ بالا نوٹ سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ڈائرکٹر کو کچھ اندیشہ ہوا کہ اس کے ملازمین میں اختلاف رائے نہ پیدا ہو۔ اسے شک ہو گیا کہ چیپلین حضرات کے زیر اثر مقامی باشندوں کے خیالات اور ان کا معیار زندگی نہ بدل جائے۔ نگراں کے طور پر چیپلین کو یہ حساب رکھنا پڑتا تھا کہ کتابیں کس کس کو لائبریری سے مستعار دی گئیں نیز چندہ دینے والوں کی فہرست رکھنی پڑتی تھی۔ کتابیں لینے والوں کو مانگ پر کتابیں واپس کرنا پڑتیں اور بصورت دیگر ہر کتاب کے لیے ایک پگوڈا جرمانہ ادا کرنا ہوتا تھا"[8]

مذکورہ بالا اطلاع کی تاریخی اہمیت ہے کیونکہ ہندوستان کی سرزمین پر انگریزی کتابوں کے ورود کے آغاز کا بیان اس میں ہے۔

سنہ 1695ء میں ڈائریکٹروں نے پرتگالی طریقۂ عبادت والی کتاب کی تین سو کاپیاں بھیجیں کہ مقامی باشندوں میں تقسیم کی جائیں۔ لیکن بول چال کی پرتگالی زبان سے کتابوں کی زبان مختلف تھی اس لیے کتابیں جس مقصد کے لیے بھیجی گئی تھیں اس میں ناکام رہیں اور انھیں فورٹ سینٹ جارج کی لائبریری میں رکھ دیا گیا۔[9]

---

7. Church in Madras; Rev. Frenk Penny, Vol.1, pp.52-53
8. The Library Movement, and also Church in Madras, Vol.1 M13.
9. Promotion of Learning in India by early European Settlers unto 1800 A.D. Law, p.90

اس طرح فورٹ سینٹ جارج کی لائبریری میں کتب کے ذخیرے بڑھے۔ ایک سیاح لاکیر نے جو 1703ء میں اس لائبریری میں آیا لکھا ہے کہ صرف مذہبیات پر 440 پونڈ کی قیمت کی کتابیں ہونگی۔[10] لاکیر کی کتاب "مدراس کے حالات" چھپنے کے بعد ڈائرکٹروں کو پوری طرح لائبریری کی اہمیت معلوم ہوگئی۔ اس دوران میں کتابیں اور بڑھ گئی تھیں جو ہمدرد حضرات سے تحفے میں حاصل ہوئی تھیں اور کچھ کتابیں سوسائٹی فار پروموشن آف کرسچین نالج کی طرف سے حاصل ہوئی تھیں۔ 1714ء کے قریب ڈائرکٹروں نے فورٹ کے افسران کو مندرجہ ذیل تحریر لکھی:-

"ہمیں معلوم ہے کہ فورٹ سینٹ جارج کی لائبریری قابل توجہ ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس میں بڑی تعداد میں کتابیں ہیں بلکہ ان میں بیشتر منتخب اور قابل قدر کتب ہیں جانسن ڈالبرٹ اسکوائر اور ماسٹر رچرڈ ایلیٹ اور دوسرے لوگوں نے اپنی کتابیں تحفہ میں لائبریری کو دی ہیں اس کے علاوہ حال ہی میں اسے سوسائٹی فار پروموشن آف کرسچین نالج سے کتابیں حاصل ہوئیں۔ اس لیے ہم اس لائبریری کی نگرانی اپنے صدر اور وزیروں کے سپرد کرتے ہیں۔ ہم اپنے وزرا کو حکم دیتے ہیں کہ وہ کتابوں کو مضامین کے مطابق الگ الگ کریں اور اس کی ایک کیٹلاگ بنائیں جس کی ایک نقل لائبریری میں رہے گی ایک صدر کو بھیجی جائے گی اور ایک ہمارے پاس (انگلینڈ) آئے گی۔ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ صدر حکم جاری کرے کہ وزرا دو ملازمین کی مدد سے ہر سال کتابوں کو کیٹلاگ کی رو سے جانچیں یعنی "ویسٹری" سے چند دن پہلے جانچ کی جائے اور اس کی رپورٹ "ویسٹری" کے موقع پر پیش کریں۔ اور یہ بھی مناسب ہوگا کہ ہماری مہریں ان کتابوں پر ثبت کی جائیں۔"[11]

مذکورہ بالا نوٹ بھی تاریخی اہمیت رکھتا ہے جس سے ہمیں پہلی بار معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی قدیم ترین میں انگلش لائبریری کی کتابوں کو شمار کرنے کا انتظام تھا اور ان کی واضح شناخت کے لیے ہر کتاب پر مہر لگانے کی ہدایت بھی پہلی بار نظر آتی ہے۔

---

10. Church ir Madras, Vol. 1, r. 132.
11. Church in Madras, Vol. 1, pp. 146-151.

ڈائریکٹروں کی خواہش کے مطابق سنہ 1716ء میں انھیں ایک کیٹلاگ روانہ کیا گیا۔ ڈائریکٹر نامکمل فہرست سے مطمئن نہ ہوئے جس سے ظاہر ہوگیا کہ "لائبریری ایک بے ترتیب ڈھیر نظر آتی ہے"۔ لیکن سنہ 1719ء میں نئے چیپلن تھامس وینڈی نے ایک قابل اطمینان فہرست تیار کی گورنر اور کونسل نے اس کے صلہ میں اس کے لیے پالکی میں آنے جانے کا بھتہ منظور کیا۔[12]

مسٹر لینڈن جو فورٹ سینٹ ڈیوڈ کے چیپلن تھے یہ فورٹ بعد میں کمپنی کی ملکیت میں آگیا انکے پاس ایک ذخیرۂ کتب تھا۔ وہ سنہ 1707ء میں چلا گیا تو کمپنی نے کتابوں کے اس ذخیرہ کو خرید لیا اور فورٹ سینٹ ڈیوڈ میں ایک نئی لائبریری قائم کی۔[13] لائبریری کا نظام اچھا نہ تھا اس کی بہت سی کتابیں چوری ہوگئیں۔[14]

اس کے بعد ڈائریکٹروں کا انداز نرم ہوگیا اور وہ بغیر محصول کے کتابیں مفت تقسیم کرنے کے لیے بھیجا کرتے تھے اور سنہ 1714ء میں یہی مہربانی انھوں نے زیگن بالگ کے ساتھ کی۔[15] اور سنہ 1726ء سے سنہ 1741ء تک یہی برتاؤ سوسائٹی فار پروموشن آف کرسچین نالج کے ساتھ رہا۔[16]

مسٹر ڈاڈ ویل ہمیں بتاتے ہیں کہ مدراس میں کلائیو کے ساتھ یہ فیاضانہ برتاؤ کیا گیا کہ اسے گورنر کی اعلیٰ لائبریری میں داخل کیا گیا۔ یہ ذخیرۂ کتب فرانسیسی قبضہ سے حاصل ہوا تھا۔ سنہ 175ء میں ڈائریکٹروں سے درخواست کی گئی کہ وہ وقفہ وقفہ سے کتابیں بھیجتے رہیں لیکن درخواست منظور نہ ہوئی۔[17]

سنہ 1782ء سے سنہ 1799ء کے درمیان چیپلن نے بار بار اس سخت رویّہ کے خلاف احتجاج کیا جو کتابیں بھیجنے کے سلسلے میں رہا اور ڈائریکٹروں سے درخواست کی کہ وہ کتابیں بھیجیں اس لیے چیپلن نے حضرات والاجاہ آباد اور ارکاٹ کے سپاہیوں کی نیز ہر طرف سے کتابوں کی مانگ کو پورا کرنے کے قابل نہ تھے۔

اس وقت کے بدلے ہوئے حالات نے ڈائریکٹروں کو مجبور کردیا کہ وہ ایسا غیر ہمدردانہ رویّہ اختیار کریں۔

کتابوں کی اس بڑھتی ہوئی مانگ کے پیش نظر جنوبی ہند کے اہم عبادت خانوں نے خود اپنے کتب خانے

---

12. Church in Madras, Vol. I, pp.146-151.

13. Church in Madras, Vol. I, p.126.

14. Church in Madras, Vol. I, pp.146-147.

15. Church in Madras, Vol. I, p.187.

16. Church in Madras, Vol. I, p.190.

17. Nabobs of Madras, 1926, p.188.

قائم کیے۔

انگریز سرجن جان فرائر جو 1675ء میں کرسمس کے موقع پر گوا پہنچا بیان کرتا ہے:۔
"عیسائی پادریوں کے پاس عبادت خانے ہیں اور ان میں سب سے
بڑا سینٹ پال میں ہے جہاں اس کی ایک لائبریری ہے۔ ایک
اسپتال ہے اور ایک دوا فروش کی دکان جہاں سب دوائیں ملتی ہیں" [18]
ٹیپو سلطان کی شکست کے بعد سیاسی حالت بدلی اور کمپنی کے ڈائرکٹروں کے برتاؤ میں وہی نرمی اور لچک پھر آگئی اور انھوں نے وقتاً فوقتاً کتابیں بھیجنا شروع کر دیں [19]

2۔ ٹیپو سلطان کی لائبریری۔

1782ء میں اپنے باپ حیدر علی کی وفات کے بعد ٹیپو سلطان نے میسور کی عنانِ حکومت سنبھالی۔

سلطان علوم کا عظیم سرپرست تھا اس نے ایک یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی جس میں بہت سے شعبے اور ایک عمدہ لائبریری تھی۔ ٹیپو کتابوں کا دلدادہ تھا اس کو کتابیں جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔ "سری رنگا پٹم کے پہلے محاصرہ کے بعد وہ ہمیشہ سخت دری پر سویا کرتا اور دورانِ طعام مذہبی کتب پڑھوا کر سنتا تھا" [20]
محل کے اندر ٹیپو کی ذاتی لائبریری تھی۔ "محل کی لائبریری میں قرآن کا ایک نسخہ ہے جو پہلے اورنگزیب کی ملکیت تھا اس کی قیمت نو ہزار روپیہ ہے اور یہ خطِ نسخ میں تحریر ہے اور اس پر عمدہ نقش و نگار ہیں" [21]۔
قرآن کا یہ مذکورہ نسخہ اب ونڈسر کاسل کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

1799ء میں ٹیپو سلطان کی بہادرانہ موت کے بعد سری رنگا پٹم برطانیہ کے قبضہ میں آگیا۔
انھوں نے شاہی خزانہ اور بیش بہا لائبریری پر پورا قبضہ کر لیا [22]۔ شاہی لائبریری کی قابل قدر قلمی کتب

---

18. Mandelslo's Travels in Western India (1638-39); M.S. Commissariat, Appendix, p. 103.

19. Promotion of Learning in India by Early European Settlers upto 1800 A.D., Law, pp. 94-95.

20. Haider Ali and Tipu Sultan (Rulers of India); L.B. Bowring, p. 224.

21. Haider Ali and Tipu Sultan (Rulers of India); L.B. Bowring, p. 224.

22. I.C. Vol. XX, p.3

ایک عرصہ تک لاپرواہی کا شکار رہیں۔ ان میں سے کچھ لندن منتقل ہوگئیں کچھ فورٹ ولیم کالج کی لائبریری میں اور کچھ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ میں بھیج دی گئیں۔ اس کی لائبریری کے کاغذات میں ایک رجسٹر ملا ہے جس میں ٹیپو کے خواب درج تھے[23] میجر اسٹوارٹ نے 1809ء میں باقی کتابوں کا ایک کیٹلاگ تیار کیا جس کو کیمبرج یونیورسٹی نے شائع کر دیا۔ اس لائبریری کے مضامین کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

قرآن: ___ 44 نسخے	تفاسیر: ___ 41 کتب	دعائیں: ___ 35 کتب
حدیث: ___ 46 کتب	دینیات: ___ 46 کتب	تصوف: ___ 115 کتب
اخلاقیات: ___ 24 کتب	فقہ: ___ 95 کتب	فنون و سائنس: 19 کتب
فلسفہ: ___ 62 کتب	لسانیات: ___ 45 کتب	لغات: ___ 29 کتب
ہندی و دکنی شاعری: 23 کتب	دکنی نثر: ___ 4 کتب	ترکی نثر: ___ 2 کتب
نقشے: ___ 18 کتب		

ان میں سے کچھ کتابیں شاہان بیجاپور و گولکنڈہ کی ملکیت کی تھیں لیکن ان میں سے زیادہ تر چتور، مادانور اور کڈپا سے لوٹی گئی تھیں[24]

میجر اسٹوارٹ نے اپنی تفصیلی کیٹلاگ میں لکھا ہے:۔

"لائبریری میں دو ہزار قلمی کتابیں عربی، فارسی اور ہندی زبانوں میں اسلامی ادب کی مختلف شاخوں پر موجود تھیں۔ دینیات یا تصوف ان کا (سلطان کا) محبوب مضمون تھا سلطان مصنف بننے کا شوق رکھتا تھا اگرچہ ان کی کوئی مکمل تصنیف دستیاب نہیں ہو سکی لیکن مختلف مضامین پر 45 کتابیں تصنیف و ترجمہ اُن ہی کی سرپرستی و معاونت میں ہوئیں۔"

اس طرح سلطان نے اپنی لائبریری کے لیے ترجمہ و تصنیفات کی سرپرستی کی

سلطان کو اپنے محل کی لائبریری کے لیے عمدہ چمڑے کی مجلد کتابیں پسند تھیں اس لیے سرنگاپٹم چمڑے کی جلد سازی کا مرکز بنا۔ سب کتابیں جن کی دوبارہ جلد باندھی گئی اُن پر "اللہ" "محمد" ۔ فاطمہ، حسین رض

---

23. Haidar Al: and Tipu Sultan, p. 226.

24. Haidar Ali and Tipu Sultan, p. 202 fn.

اور حسینؓ کے نام کی مہریں صفحہ کے وسط میں ملتی ہیں اور چاروں خلفاء کے نام کتابوں کے چاروں کونوں پر اور نیچے "اللہ کافی" ملتا ہے۔ چند کتابوں پر ٹیپو سلطان کی ذاتی مہر ثبت ہوئی ہے"۔[25]

3- بنگال کے ابتدائی یورپی باشندوں کے کتب خانے۔

بنگال کے ابتدائی یورپی باشندوں کے کتب خانوں کی تاریخ مرتب کرنا مشکل ہے کیونکہ 1737ء کے دریائی طوفان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاغذات تلف ہو گئے اور کچھ 1756ء میں جب سراج الدولہ نے کلکتہ پر حملہ کیا تو مفقود ہو گئے۔

لیکن مسٹر ہائڈ (Hyde) نے اپنی کتاب "پیرشس آف بنگال" میں صاف لکھا ہے کہ 1700ء میں وہاں ایک لائبریری تھی۔ 16 جون 1709ء میں مسٹر بنجامن ایڈمس (Benjamin Adams) چیپلین آف بے ہو کر کلکتہ آئے اور آنے کے بعد لائبریری میں اضافہ کیا۔ یہ بات نہایت دلچسپ اور تاریخی اعتبار سے اہم ہے کہ سوسائٹی فار پروموشن آف کرسچین نالج نے 1709ء میں ایک اجرائی لائبریری کلکتہ میں بھیجی۔ اس سوسائٹی کے گورنروں نے اپنی امداد جاری رکھی اور برائر کلف (Briarcliffe) کو کتابوں کے پارسل بھیجتے رہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عام اجازت تھی کہ ان کے جہازوں میں کتابوں کے یہ پارسل مفت بھیجے جاسکتے تھے۔[26]

اس طرح فورٹ ولیم کالج لائبریری کا آغاز ہوا۔ 24 نومبر 1800ء بروز دوشنبہ حقیقت میں کالج کھلا اور عربی، فارسی اور ہندوستانی زبانوں میں لیکچر شروع ہوئے لیکن اپنی ابتدائی منزل میں کالج کو اپنا وجود برقرار رکھنے میں سخت جدوجہد کرنا پڑی۔

جگہ کی کمی اور دوسری وجوہات سے لارڈ ولیزلی نے گارڈن ریچ کا علاقہ منتخب کیا اور کالج لائبریری کے فروغ کے لیے مندرجہ ذیل مشورے دیئے:۔

> "گارڈن ریچ میں نئی عمارت بننے میں کافی وقت لگے گا اس دوران ارادہ یہ ہے کہ رائٹرس بلڈنگ میں بدستور قیام رہے اور قریب ہی فاضل جگہ بھی عارضی طور سے طلبہ اور کالج کے افسران کے قیام کے لیے، لائبریری، ڈائننگ ہال، لیکچر روم اور دیگر مقاصد کے لیے کرایہ پر لے لی جائے۔ یہ ضروری ہے کہ لائبریری

---

25. St..wart's Catalogue of Tipu Sultan's Library, Preface.
26. Promotion of Learning in India by Early European Settlers upto 1800 A.D., Law, p.98.

کے لیے کافی کتابیں خریدی جائیں گورنر جنرل کی نگرانی میں کفایت شعاری سے
یہ کام ھندوستان میں ھوگا۔ کتابوں کی فہرستیں پہلی فرصت میں اس
مقصد سے انگلستان بھیجی جائیں گی کہ یورپ میں جو کتابیں خریدی جانا چاہیں
وہ وھاں لے لی جائیں۔ گورنر جنرل کو اس میں شک نہیں کہ کورٹ آف
ڈائرکٹرس اس کام کے لیے فیاضانہ مالی امداد دے گا۔ ٹیپو سلطان کی لائبریری
کا وہ حصہ جو فوج نے کورٹ آف ڈائرکٹرس کو بھیجا تھا بنگال آگیا ہے گورنر
جنرل کا یہ منشا ھے کہ اس ذخیرہ کے مشرقی مخطوطات فورٹ ولیم کالج کی لائبریری
میں رھیں اور یہ سب مخطوطے اس وقت تک وھاں رھیں جب تک
اس سلسلہ میں کورٹ سے کوئی حکم نہ آجائے اور وہ اس کی فہرست پہلی فرصت
میں روانہ کریں گے۔ یہ بالکل واضح ھے کہ نئے ادارہ کے لیے یہ قلمی کتابیں بہت
مفید ثابت ھونگی اور بہ نسبت اس کے کہ اس ذخیرہ کو لندن میں رکھا
جائے اگر یہ فورٹ ولیم کالج کی لائبریری میں رھیں گی تو ان سے بے اندازہ
عوامی فائدہ حاصل ھو سکے گا۔ ایسی قلمی کتابیں جو نئی معلومات فراہم کرنے
کی حیثیت سے قابل قدر سمجھی جائیں انھیں جلد ھی انگلستان بھیجا جائے۔''
ہر صاحب علم ان خیالات سے ہمدردی ظاہر کرے گا لیکن افسوس ہے کہ لارڈ
ویلزلی کے ارادوں کو کورٹ آف ڈائرکٹرز نے جن پر وہ اعتماد رکھتے تھے نامنظور کردیا
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بے مثال ذخیرہ بجائے اس کے کہ ۴ مئی 1799ء کی فتح کی یادگار کے طور پر محفوظ رکھا جاتا۔
ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بکھر گیا۔ اگر یہ مناسب نہ تھا کہ یہ ذخیرہ فورٹ ولیم کالج کی لائبریری میں رہے تو یقیناً
کسی ایک لائبریری میں رکھا جا سکتا تھا مثلاً برٹش میوزیم لائبریری نہ کہ کئی لائبریریوں میں ٹکڑے کرکے رکھا جائے[27]
لیکن کسی نہ کسی وجہ سے کورٹ آف ڈائرکٹرس نے اس مشورہ کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کالج
کا وجود خطرہ میں پڑ گیا۔
کالج کی لائبریری ہر ذمہ دار شخص کے استفادہ کے لیے کھلی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1824ء میں
لائبریری کی 2,844 کتابیں کھو گئیں جن کی قیمت 28,355 روپے تھی۔ ان میں سے 875 کتابوں کی قیمت وصول

27. Renga' Past and Present, Vol. VII, 1911, pp. 12-13.

کرلی گئی ۹۰۴ کتابوں کی قیمت معاف کردی گئی لائبریری کے سکریٹری کی یہ کوشش تھی کہ آئندہ اس قسم کا نقصان نہ ہو۔

1825ء میں کالج کونسل کے سامنے پھر یہ مسئلہ آیا کہ لائبریری کو عوام کے لیے کھولا جائے یا نہیں کیپٹن رڈل (Ruddell) نے جو لائبریری کے سکریٹری تھے اپنے سابق تجربات کی بنا پر اس کی سخت مخالفت کی۔ اور ایک کیٹلاگ تیار کیا گیا 12 ستمبر 1825ء کو کتابوں کا ایک ذخیرہ ایشیاٹک سوسائٹی کو پیش کیا گیا۔ 22 نومبر 1825ء کو کیپٹن رڈل نے اجازت چاہی کہ وہ فوج میں واپس چلا جائے۔ گورنمنٹ نے اس کی اجازت نہیں دی۔

1827ء میں لفٹیننٹ ٹوڈ (Lt. Todd) سے کہا گیا کہ وہ لائبریری کی ذمہ داری سنبھالے لیکن اس نے یہ پیشکش قبول نہ کی اس سے قبل مسٹر ہاجز (Hodgson) نے جو نیپال ریذیڈنسی سے متعلق تھے لائبریری کے لیے 127 مخطوطات جمع کیے اور لفٹیننٹ جے۔ اے۔ ایٹن (J.A. Ayton) سے ان کا کیٹلاگ بنانے کے لئے کہا گیا اس معاملہ میں کیپٹن پرائس (Capt. Price) اور ڈاکٹر کیری (Dr. Carey) کا مشورہ بھی طلب کیا گیا۔ لیکن دونوں نے مسٹر ایٹن کو اس کام کا اہل نہ سمجھا اور پیشکش واپس لے لی گئی۔

4 فروری 1828ء کو مشرقی کتابوں کا ایک مجموعہ کوپن ہیگن یونیورسٹی کو بھیجا گیا 6 فروری کو چار جلدوں میں ایک مکمل کیٹلاگ عربی فارسی اور ہندوستانی کتابوں کا جو کالج لائبریری میں موجود تھیں حکومت کو پیش کیا گیا۔

فروری 1829ء کو کالج کونسل کے سکریٹری نے حکومت سے درخواست کی کہ تین ہزار روپے ان نیپالی اور تبتی مخطوطات کے لیے منظور کیے جائیں جنہیں مسٹر ہاجسن نے جمع کیا تھا اسی موقع پر انہوں نے یہ سفارش بھی کی کہ آئندہ کوئی مخطوطہ نہ خریدا جائے۔ جولائی 1829ء میں یہ طے پایا کہ مسٹر ہاجسن کا ذخیرۂ کتب مخطوطات جو وسط ایشیائی زبان میں تھا ایشیاٹک سوسائٹی کو منتقل کر دیا جائے۔ اسی سال کالج لائبریری کے سکریٹری مسٹر رڈل نے سفارش کی کہ فاضل کتابیں بیچ دی جائیں۔ حکومت نے سفارش کو منظور کر لیا اور طے کیا کہ فاضل کتابوں کی فروخت کا انتظام ٹلوہ اینڈ کمپنی (Tulloh & Co.) کلکتہ کرے۔

1833ء میں کیپٹن ادنسلے کو کالج کا سکریٹری اور لائبریرین مقرر کیا گیا۔ اس زمانہ میں لائبریری میں 5224 یوروپی کتابیں۔ 11718 مشرقی علوم کی مطبوعہ اور 2534 مخطوطہ کتابیں تھیں۔ ان میں بہت سی قلمی کتابیں خوب مرقع تھیں۔ اس ذخیرہ کی بابت کیپٹن ادنسلے (Cap. Ousely) تحریر کرتے ہیں:

"اس لائبریری کا مشرقی ذخیرہ اتنا بیش قیمت ہے کہ شاید تمام ایشیا میں اس کی نظیر نہ مل سکے۔ یوروپی ذخیرہ کتب زیادہ وسیع نہیں ہے لیکن اس میں تاریخ

سفرنامے، قانون، اخلاقیات، علم الہیات، مابعد الطبیعیات، قواعد، لغات
یونانی و لاطینی قدیم کتب اور موجودہ یورپی زبانوں بالخصوص فرانسیسی، اطالوی
اور ڈینش زبانوں میں منتخب کتب ہیں"۔

لائبریری میں جگہ کی کمی کی وجہ سے کالج لائبریری کی کتابوں کا ایشیاٹک سوسائٹی میں منتقلی کا مسئلہ زیر غور تھا۔ ایشیاٹک سوسائٹی میں بھی جگہ کافی نہ تھی۔ اس صورت حال نے کیپٹن او نسلے کا مزاج برہم کر دیا۔ منتقلی کی تجویز کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں "اس عمارت میں کتابیں رکھنے کے لیے صرف راہداریاں اور حجرے ہی نکل سکتے ہیں۔ ان میں کالج لائبریری کی آدھی کتابیں بھی نہیں سما سکتیں۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی مجھے یقین ہے کہ حضور والا (کونسل صدر) یہ پسند نہ کریں گے کہ ایسے بیش بہا خزانہ کو جو قومی لائبریری کی بنیاد بن سکتا ہو ایشیاٹک سوسائٹی کے حجروں میں اور راہداریوں میں ڈال دیا جائے۔ اس مسئلہ کو تو یوں دیکھنا چاہیئے کہ کمپنی کے چالیس پچاس ہزار پونڈ بچانے کے لیے اتنے بڑے ذخیرۂ کتب کا بربادی کا شکار ہو جانا زیادہ مفید ہو سکتا ہے یا تین چار سو روپے ماہوار پر ایک مکان کرایہ پر لے کر اس میں خزانے کو محفوظ کر لینا"[26]

اس تحریر سے ثابت ہوا کہ کیپٹن او نسلے کو ذخیرۂ کتب کی اہمیت کا صحیح اندازہ تھا اسی لیے اس اسکیم کی سخت مخالفت کی کہ اسے ایشیاٹک سوسائٹی میں منتقل کیا جائے لیکن افسران نے اس کے دلائل کو نظر انداز کر دیا اس کے علاوہ ایک اور تجویز تھی کہ کالج کی یورپی کتابوں کو پبلک لائبریری میں منتقل کر دیا جائے جو اس وقت کلکتہ میں قائم کی جا رہی تھی۔

31 اکتوبر 1835ء کو ٹاؤن ہال کلکتہ میں ایک جلسہ ہوا جس میں پبلک لائبریری کا قیام عمل میں آیا
نومبر کو مسٹر اسٹاکلر (Mr. Stocqueler) نے جو کلکتہ پبلک لائبریری کے اعزازی سکریٹری تھے، گورنمنٹ سے درخواست کی کہ سیکریٹری فورٹ ولیم کالج کو ضروری ہدایات دی جائیں کہ وہ یورپی کتابیں پبلک لائبریری کو بھیج دیں اور یہ بھی اطلاع دی کہ مسٹر اسٹرانگ کے نیچے والا کشادہ حصہ جو اسپلےنیڈ رو پر واقع ہے نئی کتابوں کے لیے جو عطیہ میں حاصل ہوں یا خریدی جائیں منتخب کیا گیا ہے"

پبلک لائبریری کے محافظین نے درخواست کی کہ جب تک ان کے اپنے بک کیس نہ آجائیں وہ بھی انھیں مستعار دیئے جائیں۔ ان دونوں درخواستوں کو حکومت نے مندرجہ ذیل شرائط کیساتھ منظور کر لیا۔

1۔ لائبریری سوسائٹی کا مستقل قیام۔

---

26. Bengal Fast and Present, Vol. XXII. 1921, p.143.

2۔ محترم کورٹ آف ڈائریکٹرس کی کتابوں کی منتقلی کے بارے میں منظوری۔

3۔ کتابوں کی ٹھیک دیکھ بھال اور حفاظت۔

24 فروری 1836ء کو سکریٹری گورنمنٹ نے لکھا کہ گورنر بنگال نے فیصلہ کیا ہے کہ کالج لائبریری کا مشرقی ذخیرۂ کتب ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کو اس شرط پر دے دیا جائے کہ وہ ان کتابوں کے لیے مناسب جگہ نکالے اور عوام کے مطالعہ اور حوالہ کے لیے ان کو دیکھنے کا انتظام کرے جیسا کہ سکریٹری سوسائٹی کے خط میں تجویز کیا گیا ہے۔

27 فروری 1836ء کو یوروپی کتابیں منتقل کر دی گئیں اور کاغذاتِ منتقلی پر ڈبلیو۔ایچ۔اسٹیسی (W. H. Stacy) لائبریرین۔ ڈبلیو۔پی۔گرانٹ (W.P. Grant)، اے۔آر۔جیکسن (A.R. Jackson) اور جان بیل (John Bell) کیوریٹرس کے دستخط تھے۔

14 اگست 1839ء کو محترم کورٹ آف ڈائریکٹرس نے کتب و مخطوطات کی منتقلی کی منظوری دے دی اس طرح فورٹ ولیم کالج لائبریری کی داستان ختم ہوئی۔

1784ء میں سر ولیم جونس نے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی بنیاد ڈالی تھی وہ ایک ممتاز محقق اور زبان داں تھے یہ 1783ء میں سابق سپریم کورٹ فورٹ ولیم بنگال میں پیوسنی جج (Puisne Judge) بن کر آئے تھے۔ سوسائٹی کے قیام کا مقصد تھا کہ "ایشیا کے قدیم علوم، تاریخ، فن، سائنس اور ادب کی معلومات حاصل کی جائیں"۔ اس کے ابتدائی دور میں سوسائٹی کی کوئی اپنی عمارت نہ تھی اور اس کے جلسے سپریم کورٹ کے گرینڈ جوری روم (Grand Jury Room) میں ہوا کرتے تھے۔ عدالت کی عمارت ہمیشہ خالی نہ ملتی۔ سوسائٹی کے پاس کتابیں، کاغذات اور مختلف اقسام کے نمونے جمع ہوتے جا رہے تھے اس لیے ضرورت محسوس کی گئی کہ سوسائٹی کی الگ عمارت ہو۔ 1805ء میں گورنمنٹ نے پارک اسٹریٹ کلکتہ میں بطور عطیہ مفت زمین دی۔ اور 1808ء میں کیپٹن لاک نے جو بنگال انجنیرس سے متعلق تھے نقشہ کے مطابق سوسائٹی کی عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچائی۔ عمارت بنانے کا ایک خاص مقصد یہ بھی تھا کہ لائبریری کے ساتھ میوزیم کیلیے بھی جگہ ہو جائے۔

لائبریری کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ پہلے ممبروں نے کتابوں کے عطیات پیش کیے اس طرح لائبریری کی کتابوں کا ایک بنیادی ذخیرہ بن گیا پھر ہر سال کی مالی امداد اور نئی کتابوں کی خرید کے لیے مخصوص امداد سے کتابیں بڑھتی رہیں۔

1817ء میں مسٹر ایچ۔ٹی کول برک (H. T. Cole Brooke) کو لندن میں ایجنٹ مقرر کیا گیا

کہ سوسائٹی کے لیے کتابیں منتخب کریں اور خریدیں۔ مسٹر ہوم کا مختصر مگر بیش قیمت مجموعۂ کتب بطور عطیہ حاصل ہوا۔ اور جب حکومت نے فورٹ ولیم کالج کی لائبریری کو ختم کیا تو ایک بڑا ذخیرۂ کتب حاصل ہو گیا۔

مشرقی کتابیں جنھیں لائبریری میں سب سے پہلے درج کیا گیا وہ سری رنگا پٹم پرائز کمیٹی کی طرف سے 3 فروری 1803ء میں حاصل ہوئیں۔ اس ذخیرے میں قرآن، گلستان اور بادشاہ نامہ وغیرہ کے قدیم اور نایاب و مرصع مخطوطہ نسخے شامل تھے جو ٹیپو سلطان کے محل سے لوٹ میں حاصل ہوئے تھے۔ ایک بڑی تعداد سنسکرت، عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کی جو فورٹ ولیم کالج لائبریری میں گالڈون (Guldwin) کیری (Carey) گل کرائسٹ (Gilchrist) اور دوسرے ممتاز محققین نے جمع کی تھیں سوسائٹی کی نگرانی میں دے دی گئی۔ کورٹ آف ڈائریکٹرس کی منظوری سے قبل گورنمنٹ سوسائٹی کے خرچ کیلئے 78 روپیہ ماہوار ادا کرتی رہی۔ 1870ء میں منظوری حاصل ہوئی اور ماہانہ گرانٹ ختم کر دی گئی کتابیں اور مخطوطے سوسائٹی کے ملکیت بن گئے مگر اس کے لیے دو شرطیں رکھی گئیں:

(1) کتابوں کی نگہداشت و حفاظت (2) کتابوں کا عوام کے استفادہ کے لیے مناسب اوقات میں مہیا و موجود رہنا۔

مخطوطات کا کیٹلاگ مسٹر پرنسپ (Prinsep) سکریٹری کی رہنمائی میں کیا گیا۔ فارسی کیٹلاگ پر 1837ء درج ہے۔ اور اس میں جملہ 2742 کتابوں کے نام ہیں جن میں 1013 عربی کی، 1418 فارسی کی اور 311 اردو کی ہیں۔ سنسکرت کیٹلاگ 1838ء میں شائع ہوا جس میں 1800 کتابوں کے نام ہیں۔ کھجور کی پتیوں پر لکھی ہوئی قلمی کتابیں برمی، سیامی، جاوا اور لنکا کی زبانوں میں تھیں ان کے 125 بنڈل تھے لیکن ان کی کسی قسم کی فہرست نہیں بنائی گئی۔ سوسائٹی کے پاس چینی اور تبتی زبانوں کے لکڑی کے چھاپے بھی کافی تعداد میں تھے۔

اس طرح یہ لائبریری مشرقی علوم کی تحقیق کا اہم مرکز بن گئی تھی اگر سوسائٹی اور کچھ بھی نہ کرتی تو بھی یہ ذخیرۂ کتب و مخطوطات اس لائبریری کو بے مثال بنانے کے لیے کافی تھا۔

ممبروں کو لائبریری سے فائدہ اٹھانے میں سہولت دینے کے لیے جنوری 1920ء میں دستور العمل بنایا گیا۔ لائبریری کا پہلا کیٹلاگ 1833ء میں شائع ہوا جس میں ایک ہزار کتابوں کے نام تھے۔ جب فورٹ ولیم کالج کی لائبریری اس میں شامل کر لی گئی تو یورپی کتابوں کا ایک کیٹلاگ ڈاکٹر ای۔ راک (E. Rock) نے تیار کیا۔ جس میں جملہ 4315 کتابیں تھیں۔

* *

4۔ موجودہ لائبریری تحریک کا آغاز

انیسویں صدی کے نصف اوّل کو موجودہ لائبریری تحریک کا آغاز کہا جا سکتا ہے جبکہ یورپی باشندوں کے تعاون سے کلکتہ مدراس اور بمبئی میں عوامی کتب خانے (Public Libraries) قائم کیے گئے۔

1808ء ہندوستان کی پبلک لائبریری کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا مالک ہے۔ اسی سال بمبئی گورنمنٹ نے ایک تجویز رکھی تھی کہ کچھ لائبریریوں کو وہ کتابیں مفت دی جائیں جو ترویج ادب فنڈ سے (Funds for encouragement of Literature) سے شائع کی جائیں۔

کلکتہ پبلک لائبریری کے بانی مسٹر جے۔ ایچ اسٹاکیولر (J.H. Stocqueler) تھے جو "انگلش مین" (Englishman) کے مدیر بھی تھے۔ بمبئی پبلک لائبریری سے متاثر ہوکر مسٹر اسٹاکیولر نے کلکتہ پبلک لائبریری کے قیام کے لیے بڑی جدوجہد کی۔ ۲۱ر اکتوبر 1835ء کو کلکتہ کے شہریوں کا ایک جلسہ ٹاؤن ہال میں منعقد کیا گیا جس میں اتفاق رائے سے مندرجہ ذیل تجویز پاس ہوئی:۔

"یہ ضروری ہے کہ کلکتہ میں ایک پبلک لائبریری قائم کی جائے جو حوالہ جاتی خدمات بھی انجام دے اور کتابیں مستعار بھی دے۔ یہ لائبریری بلا امتیاز سب کے لیے ہو اور ہر شعبہ علم پر وافر کتابیں ہوں تاکہ قوم کی ضروریات پوری ہو سکیں۔"

اس مقصد کی تکمیل کے لیے 24 ممبروں کی ایک کمیٹی بنائی گئی، 22 یورپی ممبر اور 2 بنگالی۔ ان میں قابل ذکر رسک کرشن ملک ایڈیٹر "گیان شان"، رام سوامی دت سکریٹری ہندو کالج، سر جان پیٹر گرانٹ، کیپٹن ڈی۔ ایل۔ رچرڈسن پروفیسر ہندو کالج، جے سی۔ مارش مین ایڈیٹر سماچار درپن، سر ایڈورڈ رائن، ڈبلیو۔ ایچ میکناگٹن، سی۔ ڈبلیو۔ اسمتھ، کرنل ڈنلپ، محترم ایچ فشر، مسٹر ڈکنس، ڈاکٹر رینکن، محترم جیمس چارلس جان بیل، ڈبلیو۔ پی گرانٹ، محترم ڈاکٹر سینٹ لیجر اور جیمس کڈ ہیں۔

فنڈ جمع کرنے کی غرض سے طے کیا گیا کہ اگر کوئی شخص 300 روپے چندہ یکمشت یا تین قسطوں میں ادا کرے تو اسے مالکان تصور کیا جائے گا۔ اس فیصلہ کی تعمیل میں شہزادہ دوارکا ناتھ ٹیگور نے 300 روپے یکمشت جمع کیے اور وہ لائبریری کے پہلے مالک بنے۔ اس کے علاوہ تین قسم کے اور ممبر تھے جو فیس داخلہ اور چندہ ادا کرکے ممبری حاصل کر سکتے تھے۔

اس طرح لائبریری کا بنیادی سرمایہ مالکان اور دوسرے حضرات کے عطیوں کے ذریعہ حاصل

پینتالیس ہزار روپے تھا نیز فورٹ ولیم کالج کی وہ چار ہزار چھ سو چھیتر کتابیں تھیں جو ڈاکٹر ایف پی۔ اسٹرانگ سول سرجن چوبیس پرگنہ کے یہاں 1835ء میں منتقل کی گئی۔ 21 مارچ 1836ء کو لائبریری عوام کے لیے کھول دی گئی۔ لائبریرین مسٹر اسٹکی (Stacey) اور اسسٹنٹ لائبریرین شری پیارے چند مترا مقرر ہوئے۔ لائبریری کی ایک گورننگ باڈی بنائی گئی جس کے سات ممبر تھے اور جس کے سکریٹری اسٹوکیولر (Stocqueller) تھے۔ 1841ء میں عارضی طور سے لائبریری کو فورٹ ولیم میں منتقل کیا گیا آخر کار 1844ء میں ایک لاکھ 64 ہزار روپے ادا کرکے لائبریری کو مٹکاف ہاؤس کی پہلی منزل میں رکھا گیا۔

1845ء میں شری پیارے چند مترا نے لائبریری کی مکمل ذمہ داری سنبھالی اور اس کو تہذیبی سرگرمیوں کا حقیقی مرکز بنا دیا۔ سربراہ کمیٹی تین نگراں ممبروں پر مشتمل تھی جس کا سکریٹری لائبریرین بحیثیت عہدہ ہوتا تھا۔ مجلس عمومی کے علاوہ دو اور کمیٹیاں تھیں یعنی ہاؤس کمیٹی جس کا کام عمارت کی دیکھ بھال تھا دوسری انتخابی کمیٹی تھی جس کے سپرد کتابوں اور رسالوں کا انتخاب تھا۔ ۱۲ مئی 1873ء کو ممبران لائبریری کا ایک جلسہ ہوا جس نے مالکان کی کمیٹی کو کالعدم قرار دے دیا اور چودہ ممبران پر مشتمل ایک کونسل کا انتخاب کیا جس کے ممبران مالکان میں سے بھی تھے اور عام چندہ دہندگان میں سے بھی۔ 1877ء میں مہاراجہ نریندر کرشن کونسل کے پہلے ہندوستانی صدر بنے اور ڈاکٹر مہندر لال نائب صدر۔

لائبریری کی آمدنی کے ذرائع جو عطیات اور چندوں میں محدود تھے کافی نہ تھے اس لیے 1880ء میں لائبریری کے ذمہ داروں نے حکومت سے 200 روپیہ ماہوار مالی امداد کی درخواست کی۔ لیکن لائبریری چونکہ مکمل طور پر پبلک یا عوامی نہ تھی اس لیے یہ درخواست مسترد کر دی گئی۔ 1885ء میں مسٹر میکنزی نے ایک منصوبہ پیش کیا کہ لائبریری کو شہر کی عوامی لائبریری میں تبدیل کر دیا جائے جس میں کوئی فیس نہ لی جاتی ہو۔ اس منصوبہ کو لائبریری کونسل نے منظور کر دیا اور حکومت نے اس فیصلہ سے اتفاق کرتے ہوئے لائبریری کو پہلے سال پانچ ہزار کی رقم امداد میں دی۔

20 اگست 1890ء میں شری ہرچندر پال کو اس ادارے کا لائبریرین مقرر کیا گیا تاکہ وہ اس کے کردار کو نیا انداز بخشیں۔ ان کی تنخواہ کی شرح 100-10-200 روپیہ مقرر کی گئی۔ شری پال نے مسٹر اے جی بیبرج کی ہدایت پر جو مشہور تاریخ داں تھے لائبریری کا کیٹلاگ بنانا شروع کیا۔ پھر بھی میونسپل حکام کی سرد مہری اور عدم تعاون کی وجہ سے لائبریری کی حالت سدھر نہ سکی بلکہ اور بگڑ گئی۔ شری پال نے ڈیڑھ سال کے بعد استعفیٰ دے دیا۔ شری رادھا رمن مترا ان کی جگہ لائبریرین مقرر ہوئے۔

دم توڑتے ہوئے اس ادارے کو بچانے کے لیے سنہ 1899ء میں لارڈ کرزن نے مالیکان کے حصے خرید لیے ۔ سنہ 1902ء میں امپریل لائبریری ایکٹ پاس ہوا اور جنوری سنہ 1903ء میں کلکتہ پبلک لائبریری کو سیکریٹریٹ لائبریری میں ملا دیا گیا اور یہ دونوں ملکر ایک قومی ادارہ بن گیا ۔

اس نوزائیدہ لائبریری سے جو توقعات قائم کی گئی تھیں ، انکو گزٹ آف انڈیا میں اسس طرح بیان کیا گیا تھا ۔

یہ سوال کہ ہندوستان میں ایک ایسی امپریل لائبریری قائم کی جائے جہاں عوام بھی جا سکیں گورنر جنرل کی توجہ کا مرکز عرصہ سے بنا ہوا تھا ۔ وہ اس بات کو بھی دیکھ رہے تھے کہ اس ملک میں طالب علموں کے لیے تحقیق کا کام کرنے کی سہولتیں بے حد کم ہیں ۔ کلکتہ کی امپریل لائبریری جو ابھی چند سال پہلے ہوم سکریٹریٹ کی متعدد لائبریریوں کو ملا کر بنائی گئی ہے ان مقاصد کے لیے بہت کار آمد ثابت ہوئی اسی وجہ سے لائبریری سے فائدہ اٹھانے والے حضرات کی تعداد میں کافی اضافہ ہوگیا ہے ۔ یہ سب باتیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ اس لائبریری کو امپریل لائبریری کا نام جو دیا گیا ہے وہ صحیح ہے ۔ اب سکریٹری آف اسٹیٹ کی منظوری سے گورنر جنرل نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کلکتہ میں اسس لائبریری کو باقاعدہ بنا دیا جائے ۔ اس غرض سے ایک موزوں عمارت بھی حاصل کر لی گئی ہے اور کتابوں کے رکھنے کے لیے کلکتہ پبلک لائبریری کی الماریاں مالکان سے خرید لی گئی ہیں ۔ کلکتہ پبلک لائبریری اب اس کے بانیان کے مقاصد کی تکمیل کے لیے موزوں نہیں رہی تھی ۔

انتظامات کا یہ نقشہ امپریل لائبریری ایکٹ سنہ 1902ء کے ذریعہ باضابطہ قرار پایا موجودہ ..
امپریل لائبریری اس نئے ادارہ کی بنیاد بنے گی جس میں عوام اور خواص کے لیے مطالعہ کے بڑے ہال ہوں گے جیسے برٹش میوزیم اور بوڈلین لائبریری میں ہیں ۔ ارادہ ہے کہ اس لائبریری میں حوالہ جاتی کام کی سہولت ہو ۔ طلبا کے لیے مطالعہ کا انتظام ہو اور یہ لائبریری ہندوستان کے مستقبل کے مورخوں کے لیے مواد فراہم کرے یہاں حتی الامکان ہر وہ تصنیف ہوگی اور پڑھی جا سکے گی جو ہندوستان کی تاریخ کے موضوع پر لکھی گئی ہو ۔

ہندوستان کے افق پر روشنی کی ایک کرن نظر آئی جو پھیلتے پھیلتے ہندوستان کی تہذیبی اور تعلیمی تحریک کا پیش خیمہ بنی ۔

بابِ ششم

سامانِ تحریر کی تاریخ اور کاغذ کی ابتداء

ہندوستان بولنے، لکیریں کھینچنے اور صورت بنانے کے ابتدائی ادوار سے گزرا۔ ان میں سے ہر دور سیکڑوں بلکہ ہزاروں سال طویل تھا ان مراحل میں لگاتار فطری اقدامات کے نتیجہ میں نقش کشی نے تحریر کو جنم دیا۔ ابتدائی ادوار میں تحریر برخاص طبقہ کے استعمال کی چیز رہی، جو ابتدائی تحریریں سامنے آتی ہیں وہ خطوط، حسابات، کھانے پکانے کے نسخے اور سفرنامے وغیرہ ہیں اس طرح بتدریج کتابت اور مطالعہ کے فن کو فروغ حاصل ہوا۔

فن کتابت کے بتدریج ارتقار کے ساتھ ساتھ کتابت کے لیے مختلف سامان دریافت کیے گئے جیسے پتیاں، درختوں کی چھال، پتھر، دھات، لکڑی وغیرہ اور اس سامان کے استعمال میں فراہمی اور ضرورت کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً کمی بیشی ہوتی رہی۔

قدیم ہندوستان میں کاغذسازی کوئی معدوم شئے نہ تھی البتہ کاغذ ایک نایاب شئے ضرور تھا۔ عہدِ وسطیٰ میں مغلوں نے کاغذ بنانے اور اس کو بڑے پیمانہ پر استعمال کرنا شروع کیا۔ اس طرح ایک نئے دور کا آغاز ہوا اس دور میں ہندوستان میں مندرجہ ذیل سامانِ تحریر استعمال کیا جاتا تھا۔

1۔ الف کھجور کی پتیاں۔

ب کیلے کی پتیاں۔

ج کنول کی پتیاں۔

(د) کیتکی کے پتے۔

(ہ) بات کے پتے۔

(و) مارشند کے پتے۔

2 — چھالیں :-

(الف) بھوج پتر یا چھال۔

(ب) ساچی یا اگر کی چھال۔

(ج) شہتوت کی چھال۔

(د) نیم کی چھال۔

3 — لکڑی کے تختے :-

4 — پکائی ہوئی مٹی کے تختے۔

5 — سلیٹ۔

6 — بانس کے پرت۔

7 — سوتی اور ریشمی کپڑا۔

8 — چمڑا۔

9 — پتھر۔

10 — اینٹ۔

11 — مٹی کی مہریں یا چھاپے۔

12 — دھاتیں :-

(الف) سونا۔

(ب) چاندی۔

(ج) تانبا۔

(د) بھرت، پھول دھات۔

(ہ) پیتل۔

(و) ٹین۔

13 — کچھوے کی کھوپڑی۔

14 مٹی یا ریت۔

15 چاک یا کھریا۔

16 روشنائی: معمولی، رنگین، اور نظر نہ آنے والی۔

17 دھات کے قلم، بانس کے قلم، ٹہنی کے قلم، نلکے کے قلم۔

18 دوات۔

19 پرکار۔ مسطر وغیرہ۔

تال پتر، تاڈ پتر، یا کھجور کی پتی :۔

قدیم ہندوستان میں تال پتر، تاڈ پتر، یا پنا (پرنا) جو کھجور کی پتیوں کے مختلف نام ہیں عوام کے استعمال میں تھیں۔ پنکھیا کھجور یا چوڑے پتوں والی کھجور جنوبی ہند اور ساحلی علاقوں میں کثرت سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ پتیاں عام طور سے کم قیمت پر مل جاتی ہیں اور پائیدار ہوتی ہیں۔

یہ پتیاں عموماً کافی بڑی ہوتی ہیں۔ ان کی لمبائی ایک فٹ سے تین فٹ تک اور چوڑائی ½1 انچ سے 4 انچ تک ہوتی ہے۔ پتیوں کو ڈنٹھلوں سے جدا کرکے ضرورت کے مطابق لمبا بنایا جاسکتا ہے۔ پہلے پتیاں دھوپ میں سکھائی جاتی ہیں پھر انھیں پانی میں ابال کر دوبارہ سکھا لیا جاتا ہے۔ جب وہ بالکل خشک ہو جائیں تو ان پر ناقوس یا پتھر کی رگڑ سے جلا کی جاتی ہے اس کے بعد انھیں ٹھیک سائز میں کاٹ لیا جاتا ہے۔

دو قسم کی کھجور کی پتیاں لکھنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں ان میں سے ایک کا نام "سری تال" اور دوسری قسم کا نام "تال" ہے۔ "سری تال" صرف جنوبی ہند خصوصاً مالابار میں پائی جاتی ہے۔ اسکی لمبیاں پتلی اور خستہ ہوتی ہیں اور بطور کاغذ استعمال ہوسکتی ہیں وہ کاغذ کی طرح روشنائی جذب کر لیتی ہیں۔ (ii) ہندوستان میں ہر جگہ پیدا ہوتی ہے اور اسکی پتیاں کھردری اور موٹی ہوتی ہیں۔

"سری تال" کی پتیوں کو پکانے کا طریقہ ذرا مختلف ہے۔ ان پتیوں کو تین مہینے مٹی میں دبایا جاتا اور پھر یہ خشک کی جاتی ہیں جو پتیاں سرخی مائل ہو جاتی ہیں انھیں باورچی خانے میں دھواں دیتے ہیں۔ اور جب لکھنا ہو تو انھیں وہاں سے نکال لاتے ہیں[1]۔

کھجور کی پتیوں پر لکھنے کے دو طریقے ہیں۔ جنوبی ہند اور اڑیسہ میں نوکیلے قلم نے الفاظ نقش

---

1. I. A. Vol. I, 1947, p.234.

کر دیئے جاتے ہیں بعد میں کندہ کیے ہوئے الفاظ میں رنگ بھرنے کے لیے پتیوں پر سیاہی کا لکھ یا کوئلہ چھڑک دیا جاتا ہے شمالی ہند کے لوگ اُن پر روشنائی سے لکھتے ہیں ۔

کھجور کی پتیوں والے مخطوطے جنوبی ہند کی گرم مرطوب آب وہوا میں زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکتے لیکن شمالی ہند کی سرد آب وہوا میں وہ کافی دیر پا ثابت ہوئے ہیں جیسے نیپال اور کشمیر میں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم کھجور کی پتیوں والے تمام مخطوطے شمالی ہند میں پائے گئے ہیں ۔

کھجور کی پتیوں پر تحریر کے قدیم حوالے جٹاکا سے ملتے ہیں ۔ مہاتما بدھ کی وفات کے بعد ترپٹکا پہلے کھجور کی پتیوں پر لکھا گیا[2] ارتھ شاستر میں کوٹلیہ نے لکھا ہے کہ جنگل سے حاصل ہونے والے سامان تحریر میں بھوج اور کھجور کی پتیاں ہیں[3]۔

ہوانگ سانگ نے 629ء سے 645ء تک ہندوستان کا سفر کیا۔ اپنے استاد ہیوی لی کی سوانح حیات[4] میں وہ حوالہ دیتا ہے کہ ہندوستان میں کھجور کی پتیوں کو تحریر کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں :-

"ہم کونکن پورا میں آئے ... شہر کے شمال میں تال کے درختوں کا ایک جنگل ہے جو 30 لی (میل) پر ہے۔ اس درخت کی پتیاں لمبی اور چمکدار ہیں یہاں کے باشندے انھیں لکھنے کے کام میں لاتے ہیں اور ان پتیوں کی بڑی قدر کی جاتی ہے۔"[4]

عہد مغلیہ میں بھوج پتر کے ساتھ ساتھ ان پتیوں کو خشک کرکے کاغذ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا ابوالفضل[5] پائی راڈر[6] اور تھیوناٹ[7] اس کی تصدیق کرتے ہیں

---

2. Si-yu-ki (Tr. by Beal) V.2, pp.164-65.
3. Arthasastra (Tr. by Sastry), p.122.
4. Life of Hieun-Tsang, Trubner, 1911, p. 146.
5. Ain-i-Akbari (Jarrett), II, pp.126 and 351.
6. The Voyages of, to the East Indies, the Maldives etc. (Tr. by Albert Gray) Vol. II, p.408.
7. Indian travels by Thevenot and Careri, pt.III, ch.I, p.90.

اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں دیہات کے اسکولوں میں بچوں کو لکھنے کی تربیت کے تین مرحلے تھے پہلے زمین پر پھر کھجور کی پتیوں پر پھر کیلے کی پتیوں پر اور کاغذ پر۔ کھجور کی پتیوں پر دہ روشنائی سے لکھا کرتے تھے پھر اُسے بھیگے کپڑے کے ٹکڑے سے صاف کر لیتے تھے۔ یہ مشق آج بھی دور دراز اسکولوں میں اور جنوبی ہند کے مندروں میں رائج ہے۔

کھجور کی پتیوں والے قدیم مخطوطات میں مندرجہ ذیل مخطوطے قابل ذکر ہیں :-

1- دوسری صدی عیسوی کے تحریر شدہ ڈرامہ مصنف اشوگھوش کا کچھ حصہ جسے شاہی پروشین مہم نے ترفان میں وسط ایشیا میں دریافت کیا۔[8]
2- مخطوطے کا ایک حصہ جسے مسٹر میکارٹنانے کاشغر سے تقریباً چوتھی صدی عیسوی میں بھیجا تھا۔[9]
3- پرجن پرامتا، ہردے سوتر اور اسنیس وجے دھارنی مخطوطات جو ہوری ایزی مندر جاپان میں موجود ہیں انھیں چھٹی صدی عیسوی[10] میں ہندوستان سے لیجایا گیا تھا۔ پتیوں کا سائز [illegible] ہے
4- سکندر پران کا مخطوطہ جو نیپال دربار لائبریری میں ہے اور ساتویں صدی کا ہے[11]
5- پرمیشور تنتر مخطوطہ (ہرش کلنڈر 252 مطابق 859ء) جو کیمبرج ذخیرہ میں موجود ہے[12]
6- لنکا اوتار مخطوطہ جو بدھ تصنیف ہے (نیور کلنڈر 28 مطابق 906-907ء) اور نیپال میں ہے[13]

کیلے کی پتیاں

بنگال میں قرون وسطیٰ میں ابتدائی درجات کے طلباء جب لکڑی کے قلم سے ریت یا مٹی پر لکھنے کی مشق ختم کر لیتے تھے تو انھیں کیلے یا پامیرا کی پتیوں پر لکھنے کی مشق کرائی جاتی تھی اس لیے ہم دیکھتے ہیں

---

8. Kleimere Sanskrit Text . p.1. (Pub. by Dr. Luders).
9. J.A.S.B. Vol. 66, p.218, plate 7.
10. Indian Paleography, R.B. Pandey, p.70.
11. Catalogue of Palm leaf and selected paper Mss. belonging to the Darbar Library, Nepal, Edited by Haraprasad Sastry, p. 52 (Introduction).

کرکنیلے کے پتوں پر طالب علموں کو خوش خطی کی مشق کراتے تھے یہ بنگال کے دور دراز علاقوں میں اب بھی مروج ہے[14]

کنول کی پتیاں

خطوط لکھنے کے لیے کنول کی پتیاں بھی استعمال کی جاتی تھیں۔ کالیداس کے ڈرامہ شکنتلا میں راجہ دشینت کہتا ہے کہ "یہ مکتوباتِ محبت کنول کی پتیوں پر بھی لکھنے کا رواج تھا"[15]

دوسری اقسام کی پتیاں

یوگنی تنتر میں ایک پیراگراف ہے جس میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ اگر ممکن ہو تو کیتکی۔ مارتنڈ یا بات کی پتیوں پر لکھی جائیں گی لیکن جو بسو دل یعنی دوسری پتیوں پر لکھے گا اسے بے شمار مشکلیں پیش آئیں گی۔[16] کرپورا منجری میں (II 7) میں راج شیکھر سے حوالہ ملتا ہے کہ خطوط کیتکی کے پتوں پر لکھے جاتے تھے۔ نیشادھ چرتر میں ہم پاتے ہیں کہ خطوط کیتکی کے سنہری پھولوں کی پتیوں پر ناخن سے لکھے جاتے تھے۔
(VI_63)

بھوج پتر

بھوج درخت ہمالیہ کے علاقہ میں کثرت سے پیدا ہوتا ہے اس کی چھال کا اندرونی حصہ قدیم اور عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں تحریر کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اس کو استعمال کے قابل بنانے کے لیے چھال کو نکال لیا جاتا ہے اور مختلف سائز کے ٹکڑوں میں کاٹ لیا جاتا ہے۔ البیرونی بیان کے مطابق چھال کے ان ٹکڑوں کا اوسط سائز ایک گز لمبا اور ایک Span چوڑا تھا۔[17] پھر ان ٹکڑوں کو تیار کرنے کے لیے تیل لگا کر پالش کی جاتی اور ان کو آپس میں رگڑا جاتا تھا کھجور کے پتوں کے مخطوطات کی طرح بھوج پتر کے ٹکڑوں کو بھی ایک دوسرے پر رکھ کر درمیان سے یا کنارے پر سی دیا جاتا تھا اور ہر ٹکڑے

---

14. Aspects of Bengali Society from old Bengali literature, T.C. Dasgupta, pp. 167-68.
15. Abhijnana-Sakuntala, Canto 3rd.
16. Yogini Tantra as Quoted in Visva-Kosha, v.12, p.27.
17. Alberuni's India: Sachau, I, p.171.

میں سوراخ کیا جاتا تھا تاکہ دھاگہ گذر سکے اور آخر میں لکڑی کے تختے دونوں طرف بطور کور (Cover) لگا دیئے جاتے تھے۔ البیرونی نے اس کی تفصیل اس طرح دی ہے :۔

"شمالی اور وسطی ہندوستان میں لوگ توز درخت کی چھال استعمال کرتے ہیں۔ ان میں کی ایک قسم کمان کی سطح کو ڈھکنے کے کام آتی ہے اسے کو بھورج کہتے ہیں ایک گز لمبا اور ایک بالشت چوڑا ٹکڑا یا اس سے کچھ کم لیا جاتا ہے اور اس کو کئی طریقوں سے بناتے ہیں اس کو تیل دیا جاتا ہے اور پالش کی جاتی ہے تاکہ یہ مضبوط اور چکنا ہو جائے اور پھر اس پر لکھتے ہیں اور ہر تختی پر نمبر شمار ڈالا جاتا ہے۔ پوری کتاب کو کپڑے کے ٹکڑے میں لپیٹا جاتا ہے اور برابر ناپ کی دو تختیوں کے درمیان باندھ دیا جاتا ہے ایسی کتاب کو پنتھی کہا جاتا ہے یہ لوگ خطوط یا کوئی بھی اور تحریر توز درخت کی چھال پر لکھتے ہیں"[18]۔

بھوج پتر کا بحیثیت سامانِ تحریر سب سے قدیم حوالہ ہمیں یونانی مورّخ کیوکرٹس سے ملتا ہے۔ کرٹس لکھتا ہے کہ سکندرِ اعظم کے حملہ کے وقت بھوج درخت کی چھال کو ہندو لکھنے کے لیے استعمال کرتے تھے[19]۔

یونانی مصنفوں میں ایک نیرکوس ہے جو لکھتا ہے کہ روئی کا بنا ہوا کاغذ استعمال ہوتا تھا۔ کمار سنبھو (باب ۱۰۷) میں بھوج پتر برائے تحریر کا ذکر اس طرح ملتا ہے :۔

"جہاں (یعنی ہمالیہ میں) بھوج پتر ہاتھی کی کھال کی طرح نشان لگا ہوا آسانی دوشیزائیں کتوبات محبت لکھنے کے کام میں لاتی تھیں اور اکثر پر خطوط دھاتوں کی بنی روشنائی سے لکھے جاتے تھے"۔

بھوج پتر پر لکھنے کا رواج عہدِ مغلیہ تک اسی شکل میں رہا جیسا البیرونی نے بیان کیا ہے۔ اور آج بھی بھوج پتر پر مقدس کتابیں اور دعائیں لکھی جاتی ہیں جن کو موڑ کر گلے میں زنجیر کے ساتھ پہنا جاتا ہے اور انھیں تعویذ کہتے ہیں۔

---

18. Alberuni's India: Sachau, 1, p.171.

19. Bothlingk and Roth-Sanskrit Worterbuch see under "Bhurja".
20. Strabo, XV.117.

کشمیر میں اس کا استعمال وسیع پیمانہ پر ہوتا ہے۔ بھوج کے مخطوطے بڑی تعداد میں کشمیری پنڈتوں کے ذخیرہ میں ملتے ہیں۔

اس کا قدیم ترین نمونہ فرانسیسی سیاح ایم۔ دو تھے۔ وٹ ڈی رہانس نے کھوٹن میں سنہ 1892ء میں تلاش کیا یہ دھم پد کا ایک نامکمل نسخہ ہے جو پراکرت زبان میں کھروستی رسم الخط میں لکھا ہے[21] اس مخطوطے کی تاریخ تقریباً دوسری یا تیسری صدی عیسوی ہے ایک اور مخطوطہ سمیکت اگما سوتر جو سنسکرت زبان میں ہے کھوٹن میں پایا گیا اور اسکی تاریخ چوتھی صدی عیسوی ہے[22] اس کے بعد کندہ کیے ہوئے مخطوطے میسن نے افغانستان میں تلاش کیے[23]

بھوج پتر کے دوسرے اہم قدیم مخطوطوں کے ذخیرے بور (Bower) اور گاڈفرائی (Godfrey) کے ہیں جو پانچویں صدی عیسوی کے ہیں۔ گلگٹ کے مخطوطے دنے پٹا کا سرسوتی وادبدھ اسکول کے ہیں جو پانچویں صدی عیسوی کے ہیں اور بھنشالی۔۔ نزد مردان۔ کا مخطوطہ ریاضی کی ایک کتاب ہے جو تقریباً ساتویں صدی عیسوی کی ہے[24]

ساچی یا اگر کی چھال

آسام میں ساچی درخت کی چھال لکھنے کے لیے استعمال ہوتی تھی[25] ساچی کے پیڑ کو بنگال میں اگر کہتے ہیں وہ اپنی خوشبو کی وجہ سے زیادہ تر کام میں آتا ہے اس کے پتوں کو تحریر کے کام میں لانے کے لیے جس طرح تیار کرنا پڑتا اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

"چھال حاصل کرنے کے لیے درخت کا انتخاب اس طرح ہوتا ہے کہ وہ پندرہ یا سولہ سال کی عمر کا ہو اس کا تنا 30" سے 35" کا ہو اور زمین سے چار فٹ بلند ہو ایسے

---

21. Indian Paleogra hy, Pandey, p.69.

22. Indian Paleogra y, Pandey, p.69.

23. Ariana Antiqua, H... Wilson, pl. 3 at p. 54. No.11. And also Indian Paleography, Pandey, p.69.

24. J.A.S.B. 65, 225 ff.

25. Descriptive Catalogue of Assamese Mss; H.C. Goswami, p.XV. (Introduction).

درخت سے 18 فٹ لمبی اور 3 سے 27 انچ چوڑی چھال کی پٹیاں اتار لی جاتی ہیں ان پٹیوں کو الگ الگ لپیٹ لیا جاتا ہے۔ لپیٹتے وقت چھال کا اندرونی حصّہ باہر اور سبز اوپری حصّہ اندر رکھا جاتا ہے پھر انھیں کئی دن تک دھوپ میں سکھایا جاتا ہے۔ پھر چھال کے ان ٹکڑوں کو ہاتھ کی مدد سے تختے یا کسی سخت چیز پر رگڑ لیا جاتا ہے تاکہ اس کی اوپری پرت الگ ہو جائے پھر انھیں ایک رات اوس میں رکھ دیا جاتا ہے۔ دوسرے دن صبح اوپری حصّہ (نکاری) ہمارت سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ اور اس چھال کو 9 سے 27 انچ لمبے اور 3 سے 18 انچ چوڑے ٹکڑوں میں کاٹ لیا جاتا ہے انھیں ایک گھنٹہ کے لیے ٹھنڈے پانی میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ اس کا کھار (alkali) دور ہو جائے اور چاقو کی مدد سے اس کی سطح کو چکنا کر لیا جاتا ہے پھر آدھا گھنٹہ دھوپ میں خشک کیا جاتا ہے جب بالکل خشک ہو جاتے ہیں تو انھیں دو پختہ اینٹوں سے رگڑا جاتا ہے۔ متیمہ (Phaseolus Aconitifolius) سے ایک لیس تیار کر کے ان ٹکڑوں پر لیپ دیا جاتا ہے اس کے بعد انھیں (Arsenic) سے زرد رنگ دیا جاتا ہے۔ پھر انھیں خشک کر کے اتنا گھسا جاتا ہے کہ سنگِ مرمر کی طرح چکنے ہو جائیں اس طرح چھال کو تیار کر کے قابل استعمال بنایا جاتا ہے۔[26]

بڑے بڑے ٹکڑے مقدس کتابیں یا مختلف موضوعات پر بلند پایہ کتابیں لکھنے کے کام آتے ہیں۔ ان پر دوسری تحریریں بھی لکھی جاتی ہیں خاص کر بادشاہوں اور نوابوں کے لیے جو تحریریں ہوں۔[27]

شہتوت۔ بات اور نیم کی چھال

بھوج پتر اور ساچی کے علاوہ دوسرے درختوں کی چھال بھی ہندوستان میں لکھنے کے کام آتی تھی شہتوت، بات اور نیم کی چھال مذہبی اقوال و منتر وغیرہ لکھنے کے کام آتی تھی۔[28]

لکڑی کے تختے

لکڑی کے تختوں پر لکھنے کا رواج ہندوستان میں بہت قدیم ہے اور آج بھی ہندوستان

---

26. J.A.S.B. Vol. LXIII, part I (1894) p.109.

27. Descriptive Catalogue of Assamese Mss. P.XV (Introduction).

28. Yogini Tantra, 2.7.

کے کچھ حصوں میں دوکاندار تختیوں پر اپنا حساب کتاب لکھتے ہیں۔ اسکول میں بچے تختیوں پر لکھنے کی مشق کرتے ہیں۔ نجومی بھی ان پر حساب جوڑتے ہیں اور شمالی مغربی سرحدی صوبہ میں کچھ غریب لوگ مقدس مذہبی کتابوں کی نقل چاک سے تختیوں پر کرتے ہیں[29]

اس سے متعلق سب سے قدیم حوالہ لونے پٹا کا کی ایک عبارت میں ملتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بدھ راہب عیسائی عہد سے قبل مذہبی فرمان لکڑی کی تختیوں پر لکھا کرتے تھے[30] جتا کا میں ہمیں اور مواد بھی ملتا ہے۔ ابتدائی درجات میں بچے جو لکڑی کی تختیاں استعمال کرتے تھے جتا کا میں انھیں پھلا کہا گیا ہے[31] صندل کی تختیوں کو ابتدا میں سلیٹ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کا ذکر للت وستار میں ملتا ہے۔ ستا کا بادشاہ "نہاپانا" کے ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لکڑی کے تختے لکھنے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ کتبہ خوانی کی قدیم دستاویزوں سے پتہ چلتا ہے کہ "پھلاکا" یا لکڑی کے تختے قرض وغیرہ کے معاہدے لکھنے کے لیے استعمال ہوتے تھے[33]

"کتایایان" اپنی قانونی دستور کی کتاب میں لکھتا ہے کہ شکایات چاک یا "پنڈ ولیکھ" سے تختیوں پر لکھی جانا چاہئیں[34] سنسکرت ناول "داس کمار چرت" سے معلوم ہوتا ہے کہ رنگ کیے ہوئے تختوں پر لکھنے کا رواج تھا[35] دستاویزیں بھی تختوں پر لکھی جاتی تھیں اس قسم کی آسام کی ایک دستاویز بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں موجود ہے[36]

یسادھ چرت (52 - xxII) میں بتایا گیا ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں سیاہ تختے استعمال ہوتے تھے۔ اٹھارھویں صدی میں جنوبی ہند میں طلبا ایک لمبی تختی لکھنے کے کام میں لاتے تھے۔

---

29. J.A.H.R.S. Vol. 8, pt. 4, p.206.
30. Buddhist India, Rhys Davies, pp. 108-9.
31. Katthaka Jataka (No. 125).
32. Lalitavistara (Eng. Tr.) P. 181-85.
33. Report of the Archaeological Survey, West India, 4.102, (Nasik No.7, 1.4 in B): Indian Paleography, Buhler, p.68.
34. South Indian Paleography, Burnell, p.87.
35. Daa-kumar Charita, Ucchvasa 2.
36. Indian Paleography, Pandey, p.74.

اس تختی کی لمبائی تقریباً تین فٹ اور چوڑائی ایک فٹ ہوتی تھی ان تختیوں کو چکنا کر کے چاول اور کوئلہ کا سفوف ان پر لگا دیا جاتا تھا۔ وہ لوگ چاول سے کلف سے سخت کیے ہوئے کپڑے کو بھی لکھنے کے کام میں لاتے تھے پھر اس کپڑے پر گوند میں کوئلہ کی سیاہی کا گاڑھا لیپ لگا دیا جاتا تھا۔ جب اس کپڑے کو موڑ کر تہیں بنا لی جاتیں تو یہ کتاب سے مشابہ ہو جاتے تھے۔[37]

قدیم ہندوستان میں تختوں کے علاوہ بانس کے ٹکڑوں کو پروانۂ راہداری (پاسپورٹ) لکھنے کیلئے استعمال کیا جاتا تھا۔[38]

سری ہرش نے نسادھ چرت (61 _ XIX) میں بتایا ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں سلیٹیں لکھنے کے کام میں لائی جاتی تھیں۔

کپڑا

قدیم ہندوستان میں کپڑے کے ٹکڑوں کو لکھنے کے لیے استعمال کرتے تھے اس کپڑے کے مختلف نام تھے مثلاً پٹہ، پاٹکا، کرپاسکا پٹہ یا کدیتم۔ لیکن ان کا استعمال اتنا وسیع نہ تھا جیسا کہ کھجور کی پتیوں کا یا بھوج پتر کا تھا۔

اس کو تحریر کے لیے قابلِ استعمال بنانے کے لیے گیہوں یا چاول کے گودے کی موٹی تہہ چڑھائی جاتی تھی تاکہ یہ چکنا اور غیر مسام دار بن جائے۔ جب یہ خشک ہو جاتا تھا تو اس کی سطح کو ناقوس یا پالش کے پتھروں سے رگڑا جاتا تاکہ چمکدار اور لکھنے کے لیے موزوں ہو جائے۔ میسور کے لوگ املی کے بیجوں کا گوند چڑھاتے ہیں تاکہ وہ سیاہ ہو جائے۔ وہ ایسے تختوں پر اپنے حسابات رکھا کرتے تھے اور ان پر چاک سے لکھتے تھے۔ ان کو کدیتم کہا جاتا ہے۔ سرنگیری مٹھ سے ایسا ریکارڈ حاصل ہوا ہے اور وہ تقریباً تین سو سال پرانا ہے۔[39]

کدیتم کے ٹکڑوں پر مٹھ کے حسابات لکھے جاتے۔ مثلاً لیکھ یا تامر پت کی کاپیوں کی فہرست رکھی جاتی۔ گرُوؤں کی فہرست رکھی جاتی۔ ایسے تختوں پر لکھیں دستاویزیں جیسے لیر، انہل دو ٹمن اور دوسرے

---

37. Survey of India's Social Life and Economic condition in the Eighteenth Century, K.K. Datta, pp.20-21,

38. Indian Paleography, Ojha, p. 72

39. Mysore Archaeological Survey Report, 1926

مقامات پر پائی گئی ہیں[39]

کپڑے کو سامانِ تحریر کے طور پر استعمال کرنے کا سب سے پہلا حوالہ نیرکوس کی تحریروں میں ملتا ہے[40] اور ابھیسرتی میں بھی ملتا ہے[41]۔ یاجنا والکیہ سمرتہا (319ء) اور آندھرا عہد کے ناسک کے کتبہ سے پتہ چلتا ہے کہ سرکاری اور نجی دستاویزیں، پٹہ، پاٹیکا یا کرپاسکا پر لکھی جاتی تھیں[43]

اس کے علاوہ پٹن بھنڈاروں میں کپڑے پر لکھی دستاویزیں محفوظ ہیں ان میں سے ایک سمبت 1418 کی رقم کی ہوئی ہے اور اس میں "3 x 25" سائز کے 92 پرت ہیں۔ جین بھنڈار بڑودہ میں جیپر پرت کا نقل اتار لے والے کپڑے پر لکھا ہوا ہے۔ کپڑے کے یہ پرت دو موٹی کھادی کے کپڑے کے ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائے جاتے ہیں[44]

کپڑے کے پرتوں والی ایسی ایک کتاب جین مندر پٹن میں پائی گئی یہ دھرم ودھی ہے اودیاسکو پربھوسوری نے لکھا تھا۔ اس پر اُدے سمہا کی تفسیر ہے اس میں 93 پارچہ پرت ہیں جن کا سائز [illegible] اس کی تاریخ 1418 وی ای مطابق 1361/62ء ہے[45]

آسام میں تلاپت بطور سامانِ تحریر استعمال ہوتا تھا اسے روئی کو دبا دبا کر بناتے تھے[46]

جین لوگ تیوہاروں کے موقع پر رنگین نقشے سوتی کپڑوں پر رنگے ہوئے چنے اور چاول چپکا کر بنایا کرتے تھے۔

ریشمی کپڑا روئی کے کپڑے کی طرح ریشمی کپڑے کو بھی لکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا لیکن قیمتی

---

40. J.A.H.R.S. Vol. 8, p. 206
41. J.A.H.R.S. Vol. 8, p. 206
42. Indian Paleography, Buhler, p. 88
43. Archaeological Survey Report, West India, 4.104 ff. Nasik Ins. No.11A.8 in 8.
44. Gaekwad's Oriental Series, VI. LXXVI.
45. Peterson's Report, p. 113.
46. A Catalogue of Sanskrit Manuscripts at the D.H.A.S. P.C. Chowdhury, p. VI.

ہونے کی وجہ سے اس کا استعمال عام نہ تھا۔ البیرونی سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسے بتایا گیا تھا کہ نگرکوٹ کے قلعہ میں شاہی سلسلۂ نسب ریشمی کپڑے پر تحریر تھا۔[47] ڈاکٹر بوہلر نے جین لائبریری جیسلمیر میں جین سوتر کی ایک فہرست ریشمی کپڑے پر روشنائی سے لکھی ہوئی دریافت کی۔[48]

چمڑا

سقراط سے پوچھا گیا کہ وہ کتابیں کیوں نہیں چمڑے پر لکھ دیتا ہے؟ اُس نے جواب دیا:۔

"میں علم کو زندہ دلوں سے مردہ بھیڑ کی کھالوں
پر منتقل کرنا پسند نہیں کرتا ہوں"۔

مندرجہ بالا بیان سے اور اس دور کے باقی ماندہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانی اور مسلمان جانوروں کی کھال کو لکھنے کے لیے استعمال کرتے تھے لیکن ہندوستان میں چونکہ لکھنے کا دوسرا قدرتی سامان موجود تھا اس لیے یہاں چمڑا شاذ و نادر ہی استعمال ہوتا تھا۔ قدیم ہندوستان میں سوائے شیر اور چیتے کی کھال کے سب ہی چمڑوں کو ناپاک خیال کیا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ جانوروں کی کھال کو برائے تحریر استعمال کے بارے میں بہت کم حوالے ملتے ہیں۔

سبندھو کی واسودتا میں کھال کو بطور سامان تحریر استعمال کرنے کا صرف حوالہ ملتا ہے[49] بوہلر نے کھال پر لکھی ایک تحریر "برھسپج نان کوش" جین لائبریری جیسلمیر میں دریافت کی۔[50]

اسٹین نے "نیا" کے مقام پر تلاش کے دوران بہت سے قدیم ریکارڈ اور خطوط چمڑے پر لکھے ہوئے دریافت کیے ہیں۔ ان میں سے کچھ تیسری صدی عیسوی کے ہیں۔[51] ان تحریروں میں چونکہ ہندوستانی کردار ہیں اس لیے عین ممکن ہے کہ وہ ہندوستان ہی سے گئے ہوں۔ اسٹین کہتا ہے کہ:۔

"ان تحریروں کا چمڑا اس قدر عمدہ پکا ہوا ہے کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے
کہ چمڑا تیار کرنے کی خاصی مہارت ہندوستان میں ہوگی"

---

47. Alberuni's India, Vol. II, p. II
48. Indian Paleography, Buhler, p. 88
49. Vasavadatta (Hall's Edt.) p. 182
50. Indian Paleography, Buhler, p. 90
51. Ancient Khotan, Stein, p. 345.

جب ایک دفعہ چمڑا تیار ہونے ہی لگا تو کھوٹان کے بدھ لوگوں نے اس کی مخالفت بھی یہ کی چمڑے کی پٹیوں پر مقدس کتابیں کشمیر میں برہمنوں میں خصوصاً اور ہندوستان میں عموماً لکھی گئیں۔[52]

پتھر

سرکاری ریکارڈ کو جن میں کتب، جاگیر کی اسناد، اقرار نامے، شاہی احکام، وقف نامے یادداشتیں، مذہبی و ادبی تصانیف وغیرہ شامل تھیں۔ دیرپا بنانے کے لیے قدیم ہندوستان میں پتھر کو تحریر کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور یہ مشق آج بھی جاری ہے۔

یہ تحریریں سنگی تختیوں پر، چٹانوں پر، ستونوں پر یا مذہبی اور دوسری عمارتوں کی دیوار وں پر، اور پتھر کی مورتیوں کے نچلے حصہ اور پشت پر اور تانبے کے برتنوں پر کندہ کی جاتی تھیں۔

ہندوستان کے عظیم شہنشاہ اشوک (تیسری صدی قبل مسیح) نے جو بے شمار شاہی فرمان جاری کیے ان کو پتھر پر کندہ کرنے کا مقصد صاف صاف بیان کیا تھا۔ خاص مقصد جیسا کہ فرمان میں بتایا گیا ہے ان کو دیرپا بنانا ہے (اشوک کا پی۔ ای ۱۱ ۔ ٹوپرا کا بیان)

پتھر پر کھدی تحریروں کو عام طور سے شلالیکھ کہا جاتا ہے اور جن شلالیکھوں پر بادشاہوں اور عمائدین کے نیک کارنامے بطور تعریف کندہ ہوتے ہیں انھیں "پرشستی" کہا جاتا ہے۔

پتھر کو تحریر کے قابل بنانے کے لیے پہلے مختلف سائزوں میں سنگی تختیوں کو چھینی سے چھیلا جاتا ہے پھر پتھر یا لوہے پر رگڑ کر ان پر پالش کی جاتی ہے۔ اگر تختیاں بڑی ہیں تو رنگین دھاگہ یا لکڑی کے مسطر سے ان پر سطر بندی کی جاتی ہے پھر ایک عمدہ خطاط کندہ کیا جانے والا مضمون روشنائی سے خوبصورتی کے ساتھ تحریر کر دیتا ہے اور اب یہ پتھر کی تختیاں گویا کندہ کیے جانے کیلئے تیار ہو جاتی ہیں۔

بعض اوقات کندہ کی ہوئی تختیاں مذہبی یا شہری عمارتوں میں لگا دی جاتی ہیں اور جہاں مضمون طویل ہونے کی وجہ سے زیادہ تختیاں درکار ہوتی ہیں وہاں عبارت کی ترتیب کے مطابق اور سائز کے مطابق سلسلہ وار لگا دیا جاتا ہے۔ چاروں طرف حاشیہ چھوڑا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات حاشیہ کو ابھار کر رکھا جاتا ہے۔ کہیں کہیں اطراف "ڈھلواں" بنائے جاتے ہیں اور وہ حصہ جہاں الفاظ کندہ ہوتا ہے حاشیوں کے مقابل گہرائی میں ہوتا ہے۔

---

52. The Commercial Products of India, G.Watts, p.636.

اگر لاپرواہی کی وجہ سے تراشنے کے دوران پتھر کا کچھ حصہ ٹوٹ جانے تو اسے ہم رنگ دھاتوں سے بھر کر ہموار کر دیا جاتا ہے تب اس پر کندہ کیا جاتا ہے اس طرح سے پتھر کو بھرنے کے ثبوت ہری کیلیناٹا کا چاہومن شاہ دگرہا چہارم (Harikeli-nataka & Chahuman Vigraha IV) اور اس کے درباری شاعر سوماد یو وغیرہ کے ریکارڈ میں ملتے ہیں۔ للت دگراہا راج ناٹاکا (Lalita Vigrajanataka)۔ یہ ریکارڈ آجکل راجپوتانہ عجائب گھر میں موجود ہیں۔

بہت سے پتھر کے کتبوں پر شروع اور آخر میں سواستک، چکر، ترشول، اور ادم کے نشانات ملتے ہیں اور "سدھم"۔ "سوستی"۔ "ہری ادم" اور "سوستی شری" کے الفاظ ملتے ہیں۔ خطاطوں نے عبارت نگاری کے ضوابط کو ملحوظ نہیں رکھا وہ ایک سطر کے بعد دوسری سطر بغیر علامت وقف کے لکھتے چلے گئے۔ لیکن کہیں کہیں کچھ کچھ الفاظ علاحدہ کرکے بھی لکھے گئے ہیں۔ وقف کے نشان کے لیے.. خطاطوں نے سیدھی لائن کھینچی ہے اور ایسی ہی دو لکیریں برابر برابر اختتام کے لیے استعمال کی ہیں۔ کچھ موقعوں پر ختم پر ایک تصویر بنائی گئی ہے جیسے سمدر گپت کے الہ آباد کے کتبوں میں دیکھا گیا ہے۔ یہ بھی پایا گیا ہے کہ کسی باب یا مضمون کے خاتمہ پر کنول کا پھول یا دوسرا پھول یا دائرے کے نشانات ہیں

سنگ مرمر پر الفاظ چھوٹے چھوٹے بنائے جاتے تھے تاکہ کم جگہ میں چھوٹی چھوٹی تختیوں پر زیادہ مواد تیار کیا جا سکے۔

اینٹیں

شاذ و نادر پتھر کی طرح اینٹوں کو بھی مذہبی تحریریں لکھنے کے کام میں لایا گیا۔ کندہ کی ہوئی اینٹیں جو مختلف سائز میں ہیں ہندوستان کے کئی حصوں میں پائی گئی ہیں گیلی مٹی پر الفاظ کے نقش بنانے کے بعد انھیں پکا لیا جاتا تھا۔

ضلع گورکھپور (یو پی) کے گوپال پور گاؤں میں بدھ سوتر اینٹوں پر لکھے پائے گئے ہیں۔ یہ اینٹیں ½11 لمبی اور ½9 چوڑی ہیں۔ کچھ اینٹوں پر 10 سے 12 تک سطریں ہیں۔ اور کچھ میں 9 سے 12 تک۔ اور یہ تیسری یا چوتھی صدی عیسوی کی ہیں[53]

53. Proceedings of the A.S.B. 1896, pp.100-103.

متھرا کے عجائب خانے میں کچھ اور نمونے ہیں جو پہلی صدی عیسوی کے ہیں۔[54] ریاست بنگال میں ایسے بے شمار مندر ہیں جن کی اینٹوں پر تاریخ تعمیر، عطیہ دینے والوں کے نام، معمار کا نام اور تعمیر کا مقصد کندہ ہے۔[55] اینٹوں پر تحریر کے دوسرے نمونے پرانا قلعہ اُجین نزد کاسی پور اور ترائی کا علاقہ ضلع نینی تال یوپی میں ملتے ہیں۔[56]

اینٹوں کے علاوہ مٹی کی مہریں اور برتن بھی اس مقصد کی تکمیل کرتے تھے مہروں پر جو الفاظ بنتے ہیں وہ چھاپے خانے کی طرح ابھرے ہوئے ہیں۔

قدیم ہندوستان میں لکڑی کی تختیوں کے علاوہ کچی مٹی کے پکائے ہوئے تختے تحریر کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ موہن جودارو سے اسی قسم کے تختے مسٹر میکی نے دریافت کیے ہیں ان میں سے ایک 7" لمبا 3" چوڑا اور 0.4" موٹا ہے۔ ان میں پٹی نہیں ہے بلکہ دستہ کے پاس لٹکانے کے لیے سوراخ بنا ہوا ہے۔ یہ تختے اس طرح بنتے ہیں کہ پہلے ان پر سفید رنگ پوت دیا جاتا ہے اور جب وہ تیار ہو جاتے ہیں تو سفید رنگ دھو دیا جاتا ہے۔[57]

دھات کے تختے

دھات کے تختے پر قدیم ہندوستان میں لکھنے کا رواج بہت تھا کیونکہ وہ مضبوط بھی ہوتے تھے اور ان کے استعمال میں آسانی بھی تھی۔ ان پر تحریر کے دو طریقے تھے۔ یا تو تختوں کو ریت کے ان سانچوں میں ڈھال لیا جاتا تھا جن پر چھینی ہتھوڑی کی مدد سے لفظ پہلے سے ابھار لیے جاتے تھے یا ان تختوں پر حروف چھینی اور ہتھوڑی کی مدد سے کھود دیے جاتے تھے ان تختوں کے کناروں کو اٹھا دیا جاتا اور موٹا کیا جاتا تھا تاکہ تحریر کی حفاظت ہو سکے۔ اب تک جن دھاتوں پر تحریر کے نمونے ملے ہیں ان میں تانبا، چاندی، تانبا، پیتل، پھول اور ٹین شامل ہیں۔

---

54. Indian Paleography, Pandey, p. 77

55. V.S. Quarterly, Vol. 21, No.1, pp. 45-46.

56. Archaeological Survey Report, 1903-4 (Plate 60-62) + I.A. Vol. 14 p.7 , Indian Paleography, Pandey, p.77.

57. Further Excavations at Mohenjodaro, Mackay, Vol. I.

سونا

شاہی فرمان، ادبی تصنیفات، خطوط، سند جاگیر اور اخلاقی ضوابط کو سونے پر لکھنے کے حوالے رُدُرد (Rudra) کرودھما اور تیسا کن جتا کا میں ملتے ہیں[58]۔ برنل کی کتاب جنوبی ہند میں کتبہ خوانی کے ابتدائی اصول سے بھی اسس امر کی تصدیق ہوتی ہے[59]۔ یا تو ان حروف کو کھود دیا جاتا ہے۔ یا (Vermilion) سے لکھا جاتا ہے۔

جنرل کننگھم نے ٹکشلا کے گنگو نامی استوپ سے کھروستی رسم الخط میں لکھا ہوا طلائی نمونہ دریافت کیا ہے[60]۔ چونکہ سونا ایک قیمتی دھات تھی اس لیے اس پر تحریر کے نمونے بہت نادر ہیں۔

چاندی

سونے کی طرح چاندی پر بھی بہت کم لکھا جاتا تھا۔ چاندی کی تختیوں پر تحریر کے نمونے بھٹی پرولو میں[61] پائے گئے اور سرکاری دستاویز میں ٹکشلا[62] میں ملی ہیں (پلیٹ ×۱)

جین مندروں میں عام طور سے گول چاندی کی پلیٹیں ملتی ہیں جن پر منتر کھدے ہوئے ہیں۔ جین مذہب کے شوتامبر فرقہ کے مندروں میں اجمیر میں ایسی چار تختیاں ہیں جن پر منتر کندہ ہیں ایک تختی "۱۱×۹" سائز کی ہے جس پر رشی منڈل منتر کندہ ہے[63]۔ برٹش میوزیم میں ایسی تحریریں ہیں جو کھجور کی پتیوں پر لکھی ہیں، اور جن پر سونا یا چاندی چڑھا ہے[64]۔

تانبا

تانبا کی تختیوں کا بھی تحریر کے لیے وسیع طور پر استعمال ہوتا تھا۔ بادشاہ گورنر اور رؤسار

---

58. Indian Studies, Buhler, III, 10 f.
59. Elements of South Indian Paleography, p. 90-93
60. Corpus Inscriptionum Indicarum V. II, p.I; p.83, Plate XVII
61- Indian Paleography, Buhler, p. 90
62. Corpus Inscriptionum Indicarum Vol. II, p. I, pp.70 and 81
63. Prachin Lipimala, Ojha, p. 152 ff.
64. J.A.H.R.S. Vol. 8, p.207.

جاگیر اور نقد عطیئے جو مندروں، قابل برہمنوں اور پجاریوں کو علم و مذہب کی سرپرستی کے لیے دیتے تھے ان کی سندیں تانبہ کی تختیوں پر لکھ کر دی جاتی تھیں۔ تانبہ کی ان پلیٹوں کو تامر ساس، تامر پھلی، تامر پتا تامر پھالکا، ساسن پتر اور دان پتر کے ناموں سے موسوم کیا جاتا تھا۔[65] بادشاہ خاص افسران مقرر کرتے تھے جو اس بات کی نگرانی کرتے کہ عطیات جاری کیے جائیں اور مستقل جاری رہیں۔ جو افسران بادشاہ کی طرف سے ان عطیات کی نگرانی کرتے تھے ان کو دوتا کا کہا جاتا تھا۔ بعض اوقات ان دوتا کا کے نام بھی تانبہ کی تختی پر لکھ دیئے جاتے تھے کلہن کے بیان کے مطابق شاہان کشمیر کے یہاں ان افسران کا نام "پٹو پادھیائے" ہوتا تھا وہی لوگ ان خطابات سے متعلق عطیات نامے تحریر کرتے تھے۔[66]

تانبہ کی پلیٹ پر لکھنے کا طریقہ عام طور پر یہ تھا کہ ریت کا سانچا بنا کر الفاظ ابھار لئے جاتے۔ اور تانبا اس میں ڈھال لیا جاتا تھا یا تانبے کی پلیٹ پر چھینی اور ہتھوڑی کی مدد سے حروف کھود دیئے جاتے سوہگوڑ تانبہ کی پلیٹ جو آج تک کی دریافت کے مطابق سب سے قدیم ہے ریت کے سانچے میں ڈھال کر بنائی گئی تھی حروف اسی طرح بنائے گئے ڈیزائن اور نشانات دھات کے نوکدار قلم سے کھودے گئے پہلے ایک ماہر خطاط تانبہ کی پلیٹوں پر عبارت کو روشنائی سے لکھتا بعد میں کھودنے والا ان الفاظ کو کندہ کر دیتا۔ بعض تحریریں لائینوں کے بجائے نقطوں کے ذریعہ لکھی جاتی تھیں۔[67] جنوبی ہند کی تانبہ کی تختیوں پر الفاظ گہرے نہیں ہیں۔ شاید الفاظ کو پہلے مٹی سے چپکایا گیا ہو پھر لوہے کے قلم کی مدد سے لکھا گیا ہو بعد میں نوکیلے اوزاروں سے کندہ کیا گیا ہو۔

جنوبی ہند میں جاگیر کی اسناد جو تانبا کی تختیوں پر ہیں کئی کئی تختیوں پر لکھی ہوئی ہیں۔ جبکہ شمالی ہند میں یہ دو تختیوں سے زیادہ پر نہیں ہوتیں۔

وینکٹ پتی دیو راجہ وجیا نگرم کی زمینی عطیہ کی تانبہ کی تختی جو مدراس میں ملی ہے شک سمبت 1508 مطابق 1586ء کی ہے اس کا مضمون نو تختیوں پر مشتمل ہے۔[68] جو دان پتر راجندر چولا نے اپنی حکومت کے تیرہویں برس جاری کیا تھا وہ لنڈن یونیورسٹی کے میوزیم میں موجود ہے اور اکیس[21] تختیوں پر

---

65. I.A., Vol. V, No. 1.

66. Indian Paleography, Buhler, p. 95

67. E.I. Vol. 9, p. 136.

68. Ibid., 12, pp. 172-18[illegible]

منتقل ہے[69]

تانبہ کی تختیاں مختلف حجم اور سائز میں بنتی ہیں۔ صفحات کے نمبر شمار یا تو حاشیہ کی بائیں جانب ملتے ہیں یا پھر ایک پرت کے اوپری حصہ پر۔ مطلوبہ حجم اور سائز کے تانبہ کے پتر تانبہ کو ہتھوڑی سے چوٹ لگا کر بنائے جاتے ہیں۔ اگر پتر بنانے میں کوئی خامی رہ جاتی تو کندہ کرنے والا پرت کے اس حصہ پر ضرب لگا کر اسے ہموار کر لیتا پھر اس پر تحریر کے اس حصہ کو دوبارہ لکھ لیا جاتا۔ جن تختیوں پر کچھ نہ لکھا ہوتا وہ جلد کا کام دیتی تھیں۔ تحریر کو محفوظ کرنے کے لیے تختیوں کے کناروں کو ابھار دیا جاتا تھا[70]

تانبا کی پلیٹوں کا بطور سامان تحریر استعمال عہد موریا سے رائج تھا[71] سوہگوڑ تانبا کی پلیٹ جو عہد موریا کی ہے اس بات کی تصدیق کرتی ہے[72]۔

چینی سیاح فاہیان کے روزنامچہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بدھ عبادت خانوں میں عطیات آراضی کی تختیاں تانبا کی تھیں اور ان میں سے بعض مہاتما بدھ کے دور کی تھیں[73]۔

ہیوان سانگ ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا اور اس نے بتایا کہ کنشک نے مجلس مشاورت کے بعد پورا "دنے" تانبہ کی تختیوں پر لکھا۔ بادشاہ نے اس کو پتھر کے ایک صندوق میں رکھا اور اس پر ایک استوپ تعمیر کیا[74]

میکس ملر سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ستایان نے ویدوں پر جو تفسیر و حواشی لکھے وہ سب تانبا کی پلیٹوں پر تھے[75] لیکن برنل اس تحقیق سے متفق نہیں ہے[76]

اس قسم کے شواہد موجود ہیں کہ قیمتی ادبی و مذہبی تصنیفات تانبا کی تختیوں پر لکھی جاتی تھیں تاکہ خاندان کی تصنیفات تانبا کی پلیٹوں پر کندہ ہیں اور وہ ترونچی مندر میں محفوظ ہیں[77]۔ اسی قسم کے نمونے

---

69. Tamil and Sanskrit Inscriptions, Burgese, pp.206-16.
70. J.A.H.R.S. Vol. 6, p. 203.
71. Indian Paleography, Buhler, p. 90
72. Proceedings of the A.S.B., p. 1894, p. 1
73. Si-yu-ki (Beal):1.XXXVIII.
74. Young-Chawang, Walters 1,p. 271.
75. Rig Veda, Vol. 1, p. XVII.
76. South Indian Paleography, p. 86
77. J.A.H.R.S. Val. VIII. p. 207

برما اور لنکا میں بھی ملتے ہیں جو اب برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔[78]

ساسن پر کندہ کرنے والے کو چیتل ہار، لوہاکار، آیاس کار (تانبا نگار)، سوتر دھار (پتھر کا کام کرنے والے)، ہیم کار یا سونا کار، شلپن یا دجنانکار (دستکار) جیسے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔[79] کالنگا کے ساسنوں میں ان لوگوں کو اکھشالکا، اکھاشالین یا اکھاشالے (سونا نگار) کہا گیا ہے۔[80]

سمرتی یا جناواکیہ (۲۰ ۔ 318 ۔ 1) سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مذہبی جاگیروں کی اسناد ناپائیدار ساما ن تحریر پر لکھی جاتی تھیں۔ بربہت کتھاکوش (23-21 ×) اس بیان کی تصدیق کرتا ہے اس سے یہ مزید اطلاع ملتی ہے کہ ان ناپائیدار اسناد کو پتریکا کہا جاتا ہے۔ لفظ پتریکا کا استعمال ساسن سے جدا ہے کیونکہ عموماً ساسن تانبا کی تختیوں پر ہوتے تھے۔

پھول دھات پیتل اور ٹین

پھول دھات، پیتل اور ٹین بطور سامان تحریر بہت کم استعمال ہوتے تھے۔ اب تک ان دھاتوں پر تحریر کے جو نمونے دستیاب ہوتے ہیں وہ بہت بعد کے زمانے کے ہیں۔ عام طور سے مندر کی گھنٹیوں پر ان کے عطا کرنے والوں کے نام اور تاریخ کندہ ہیں۔ پھول دھات پر جو تحریریں ملی ہیں وہ بعد کے زمانے کی ہیں۔[81]

پیتل کی مورتیاں ساتویں صدی عیسوی سے ہی کندہ شدہ ہیں ان کے ستونوں پر تحریریں ملتی ہیں۔ پیتل پر کندہ کی ہوئی تحریریں جین مندروں میں پائی گئی ہیں۔ اچل گڑھ ماؤنٹ آبو کے مندر میں پیتل کے بتوں پر تحریر کے بہت سے نمونے ہیں۔[82]

ٹین تحریر کے لیے بہت ہی کم استعمال ہوا ہے۔ اس کا ایک واحد نمونہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ جس پر ایک بدھ مخطوطہ تحریر ہے۔[83]

---

78. Journal of the Pali Text Society, 1883, 137 ff.
79. Indian Paleography, Buhler, p. 95
80. Indian Paleography, Buhler, p. 95.
81. Indian Paleography, Pandey, p. 82
82. Indian Paleography, Pandey, p. 82 ff.
83. Indian Paleography, Pandey, p. 83.

لوہا

لوہے کو بھی بطور سامان تحریر استعمال کیا گیا لیکن زنگ لگنے کی وجہ سے اس کا استعمال عام نہ تھا۔ دہلی میں قطب مینار کے قریب مہرولی میں لوہے کا ستون ہے جس پر کندہ کی ہوئی عبارت موجود ہے اس تحریر کی تاریخ پانچویں صدی عیسوی ہے اور بادشاہ چندر نے اس کو بنوایا تھا۔[84]

آبو پہاڑ پر اچلیشور مندر میں ایک ترشول ہے جس پر کندہ کی ہوئی تحریر ہے یہ ترشول لوہے کا بنا ہے اس کی تاریخ پھاگن 1468 ہے۔[85]

کچھوے کی کھوپڑی

کچھوے کی کھوپڑی کو بھی کبھی کبھی لکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے دو نمونے ڈھاکہ کے میوزیم میں محفوظ ہیں۔[86]

مٹی یا ریت

قدیم ہندوستان میں ابتدائی درجات کے طلبا، کلاس کے فرش پر ریت یا مٹی چھڑک کر گھاس کے تنکے کو قلم بنا کر لکھتے تھے۔ تمام ہندوستان میں یہ روایت عہد مغلیہ تک رائج رہی۔[87]

لیکن بنگال میں مذکورہ بالا طریقۂ تحریر کافی بعد تک جاری رہا۔ اس کی ایک صاف تصویر دیارام کے شاردا منڈل میں ملتی ہے۔ جہاں ہمیں ملتا ہے کہ غیر معمولی دباؤ کے نتیجہ میں ایک شہزادے کو مٹی اور پھونس مہیا کرنا پڑا تھا۔[88]

یہ مشق جنوبی ہند میں اٹھارہویں صدی کے آخر تک رائج رہی جبکہ نو عمر طلبا رانگلی سے

---

84. Corpus Ins. Ep. Vol. 3, 139.

85. Indian Paleography , Ojha, p. 154.

86. Year Book of the Royal A.S.B. , p. 57, Vol.XVI,1960.

87- Travels in India in 17th cy. (1873): Frayer John and Sir Thomas Roe, p. 312.

88. Same as No. 14, pp, 167-69

ریت پر لکھ کر ابتدائی تعلیم حاصل کرتے تھے[89]

چاک (کھریا)

سلیٹ اور تختہ سیاہ پر لکھنے کے لیے چاک کو استعمال کیا گیا۔ زیادہ تر چرت (19. VI اور 101، XVI، 86.) میں ہمیں ملتا ہے کہ چاک استعمال ہوتا تھا۔ چاک کی شکل گول ہوتی اور وہ سخت ہوتے تھے (XVI، 101)

بنائی میں حروف

قدیم ہندوستان میں دستکاری میں حروف اور اشکال کو خاص مقام حاصل رہا ہے۔ یہ طرز تحریر قدیم، چینی، وینیشین اور ہندوستانی فنون میں پایا جاتا ہے۔

ہندوستان میں بنائی کے اندر الفاظ و اشکال کا رواج جین لوگوں میں تھا اور اس کے نمونے کمارا سوامی نے اپنی کتاب "کیٹلاگ آف انڈین کلکشن میوزیم آف فائن آرٹس بوسٹن حصہ 4" میں شائع کیے ہیں۔ ان میں سے ایک سمبت 1766 مطابق 1710ء کا ہے۔ یہ روئی کی پتلی پتلی پٹیاں جن پر منتر ہوتے اور ڈیزائن بنے ہوتے جلد ساز مخطوطات کی جلدیں بنانے میں استعمال کرتے تھے۔ عام طور سے ان پٹیوں کا رنگ نیلا ہوتا اور ان پر عنابی سرخ کنارے بنے ہوتے تھے۔

ہمیں ملتا ہے کہ جینی اور اسی طرح برہمنی منتر بنے ہوئے نمونوں میں ترشول، تلوار، پنکھا، سواستک کا نشان، مندر، درخت، پھول، کشتی، پالکی اور چراغ وغیرہ کی علامتیں ہیں۔ بڑودہ میوزیم میں ان کا عمدہ ذخیرہ ہے۔ ان کے سائز مختلف ہیں "7 × "4 سے لیکر "6·11 × '7 تک

ان میں سے ایک سوتی نمونہ پالن پور شمالی گجرات میں ہے جو کافی دلچسپ ہے۔ کیونکہ انہیں منتر بائیں جانب ہے جب کہ عام طور پر جین طرز تحریر میں جیسا کہ جین مخطوطوں سے ظاہر ہوتا ہے اوپر

---

89. Survey of India's Social Life and Economic condition in the Eighteenth Century, K.K. Datta, p. 20.

لکھنے کا رواج رہا ہے اور جسے پرتی منتر یا پرستھو منتر کہتے ہیں وہ اس نمونے میں اختیار کیا گیا ہے ۔ یہ نمونہ اس لیے بھی غیر معمولی ہے کہ اس سے خطّاط کے متعلق بھی اطلاع ملتی ہے جس نے اس نمونہ کو پانچویں بھدراپد میں سمبت 1739 مطابق سنہ 1683ء میں بُنا ۔ اس جیبی رشی کا نام منوہر تھا ۔

بُنائی میں تحریر کے دو اور نمونے بڑودہ میوزیم میں موجود ہیں ۔ ان میں سے ایک تھیلا مالائیں (تسبیحیں) رکھنے کے لیے ہے اس کی شکل تکونی ہے اور گائے کا منہ بنا ہوا ہے[90] ۔ دوسرا نمونہ ایک کنٹوپ ہے جو پجاریوں کے سر اور کان ڈھکنے کے لیے تھی[91]

اوّل الذکر نمونے پر جو تحریر ہے وہ شِو پاروتی اور گنیش کے لیے خطابات ہیں ۔ اس پر لنگ اور یونی کا ڈیزائن ہے اور ترشول بنا ہے ۔ کنٹوپ پر جو ریشم کے ٹکڑوں سے بنی ہے ولبھا چاریہ کے اشعار کشیدہ ہیں ۔

ویشنو (Vaishnavas) حضرات میں سوتی اور ریشمی غلافوں پر محبوب دیوی دیوتاؤں کے نام بنائی میں لکھنا ایک عام روایت ہے ۔ ایسے کپڑے یا ریشم کے غلاف کو نامادلی کہا جاتا ہے ۔ ان پر کرشن اور رام کے نام تحریر کیے جاتے ہیں ۔

قلم اور دھات کے قلم

قلم کو عرف عام میں لیکھنی[92] یا قلم کہا جاتا تھا[93] اس کے علاوہ دوسرے لفظ جو قلم کے مفہوم کو ادا کرتے تھے وہ یہ تھے :-

وارتک یعنی حروف بنانے والا[94] ورنکا[95] ورن ورتکا اور[96] شلاکا[97] (مروجہ جنوبی ہند)[99]

---

90. New Indian Antiquary, Vol. I, Sept.,1938, Plate VI
91. New Indian Antiquary, Vol. I, Sept.,1938, Plate VI
92. Indian Paleography, Pandey, P.85.
93. Commercial Products of India, Watt, p.863.
94. Lalitavhstara, ch. X, pp. 181-85
95. Amarkosha, III,5,38
96. Dasakumar Charita, Ucchavasa II (Coloured Pencil)
97. Malati Madhava 1.2.

اور سلائی (مروجہ زبان مراٹھی)[98] نکلے کے قلم کو قلم کہا جاتا تھا اور اس کا قدیم ہندوستانی نام "اسیکا" ہے[99]۔

دو قسم کے قلم استعمال کیے جاتے تھے ایک قلم پتیوں وغیرہ پر الفاظ کندہ کرنے کے لیے ہوتا تھا دوسرا روشنائی سے پتیوں چھال اور کاغذ پر لکھنے کے لیے۔

"شلاکا" یا دھات کا قلم لوہے یا فولاد کا بنا اور نوکدار ہوتا تھا جس سے کھجور کے پتوں پر حروف کندہ کیے جاتے تھے۔ دھات کا قلم تمام ہندوستان میں استعمال ہوتا اور خاص طور سے جنوبی ہند میں بہت قدیم زمانہ سے استعمال ہوتا تھا لیکن اس قلم کے ابتدائی نمونے ہڈی کے بنے ہوئے ملتے ہیں (پلیٹ 5)۔

آثار قدیمہ کی کھدائی میں ملی اشیا میں روپڑ کے مقام پر جو انبالہ سے 60 میل شمال میں ستلج پر واقع ہے ایک ہڈی کا بنا ہوا قلم دستیاب ہوا[100] اس قلم کی تصویر "قدیم ہندوستان" شمارہ نمبر 9 سنہ 1953ء میں چھپی تھی۔ یہ قلم دونوں طرف سے نوکدار ہے۔ ایسا ہی ایک قلم شری کالی داس دت نے ہری نارائن پور میں جو ڈائمنڈ بار بر مغربی بنگال کے جنوب میں 4 میل پر واقع ہے تلاش کیا ہے یہ تیسری یا دوسری صدی قبل مسیح کا ہو سکتا ہے۔

ٹیکسلا میں ہڈی اور ہاتھی دانت کے قلموں کے بے شمار نمونے تلاش کیے گئے ہیں۔ دو تانبے کے قلم جن کی نوک موجودہ نب کی طرح درمیان سے کٹی ہوئی ہے ٹیکسلا میں ملے ہیں اور یہ پہلی صدی کے ہیں۔

عبدالرزاق جو شاہ رخ کا سفیر تھا ہندوستان آیا اور وجے نگر گیا۔ وہ لکھتا ہے:۔

"ان لوگوں کی تحریر دو قسم کی ہے ایک طریقہ یہ ہے کہ لوہے کے قلم سے پتوں پر حروف کندہ کرتے ہیں دوسرا طریقہ یہ ہے کہ یہ لوگ ایک سطح کو سیاہ کر کے اس پر نرم پتھر کے قلم سے حروف نقش کرتے ہیں اس طرح سیاہ سطح پر سفید حروف بن جاتے ہیں یہ تحریر کافی دنوں تک باقی رہتی ہے اور قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے[101]۔

98. Indian Paleography, Buhler, p. 92

99. Indian paleggraphy, Buhler, p. 92

100. Ancient India, No.9, 1953, Fig. 4

101. The Commercial Productg of India, Watt, 1908, P.863

دوسرے قلم جو روشنائی سے لکھنے کے لیے ہوتے تھے لکڑی، بانس، گدھ یا عقاب کے پر یا نکلے سے بنائے جاتے تھے۔ قلم کی نوک تیز چاقو سے کاٹ کر نوکیلی بنادی جاتی تھی۔ عہد مغلیہ کے دوران اوِنگٹن (OVINGTON) لکھتا ہے کہ قلم ہنس کے پر کے برابر لمبا اور موٹا ہوتا تھا۔[102] فن خطاطی کی حوصلہ افزائی کے لیے مسلم حکمرانوں خصوصاً مغل بادشاہوں نے ماہر خوشنویسوں کو انعامات دیے جو جواہر والے قلم اور قلمدان کی شکل میں تھے۔ شہزادہ اورنگ زیب نے خطاط شیخ فرید بخاری کو ایک شاہی خلعت، جواہر والی جڑاؤ تلوار، قلم اور قلمدان تحفہ میں دیے۔ جہانگیر نے انکو السیف والقلم کے خطاب سے نوازا۔[103]

مغل عہد میں عام طور پر خوش نویس حضرات نلکے کے قلم کو عقاب کے پر کی طرح بنا کر استعمال کرتے تھے اور اسے "فارسی قلم" کہا جاتا تھا۔[104]

یوگنی تنتر میں بتایا گیا ہے کہ تانبے، پیتل، سونے اور نلکے کا قلم استعمال کرنا چاہیے لیکن گھٹیا دھات یا سفید پیتل کا قلم نہ ہونا چاہیے۔ اگر یہ استعمال کیا گیا تو کاتب کے لیے تباہی کا باعث ہوگا۔[105] عہد وسطی میں سونے کا قلم (کنچن لیکھنی) ہندوستان میں اتنا غیر معروف نہ تھا جیسا کہ نیسادھ چرت (X.92) میں بتایا گیا ہے۔

روشنائی

عیسوی کلنڈر شروع ہونے سے بہت پہلے ہندوستان میں روشنائی استعمال ہوتی تھی اور اسے مسی اور میلا کے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔[106]

نیرکوس اور کیو کرٹس (Nearchos & Q.Curtius) کی تحریروں سے روشنائی کے متعلق سب سے پہلا حوالہ ملتا ہے۔[107] ان یونانی مصنفین نے کاغذ اور سوتی کپڑے کو بحیثیت سامان

---

102. A Voyage to Surat in the year 1996: J.A.Ovington, PP 249-60

103. Tusak-i-Jahangiri (Rogers and Beveridge) Vol.I,p.1

104. A Voyage to Surat in the year 1696,p.249.

105. Yogini Tantara, 2.7.

106. Indian Palaeography, Buhler, p.91

107. Strabo, L.C. XV.,117, Hist. Alex.VIII.6

تحریر ہندوستان میں استعمال ہونے کا حوالہ دیا پھر روشنائی کے متعلق معلومات دیں۔ ایک برتن پر روشنائی سے تحریر کا براہ راست نمونہ اندھیر کے استوپ میں ملتا ہے جو دوسری صدی قبل مسیح کا ہے۔[108] کندہ کرنے سے قبل اشوک کے کچھ فرمان روشنائی کے نقطوں کے ذریعہ حروف بنا کر لکھے گئے تھے۔[109] سنسکرت لفظ سی گیا ہر سوتر میں بار بار استعمال کیا گیا ہے جو یقیناً عہد عیسیٰ سے قبل کی تصنیف ہے۔[110] عیسوی کلنڈر کے ابتدائی دور میں برہمی اور کھروشتی دستاویزیں جو روشنائی سے تحریر کی ہوئی تھیں کھوتن اور ہندوستان میں دریافت کی گئیں۔[111] اجنتا میں بھی کچھ کتبے روشنائی سے لکھے ہوئے ملتے ہیں۔[112]

روشنائی کئی رنگوں کی استعمال ہوتی تھی جن میں کالا رنگ عام تھا دیگر رنگوں میں سرخ، سنہری اور روپہلی رنگوں کی روشنائی تھی۔ کاربن کی سیاہی کشن عہد میں استعمال ہوتی تھی۔[113]

قدیم ہندوستان میں سُرخ روشنائی ویدوں میں حروف علت (Vowels) کی نشاندہی کے لیۓ اور حاشیۓ بنانے کے کام آتی تھی۔ نجومی کنڈلی بنانے میں سُرخ دائرہ سُرخ روشنائی سے بناتے تھے۔ بعض اوقات باب کے خاتمہ پر "بھگوان اُباچ" یا "رشی اباچ" جیسے الفاظ سرخ روشنائی سے لکھے جاتے تھے۔

اُمراء اور صاحبان دولت سنہری اور روپہلی روشنائی ادبی اور مقدس تصنیفات تحریر کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ مغربی ہندوستان کی جین لائبریریوں اور عہد مغلیہ میں ایسی روشنائی کے مخطوطے کافی تعداد میں ملتے ہیں۔

---

108. Indian Paleography, Buhler, p. 91

109. Indian Paleography, Buhler, P. 91

110. Indian Paleography, Pandey, p. 82

111. Indian Paleography, Buhler, p. 92

112. Archaeological Survey Report, West India, 4 plate 59 (Indian Paleography, Buhler, p.92)

113. Archaeological Report, 1929,30,209

مختلف رنگوں کی روشنائی بنانے کا طریقہ حسب ذیل ہے :۔

عام قسم کی یعنی دُھل جانے والی روشنائی سرمہ، کتھا اور گوند کو ملا کر بنائی جاتی تھی۔

درخت کی چھال پر لکھنے والی سیاہی بادام کے چھلکوں کے کوئلے اور راکھ کو گائے کے پیشاب سے ملا کر بنائی جاتی تھی۔ افتادِ زمانہ سے جب ایسی روشنائی دھندلی ہونے لگتی ہے تو پانی سے صاف ہو جاتی ہے۔ اس طرح گندگی دور ہو جاتی ہے تو تحریر واضح ہو جاتی ہے۔

مستقل یعنی نہ مٹنے والی روشنائی یوں بنائی جاتی کہ تل کا تیل جلا کر کالکھ حاصل کی گئی اس میں گوند اور تھوڑا پانی ملایا گیا کئی گھنٹے تک اس کو لوہے کے کھرل میں لکڑی کی موسل سے کوٹا جاتا پھر اس لگدی کو تھوڑے پانی کے ساتھ ماز دپھل ملا کر چند گھنٹے کھرل میں کوٹ لیا جاتا اور اس کو دھوپ میں سکھا کر ٹکڑے بنا لیے جاتے۔

آسام میں روشنائی یوں بنائی جاتی تھی کہ Silica Terminalia Citarina کو بیل کے پیشاب میں ملا دیا جاتا تھا۔

بنگال میں روشنائی Terminalia Khebula کو Terminalia Baberica کے ساتھ ملا کر چراغ سے حاصل کی ہوئی کالکھ اس میں شامل کر کے تیار کی جاتی تھی ایسی روشنائی کافی عرصہ تک باقی رہتی تھی۔[114]

اس کے علاوہ روشنائی بنانے کے بہت سے طریقے "پنتھی پریچیہ" کی جلد اوّل و دوم میں بتائے گئے ہیں یہ کتاب وشو بھارتی سے چھپی ہے۔[115]

سرخ روشنائی بنانے کے دو طریقے تھے :۔ اس روشنائی کو الکٹا کا یا آلتا کہا جاتا ہے۔ پیپل کے گوند کو مٹی کے برتن میں ابال لیا جاتا اور اس میں سہاگی یا لودھرا ملا دیا جاتا ہے۔ دوسرا طریقہ سرخ رنگ Vermilion میں گوند اور پانی ملا کر روشنائی تیار کرنے کا ہے۔

---

114. Aspects of Bengali Society from old Bengali Literature: T.C. Dasgupta, pp.167-169.

115. Punthi-Parichaya, Visva-Bharati, V.I,p. 190; V.2,p.35

سنہری اور روپہلی روشنائی اس طرح بنائی جاتی تھی کہ سونے اور چاندی کے ورقوں میں گوند شامل کرلیا جاتا۔ جس کاغذ پر اس روشنائی کو استعمال کیا جاتا اسے چکنے پتھر یا سیپی سے گھس لیا جاتا تھا تاکہ حروف چمکنے لگیں۔

نہ نظر آنے والی روشنائی کا ایک دلچسپ انداز کوچ بہار کے راجہ نے استعمال کیا۔ ایک خط اہوم راجہ سوکھمپا کھورا راجہ (1552 ـــ 1611 A.D.) کو بھیجا گیا تھا۔ اہوم دربار باوجود اپنی عقلمندی کے اس خط کو پڑھنے سے قاصر رہا۔ ایک فاضل نے اس تحریر کو اندھیرے میں لیجاکر پڑھا اس وقت الفاظ چمکنے لگے کیونکہ انھیں کیچوے (Earth worm) کے رس سے لکھا گیا تھا۔[116]

عہد مغلیہ میں ہندوستانی روشنائی کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا گیا اور اسی روشنائی کو مخطوطات وغیرہ تحریر کرنے کے لیے استعمال کیا گیا اس کے علاوہ سیاہ پنسلیں عہد مغلیہ میں "قلم سُرب" کے نام سے استعمال میں لائی گئیں۔

دوات قدیم حتیٰ کہ ماقبل تاریخ ہندوستان میں بھی فن تحریر کوئی اجنبی چیز نہ تھی، چنہودارو اور موہن جودارو مقامات سے دوات کی دریافت اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔

(پلیٹ .IV)

چنہودارو کی مختلف دریافتوں میں سے ایک دوات بالکل ویسی ہی ہے جیسی آج کل دیہاتوں میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ چھوٹی چیز جو بُری طرح شکستہ ہوگئی ہے 1.89 انچ اونچی ہے اگرچہ اس پر روشنائی کا کوئی دھبہ باقی نہیں ہے لیکن یقینی طور پر یہ بحیثیت دوات استعمال ہوئی ہوگی۔ یہ ہاتھ کی بنی ہوئی ہے اور عمدہ کاری گری کا نمونہ ہے اس کے چاروں کونے نمایاں ایک امتیاز بخشتے ہیں۔ اس کے اندر کا گڑھا جو اوسطاً ایک انچ چوڑا ہے پوری طرح گول نہیں ہے اور 1.52 انچ گہرا ہے۔[117]

ایک اور دوات موہن جودارو میں دریافت کی گئی۔ مارشل اور سر آرتھر ایونس[118]

---

116. Descriptive Catalogue of Assamese Mss., Barua.

117. Chanu Daro Excavations. Mackay, p. 220, plate XCI,2

118. Place of Minos, Sir A. Evans, Vol.III, pp.422-6.

دوقوں نے اسے بحیثیت دوات تسلیم کیا ہے جس کی شکل سر اٹھائے اکڑوں بیٹھے درندے کی ہے۔" اس دوات کا سر عمدہ لیکن اگلی اور پچھلی ٹانگیں بھونڈی وضع کی ہیں۔ اندر سے خالی ہے اور پشت کی طرف 0.62 انچ کا چکردار منہ ہے۔"

"اس میں کافی مقدار میں روشنائی آسکتی تھی اور اندر سوف ہوتا تھا جیسا کہ آج کل شرقی دواتوں میں ہوتا ہے تاکہ روشنائی کی نمی ختم نہ ہو۔ یہ درست ہے کہ اس میں روشنائی کے داغ دھبے نہیں پائے جاتے ہیں۔ لیکن زمانۂ قدیم میں روشنائی میں دھبے ڈالنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ وہ سوکھنے کے بعد بھی فوراً مٹ سکتی تھی۔ ہمیں توقع کرنی چاہیے کہ موہن جو دارو کے باشندے روشنائی استعمال کرتے تھے جس چیز پر یہ لوگ مخطوطات اور خطوط وغیرہ لکھتے تھے یعنی لکڑی اور درخت کی چھال وغیرہ وہ فنا ہو گئے ان پر دھات کے قلم کے نشانات نہیں بن سکتے تھے۔" (پلیٹ VI)

تین دواتیں روشنائی کے دھبوں کے ساتھ ہری نرائن پور ضلع چوبیس پرگنہ مغربی بنگال میں پائی گئی ہیں (پلیٹ VII) داہنے کونہ پر رکھی ہوئی دوات کا غالب رنگ بھورا ہے اور سفیدی مائل چاک کی دھاری ہے۔ دوسری دو دواتیں ہیں جو مسیحی عہد سے پہلے کی ہیں اور ان کیساتھ سکے اور موتی ملے ہیں جو دوسری صدی یا پہلی صدی قبل مسیح کے آخر کے ہوں گے۔

ٹیکسلا میں مٹی کی اور تانبے کی بنی ہوئی مختلف سائز اور وضع کی کئی دواتیں ملی ہیں۔ ان میں تانبے کی دواتیں قابلِ ذکر ہیں جن میں سانپ کی شکل کا دستہ ہے اس میں زنجیر کے ساتھ ڈھکن لگا ہوا ہے (پلیٹ VIII)

سرجان مارشل نے اپنی رپورٹ ٹیکسلا جلد دوئم میں ان تمام دواتوں کا بیان تفصیل کے ساتھ کیا ہے جو پہلی صدی عیسوی کی ہیں۔ ٹیکسلا میں دریافت شدہ ایک دوات میں کالی روشنائی مٹی کے ساتھ ملی ہوئی پائی گئی۔[120]

اس کے بعد کے زمانہ میں قلمدانوں کو مسی بھجنم[121] (Masibhajnam) مسی پترا، مسی بھنڈا، مسی کپکا، مسی مانی، ملامندا، میلندھوا اور میلین ڈھو کا ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔[122]

---

119. Further excavations of Mohenjodaro, Mackay, Vol.1, p.188, (No.23 in plate LXVI).

120. Taxila, Marshall, Vol 2.pp422-23 and 597

121. Mudra-Rakşasa. Conto 1.

122. Indian Paleography, Buhler, p.91

عہد سلطنت میں لفظ دوات استعمال ہوا ہے اور محمد تغلق کے دوات کے محافظ کو دوات دار کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔[123]

پرکار، مسطر وغیرہ

کنڈلیوں و جنم پتروں کے دائرہ بنانے اور باب کے خاتمہ پر کنول کے پھول بنانے کے لیے لوہے کا پرکار استعمال کیا جاتا تھا۔ بعض اوقات چپٹا کیے لوہے کے قلم ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے دائرے اور قوسین کھینچنے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے (پلیٹ ۷)۔[124]

مسطر پیمانہ یا ریکھا پٹی یا ساس پٹی سیدھی لکیریں یا متوازی خطوط کھینچنے کے لیے استعمال کئے جاتے تھے۔ مسطر لکڑی یا دفتی کا بنا ہوتا تھا اور مقررہ فاصلہ پر اس میں لکیریں بنی ہوتی تھیں۔ ایسے مسطر کے دو فوٹو مندرجہ ذیل کتابوں میں ملتے ہیں:

(1) 1,3,66 and Anzuger d.w.Akademic 1897, No. VIII

(2) Aneedola Oxoncinsia Aryan Series.

"سی کلم (C. KLEMM) کے ایک خط مورخہ ۲۱ اپریل 1897ء میں جو (ETHNO-LOGICAL MUSEUM, BERLIN) میں محفوظ ہے دو نمونے ملتے ہیں ایک کلکتہ کا ہے جس پر نوین پتر لکھا ہے اور ایک مدراس کا ہے جس پر کدوگو (KIDUGU) تحریر ہے"۔[125]

کاغذ

یہ ایک عام نظریہ ہے کہ سب سے پہلے کاغذ 105ء میں چین میں بڑے پیمانہ پر بنایا گیا۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان کے باشندے کاغذ کے استعمال سے اور روئی سے کاغذ بنانے کے فن سے مسیحی دور سے کبھی پہلے سے واقف تھے۔ اس بات کی تصدیق

---

123. A History of the Qaraunah Turks in India-Iswari Prasad, s.276

124. Prachin Lipimala, Ojha, p. 157.

125. Indian Paleography, Buhler, p. 92

یونانی مصنف نیرکوس کی تحریر سے ہوتی ہے نیرکوس نے 327 قبل مسیح میں ہندوستان کا دورہ کیا ہے[126]

اٹسنگ چینی سیاح نے ساتویں صدی کے آخر میں ہندوستان کا دورہ کیا۔ اس نے لکھا ہے کہ "پجاری اور عام آدمی مٹی سے مورتیاں بناتے تھے یا مہاتما بدھ کی تصویر کاغذ یا ریشم پر چھاپتے تھے اور چڑھاوے چڑھاکر اس کی پوجا کرتے تھے"[127]

اس بیان سے بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ کاغذ ایک کمیاب چیز تھی اور ساتویں صدی میں ہندوستان میں خاص مذہبی مقاصد کے لیے اس کا استعمال ہوتا تھا۔

اس کمی کے باعث اٹسنگ نے چین سے کاغذ منگوایا جیسا کہ اس کی لکھی مندرجہ ذیل سطور سے واضح ہوتا ہے:۔

"میں دریائے بھوگ کے کنارے پر گیا کہ کسی تاجر کے ذریعہ کوانگ سے چو(کوانگ ٹنگ سے) کو پیغام بھیج سکوں، دوستوں سے ملوں اور درخواست کروں کہ کاغذ اور روشنائی کی ٹکیاں مجھے بھیجی جائیں تاکہ برہم سوتروں کی نقل کی جاسکے اور نقل نویسوں کی اجرت دی جاسکے"[128]

اگرچہ ہندوستان میں کاغذ سازی تیسری صدی قبل مسیح میں ہی تھی لیکن اسے بطور سامان تحریر استعمال نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ یہ گرم مرطوب آب وہوا میں زیادہ دن نہیں چل پاتا نیز دوسرے سامانِ تحریر آسانی سے مہیا تھے مثلاً کھجور کی پتیاں، بھوج پتر وغیرہ۔

کاغذی تحریروں کے ابتدائی نمونے وسطی ایشیا کے کاشغر اور کوگیر مقامات سے حاصل ہوئے ہیں وہ پانچویں صدی عیسوی کی گپتا طرز تحریر میں مرقوم ہیں[129] یہ بتانا مشکل ہے کہ جو کاغذ ان میں استعمال ہوا ہے وہ ہندوستان کا بنا ہوا ہے:

مندرجہ ذیل شواہد سے واضح ہوجائے گا کہ ہندوستان میں 1000ء سے کاغذ برابر

---

126. Strabo. (L, C. XV, 117).

127. I-Tsing's records (Takakusu) p. 150

128. I-Tsing's records, (Takakusu) p. XXXIV.

129. Indian Paleography, Pandey, p. 70

استعمال ہوتا رہا ہے۔

ایم اے۔ اسٹین (M.A. Stein) اپنے جموں مخطوطات کے کیٹلاگ میں (1894) کاغذ پر لکھی قلمی کتاب "ستپتا برہمنا" (SATAPATHA BARAHMANA) مورخہ 1089ء کا ذکر کرتا ہے۔[130]

بوہلر (BUHLER) اپنی انڈین پیلوگرافی میں سب سے قدیم کاغذی مخطوطہ مورخہ 1223-24ء کا ذکر کرتا ہے جو گجرات سے حاصل ہوا تھا۔[131]

بھاگوت کے کاغذی مخطوطے مورخہ 1310ء کا حوالہ (Gough) گف کے ایک مقالہ میں ملتا ہے۔[132] بڑودہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پونا میں ایک کاغذی مخطوطہ طب پر ہے اور اس کا نام وانگ دتا ویدیا (Vangadatta Vaidya) ہے۔ اس کو ونگ سین (Vangasena) نے تحریر کیا تھا اور یہ 1320ء کا ہے۔[133] 1345-50ء میں محمد تغلق نے ہندوستان میں کاغذی سکہ کا آغاز کیا۔ ہمیں لفظ "کاگد"[134] مراٹھی مخطوطہ مورخہ 1395ء میں اور جین مخطوطہ رسبھدیو چرتا (Rasbhadeva Charita) مورخہ 1396ء میں ملتا ہے جو کاغذ کے لیے استعمال ہوا ہے۔[135]

پروفیسر کپاڈیا لکھتے ہیں:۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاغذ سب سے پہلے گجرات میں کمار پال (1143 – 74 A.D.) اور دستوپال کے عہد میں استعمال ہوا جیسا کہ JINAMANDANGANI کی KUMARPALA-PARBHANDA سے اور RATNAMANDAGANI کی کتاب اپدیش ترنگنی UPADESATARANGINI سے ظاہر ہوتا ہے۔"[136]

---

130. Catalogue Jammu Mss. 1894, p.8
131. Indian Paleography, Pandey, p. 70
132. Gaugh's papers, p. 74
133. Baroda Oriental Research Institute, Poona; (Govt. Mss. Library, No. 352 of 1879-80).
134. Shiva Charita Manasa, Khanda 7 (Poona, 1936).
135. Prasasti Samgraha, A.M. Shah, Ahmedabad, 1937
136. B.U.J. May, 1936, p. 105.

۱۴۰۰ء میں ہندوستان میں بنگال اور دوسرے مقامات پر کاغذ بڑے پیمانہ پر بنایا جاتا تھا۔[137] سلاطین کشمیر نے پندرھویں صدی میں کاغذ سازی کی تعلیم کے لیے ایک تکنیکی اسکول قائم کیا تھا۔[138] لیکن زمانہ قدیم سے ہی دیسی کاغذ بنانے کے مرکز موجود تھے جو اب تک ملک کے کچھ حصوں میں اپنے ڈھنگ سے کام کر رہے ہیں چاول یا گیہوں کی لگدی کو پتلے تختوں پر پھیلا دیا جاتا ہے اور خشک ہونے کے بعد گھونگے سے یا چکنے پتھر سے ان پر پالش کر دی جاتی ہے۔[139]

باوجود اس حقیقت کے کہ کاغذ دوسرے سامانِ تحریر کی طرح ناپائیدار تھا۔ مغلوں نے اس کو بغداد و قاہرہ کی روایات کی پیروی میں رائج کیا۔[140] کاغذ کے استعمال کو عہد مغلیہ میں ایسا عروج حاصل ہوا، اُسے "کاغذی راج" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔[141]

مغلیہ دور میں عمدہ قسم کا کاغذ کشمیر، سیالکوٹ، لاہور، راج گیر، اورنگ آباد اور احمد آباد میں تیار کیا جاتا تھا۔[142] سیالکوٹ عمدہ قسم کے کاغذ مثلاً مان سنگھی اور ریشمی کاغذ کے لیے مشہور تھا۔ انکی ساخت اچھی تھی وہ زیادہ پائیدار ہوتا تھا۔[143]

مغل بادشاہ کشمیر کے بنے ہوئے عمدہ کاغذ کو بہت پسند کرتے تھے۔ یہ کاغذ بوسیدہ کپڑوں اور سن کے ریشوں کو چاول کی پیچ میں گھول کر بنایا جاتا تھا۔ بہترین کاغذ شہزاد پور میں تیار کیا جاتا تھا اور دوسرے ملکوں کو برآمد کیا جاتا تھا۔[144] عام استعمال کے لیے معمولی قسم کا کاغذ بھی ہوتا تھا۔ کاغذ بنانے کے ایسے بہت سے مرکز جن کو کاغذی پورہ کہا جاتا تھا مغل راجدھانیوں کے پاس ہی واقع تھے۔[145]

---

137. J.R.A.S.B. 1898, pp. 529-33.
138. Kashmir Under the Sultans, Mohibbul Hasan, p.241.
139. Prachina Lipimala, p. 144.
140. Memoirs of Babur (Erksine) 1826,p. 92
141. Mughal Administration, J.N. Sarkar (4 ed),p. 10
142. I.A., Vol. 8, No. 1, p. 43.
143. India of Aurangzeb, J.N. Sarkar, 1901, p. 95
144. Travels, in Europe and Asia, Petumundy, V.II, p. 98
145. I.A., Vol. 8, No.1, p. 43.

کاغذ بنانے کے لیے جو کچا مال استعمال ہوتا تھا ان میں درختوں اور جھاڑیوں کی چھال اور پرانے کپڑے وغیرہ شامل تھے۔ ان کو لکڑی کی موسل سے کوٹا جاتا اور کئی دن تک پانی میں ڈبو دیا جاتا۔ جب لگدی تیار ہو جاتی تو اس کو تھوڑے پانی کے ساتھ ایک ایسے بڑے برتن میں ڈالا جاتا جس میں چونے کا کچھ حصہ موجود ہوتا اور اس کو کوٹنے پیسنے کا سلسلہ جاری رکھا جاتا۔ ببول کے درختوں سے حاصل کردہ گوند اور پھٹکری اسی بڑے برتن میں گھول دیے جاتے تھے۔

کاغذ بنانے والے کاریگر بانس کے بنے ہوئے سانچوں میں یہ لگدی اٹھاتے اس طرح کاغذ کے تختے تیار ہو جاتے پھر ان کو سکھانے کے لیے ٹانگ دیا جاتا تھا۔

مغلوں کے کاغذ کے استعمال نے کافی حد تک مراٹھوں کو متاثر کیا۔ شواجی کے خزانوں کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ گیارہ ہزار زرافشاں دستے یعنی سنہرے کاغذ کے، بیس ہزار دستے بالاپوری کاغذ کے، دو ہزار دستے دولت آبادی قسم کے کاغذ کے اور پینتیس ہزار دستے سفید کاغذ کے موجود تھے یہ رپورٹ ان کے بیٹے شمبھوجی کے حکم کے مطابق تیار کی گئی تھی۔[146]

انگلش OVINGTON نے اپنی ایک کتاب سفرنامہ سورت مورخہ 1689 میں لکھا ہے کہ معمولی ہندوستانی کاغذ چکنا اور چمکدار ہوتا تھا۔ لیکن سنہرا سجا ہوا کاغذ جس پر کہیں کہیں پھول بکھرے ہوتے تھے، بادشاہوں نوابین اور امراء کو مخاطب کرنے میں استعمال کیا جاتا تھا۔[147] کاغذ کو چکنا بنانے کیلیے گوندہ ہندوستانی روشنائی ملائی جاتی تھی۔

دیسی کاغذ بنگال کے مختلف علاقوں میں بنتا تھا مثلاً کلکتہ، دیناج پور، پٹنہ، گیا، اور شاد آباد یہ سلسلہ 1793ء سے 1833ء تک جاری رہا۔

گیا کے علاقہ میں ارادل کا مقام عمدہ قسم کا کاغذ بنانے کے لیے مشہور تھا۔ ارادل کا ہر ایک کاغذ بنانے والا سال میں تقریباً سو رم (REAMS) بناتا تھا جو تین۔ چار روپے فی رم (REAM) کے حساب سے فروخت ہوتا۔ سن اور پٹ یعنی جوٹ وغیرہ کاغذ بنانے کے خاص اجزاء تھے۔[148]

لیکن جنوبی ہند میں کاغذ سازی کی ایک مختلف ہی تصویر نظر آتی ہے۔ اٹھارھویں صدی

---

146. I.A., Vol. 8, No.1, p. 43.

147. I.A., Vol. 8, No.1, p. 43.

148. Economic Transition in the Bengal Presidency (1793-1833), Hari R. Ghosal, Patna University 1950, P.16 ff.

کے آغاز میں عیسائی مشنریوں نے اپنے مذہب کی ترویج میں کتابوں کی اشاعت کو بوجہ کمی کاغذ سخت مشکل پایا۔ اس بیان کی تصدیق مندرجہ ذیل اقتباس سے جو ڈنمارک کے ایک مشنری بارتھولمیو زیگنبالگ (BARTHOLEMEN ZIEGENBALG) کے خط سے لیا گیا ہے ہو جائے گی۔ یہ مشنری پادری ہندوستان میں 1706ء میں آیا۔ خط 14/جون 1709ء کا لکھا ہوا ہے اور حسب ذیل ہے:-

"مقامی باشندے نہ کاغذ استعمال کرتے ہیں نہ چمڑا نہ روشنائی نہ قلم بلکہ وہ لوہے کے اوزار سے ایک خاص درخت کی پتیوں پر نقوش کھود دیتے ہیں۔ یہ درخت تاڑ کے درخت سے مشابہ ہے۔[149] اس نے 3/جنوری 1714ء کو دوبارہ لکھا "کاغذ کی کمی نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ احساسات کو خطوط کی حد تک رکھیں"۔

کاغذ کی کمی کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے زیگن بالگ ZEIGENBALG کا خط مورخہ 16/جنوری 1716ء ہمیں مندرجہ ذیل معلومات فراہم کرتا ہے:-

"اب ہم مشن کے مفاد کے پیش نظر کاغذ کا ایک کارخانہ بنانے میں مصروف ہیں۔ ہمارے معزز گورنر اور میں مل کر آدھا خرچ اٹھاتے ہیں اور آدھا خرچ مشن اٹھاتا ہے۔ لکڑی کا کام ختم ہو گیا ہے چند دن بعد ہم تعمیری کام شروع کریں گے۔ اگر خدا نے اس ڈیزائن کو کامیابی بخشی تو مشن اور ہندوستان دونوں کے حق میں یہ مفید ہوگا"۔[150]

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں کاغذ سازی چینی ایجاد سے پہلے معروف تھی لیکن قدیم ہندوستان میں چند اہم مشکلات کی وجہ سے کاغذ کا استعمال اتنا عام نہ تھا۔ 1000ء سے کاغذ کے استعمال میں برابر اضافہ ہوتا گیا اور کاغذ سازی کی صنعت عہد مغلیہ میں اپنے عروج پر پہنچی۔

کاغذ سازی انیسویں صدی کے وسط تک شمالی ہندوستان میں فروغ پاتی رہی لیکن یوروپی باشندوں نے جب کاغذ کی ملیں قائم کیں تو دیسی کاغذ سازی ختم ہو گئی چنانچہ کاغذ کے کارخانوں کی

---

149. Propagation of the Gospel in the East, 3rd Ed.1718, Part II, p. 17.

150. Propagation of the Gospel in the East, 3rd Ed.1718, Part II, p. 17

ابتدا ہندوستان میں کاغذ سازی کی تاریخ کا ایک نیا باب ہے۔

کاغذ کے اسٹینسل (STENCILS)

ہندوستان میں عہد وسطیٰ میں کاغذ کے اسٹینسل Stencils استعمال ہوتے تھے۔ اس کے نمونے دلیجہ چاریہ فرقے کے دشنو مندروں میں ملتے ہیں جو شمالی اور مغربی ہندوستان میں ہیں۔ ایسا ایک نمونہ اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کلکشن بڑودہ Oriental Institute Collection Baroda میں نمبر 1305 میں محفوظ ہے۔ اس Stencil میں دس پرت ہیں اور اس کا نفس مضمون سنسکرت گیت گووند ہے۔ ہر ایک پرت کا سائز "4 × "9½ ہے۔ اس میں رقبۂ تحریر "2¾ × "7½ ہے اور باقی جگہ چاروں طرف حاشیہ کے لیے چھوڑی گئی ہے۔ ان اوراق کو صرف ایک طرف پڑھا جا سکتا ہے جیسے سوراخ کرکے ڈیزائن اور مصوری ہوتی ہے۔

ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسٹینسل پر لکھنے والے خطاط کا نام اور پتہ موجود ہے۔ اس فنکار کا نام دیو کرشن تھا وہ ایک برہمن تھا اور ناٹا پدرا کا باشندہ تھا۔ ناٹا پدرا کا موجودہ نام نادریاد ہے جو وسطی گجرات کے کیرا ضلع میں واقع ہے۔

ان اسٹینسلوں کے بارے میں مسٹر ایم آر موجمدار ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ اسٹینسل خشک رنگوں کے ذریعہ چکنی سطح پر عارضی تصویر بنانے کے کام میں لائے جاتے۔ ان کا مقصد تھا کہ کاغذ، کپڑے یا نرم دیوار پر وہ ڈیزائن اتار لیا جائے جو اسٹینسل میں سوراخ کرکے پہلے بنایا ہوا ہے۔

باب ہفتم

مخطوطات اور کتابوں کی جلد سازی کی تاریخ

کتاب اور مخطوطہ کی تکمیل میں فن جلد سازی کی تاریخ ایک دلچسپ باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ مخطوطہ یا کتاب کو محفوظ کرنے اور استعمال میں لانے کے لیے جلد سازی ایک لازمی شئے ہے کیونکہ کتاب لکھنے اور اس کو باتصویر کرنے میں مہینوں لگ جاتے ہیں۔ جلد سازی کی داستان ہر دور اور ہر ملک میں مختلف رہی ہے۔

زمانۂ قدیم میں لوگوں نے ڈھکنے کی افادیت کو پہچان لیا تھا اسی وجہ سے وہ مٹی کی ٹکیوں کو مٹی کے بنے ہوئے لفافوں میں اور پیپرس Papyrus (درخت کی چھال) کے مخطوطوں کو لکڑی کے بنے ہوئے ڈبوں میں رکھتے تھے۔

قدیم ہندوستان میں کاغذ کی ابتدا سے پہلے کتابیں عام طور سے کھجور کی پتیوں، برچ (Birch) کی چھال یا تانبہ کی تختیوں پر لکھی جاتی تھیں۔ کھجور کی پتیوں کے مخطوطے جو ہندوستان میں پائے جاتے ہیں ان کو اس طرح یکجا رکھا گیا ہے کہ یا تو درمیان میں ایک سوراخ کر کے یا ہر پتی کے داہنے بائیں سرے پر دو سوراخ کر کے باندھا گیا ہے۔ دو سوراخ لمبی پتیوں والے مخطوطوں میں کیے گئے ہیں (پلیٹ ١×) پتیوں کو دو لکڑی کے تختوں کے درمیان تختی سے اور سوراخوں کے درمیان سے ڈوری ڈال کر ان کو یکجا رکھا گیا ہے۔ پھر ان کو کپڑے یا ریشم میں باندھ دیا گیا ہے۔ ایسے سب سے

بڑے مخطوطے کا سائز "2½ × "36 اور سب سے چھوٹے کا سائز "1½ × "4½ ہے[1]۔ مخطوطوں کو رکھنے والے لکڑی کے کچھ ڈبوں کو پھول یا جامیٹری کے ڈیزائن بنا کر سجایا گیا تھا یا رنگین نقاشی کے ذریعہ مرصّع کیا گیا تھا ان پر پالش (Varnish) کی جاتی تھی یہی طریقہ یوروپ میں صلیبی جنگوں سے پہلے رائج تھا۔

اس کتاب کے مصنف کے ذخیرۂ کتب میں کھجور کی پتیوں کا ایک مخطوطہ ہے جس میں بارہ پتیاں ہیں ان پر دس دیوتاؤں کی تصویریں اور ان سے متعلق اشعار ہیں۔ استعمال کی آسانی کے لیے پہلی اور دوسری پتی کے سروں کو سی دیا جاتا ہے اور پورے مخطوطے میں یہی طریقہ دہرایا جاتا ہے اس طرح مخطوطہ بآسانی جیب میں لے جایا جا سکتا ہے۔

مخطوطوں کو موسمی اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے ڈوری سے خوب کس کر کے باندھا جاتا تھا تاکہ ان میں ہوا داخل نہ ہو سکے۔ بنگالی میں ایک کہاوت[2] ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مخطوطات کی حفاظت بیٹے کی طرح کرنا چاہیے اور اس کو دشمن کی طرح سخت باندھنا چاہیے۔ جنوبی ہند میں اور چند دوسرے حصّوں میں ڈھکنے یا سرپوش میں بھی سوراخ کر دیئے جاتے تھے تاکہ ڈوری ان میں سے گزر سکے۔ مغربی ہند کی جین لائبریریوں میں مخطوطوں کو سوتی کپڑوں کے تھیلوں میں بند کر کے دھات کے صندوقوں میں رکھا جاتا تھا۔ صرف نیپال میں قیمتی مخطوطوں کو بیل بوٹے بنے دھات کے صندوقوں میں رکھا جاتا تھا۔

عام طور سے مخطوطے رکھنے والے ڈبے سال یا ساگون کی عمدہ لکڑی سے بنائے جاتے تھے کٹھل کی لکڑی سے بنے تختے بھی پائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بید اور کھال کے بنے ہوئے کیس بھی ہوتے تھے لیکن چمڑے وغیرہ کے کیس بہت کم ہیں[3]۔

آسام میں سانپوں کی دیوی سے متعلق داستان یا بیہولا (Behula) کے واقعات کے مخطوطوں کو سانپ کی کھال میں لپیٹ کر رکھا گیا تھا[4]۔

ساچی کے درخت کی چھال یا ایلوے کی لکڑی کو آسام میں سامانِ تحریر کے طور پر استعمال کیا

1. I.A., Vol. I, p. 233.
2. Punthi Parichaya, Visva-Bharati. Vol.I, p.8
3. Punthi Parichaya, Visva-Bharati. Vol.I, P.8
4. Descriptive Catalogue of Assamese manuscripts, Barua, P.XV.

جاتا تھا جو پتیاں لکھی ہوئی پتیوں کی بہ نسبت موٹی ہوتی تھیں ان کو جلد کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔[5]

برچ کی چھال (Birch) کے مخطوطوں کو قدیم انداز سے لپیٹ کر رکھا جاتا تھا عام طور سے لمبی برچ کی پٹیوں کو مخطوطے لکھنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور حفاظت کے خیال سے انکو پلندہ بنا کر رکھا گیا ہے کیونکہ موڑنے سے چھال آخرکار ٹوٹ جاتی۔

سب سے قدیم برچ (Birch) چھال کا مخطوطہ وسطی ایشیا کے کھوتان (Khotan) مقام پر پایا گیا جس شخص نے اس کو تلاش کیا اس نے دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک تو فرانسیسی مشن (Dutreuil de Rhines) کے ہاتھ سنہ 1892ء میں[6] اسے فروخت کر دیا۔ اور دوسرا روسی کونسل پٹروسکی Petrovsky کو کاشغر[7] میں دے دیا۔ یہ مخطوطہ برچ چھال کی لمبی پٹیوں پر تحریر تھا جنھیں کناروں پر ایک سینٹی میٹر دھاگہ سے سی کر یکجا کر دیا گیا تھا۔

دوسرا برچ چھال کے پلندہ نما مخطوطہ کا اہم نمونہ نیشنل لائبریری پیرس (Bibliotheque Nationale) میں محفوظ ہے۔[8] یہ بھگوت گیتا کا قلمی نسخہ ہے اس کی لمبائی 1760 ملی میٹر اور چوڑائی 45 ملی میٹر ہے۔

برچ چھال پر لکھے مخطوطے جنکو کھجور کی پتیوں کے سائز میں کاٹ لیا جاتا ہے اتنے نادر دکھائی نہیں ہیں۔ بودر مخطوطہ (Bower Mss) جسے روڈالف ہوئرنل (Rudolf Hoernle) نے شائع کیا بودھی مخطوطے جو بامیان (Bamiyan) میں سنہ 1930ء میں اور گلگٹ میں سنہ 1931ء میں دریافت ہوئے ایسے مخطوطوں کی اہم مثالیں ہیں۔

چھال کے مخطوطے جنھیں کھجور کی پتیوں کی شکل میں تراشا جاتا تھا درمیان میں خالی چھوڑ دیے جاتے تھے کیونکہ اس حصہ میں سوراخ کر کے ڈوری ڈال دی جاتی تھی۔ چھال والے مخطوطے بھی کھجور کی پتوں والے مخطوطوں کی طرح سے لکڑی کے تختوں کے درمیان رکھے جاتے تھے۔

---

5. Descriptive Catalougue of Assamese manuscripts, Barua, p.XV.
6. I.A., Vol. I, p. 103
7. I.A., Vol. I, p. 103
8. I.A., Vol. I, p. 103

برج چھال کے اوپر لکھے جدید کشمیری مخطوطے شاردا رسم الخط میں لکھے ہوئے ہیں۔" اسکے
اوراق لمبوترے نہیں ہیں جن کی سطریں چوڑے حصہ کی طرف متوازی جاتی ہوں بلکہ مستطیل شکل کے ہیں
اور سطریں تنگ حصہ کی طرف متوازی جاتی ہیں ان میں ڈوری ڈالنے کے لیے سوراخ نہیں ہیں بلکہ..
انھیں ایرانی اور کشمیری کاغذی کتابوں کی طرح جلد کی شکل دی گئی ہے۔ اوراق کو موڑ کر ایک دوسرے
کے اندر رکھا گیا ہے اور چھوٹے بنڈل بنائے گئے ہیں اوراق کے جوڑوں میں سے دھاگہ ڈال کر
سخت چمڑے کی جلد سے ملحق کر دیا گیا ہے لیکن چھال کو جب موڑ دیا جاتا ہے تو وہ ٹوٹ جاتی ہے
اسی لیے قدیم مخطوطے ہم تک الگ الگ اوراق کی شکل میں پہنچے ہیں۔[9] لیکن کاغذی کتابوں سے انکی
شکل مختلف ہے۔

ونا پروان (VANA PARVAN) مہابھارت مخطوطہ جو شمالی مشرقی ہند میں فاؤچر مشن
(FOUCHER MISSION) نے فراہم کیا اور نیشنل لائبریری (BIBLIOTHEQUE NATIONALE)
میں ہے اور اتھروید کا مخطوطہ جو (PAIPHALADA) کا تصحیح شدہ اور توبنجن یونیورسٹی TUBINGEN
میں دونوں اپنی اپنی شکل میں مختلف ہیں۔ اول الذکر کا سائز 25 سینٹی میٹر ×30 سینٹی میٹر ہے اور
...آخر الذکر کا سائز 20 ملی میٹر × 25 ملی میٹر ہے۔[10]

تانبہ کی تختیوں کو بھی اس ملک میں وسیع طور پر سامان تحریر بنایا گیا اور بعض اوقات ایک
مخطوطہ کے لیے ایک سے زیادہ تختیاں استعمال کی گئیں۔ ان تختیوں میں سوراخ کر کے تانبے کے تار
سے انھیں باندھا جاتا تھا۔ عام طور سے یہ سوراخ بائیں مرکزی کنارے پر کیا جاتا۔ سوراخ ½" ہوتا
اور چوڑی کا اوسط قطر "4 ہوتا۔ جن مخطوطوں میں کئی تختیاں ہوتی تھیں انکو یکجا رکھنے کے لیے بعض اوقات
دو چوڑیاں بھی استعمال کی گئیں۔ یہ چوڑیاں دھاگہ یا ڈوری کا کام انجام دیتی تھیں پہلی اور دوسری تختیوں
کے اوپر اور نیچے کے حصوں سے گزرتی تھیں اسی طرح تمام تختیوں کے ساتھ عمل کیا جاتا۔ یہ طریقہ
اس لیے اختیار کیا گیا تھا کہ پڑھنے والوں کو آسانی ہو۔[11] (پلیٹ x)

بعض اوقات ایک کتاب پانچ چھ تانبے کی تختیوں پر مشتمل ہوتی اور ان میں سے چوڑیاں گزاری

---

9. I.A., Vol. 1, p. 103
10. I.A., Vol. 1, p. 103
11. D.I. Vol. I, p. I

جاتی ہیں جن کے دونوں سروں کو ٹانکے کے ذریعہ جوڑ دیا جاتا اور اس طرح وہ یکجا رہتے۔ پہلی اور آخری تختی کی باہری سطح کو خالی رکھا جاتا اور وہ جلد کا کام دیتیں۔ تختیوں کے سروں کو ابھار دیا جاتا تھا تاکہ تختیوں پر ابھری ہوئی تحریر محفوظ رہے۔ مثال کے طور پر تین تانبے کی تختیوں پر لکھے کتبات کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

(1) اننت ورمن چوڈ گنگ دیو (سی۔ پی نمبر 6 سنہ 19-1918ء) کی تانبے کی تختیوں کے سیٹ (set) میں تین تختیاں ہیں جنھیں گول چھلّے کی مدد سے یکجا رکھا گیا ہے۔ ان میں سوائے پہلی تختی کی باہری سطح کے تمام تختیوں پر دونوں طرف تحریر ہے اوپری حصہ جلد کے طور پر ہے ۔[12]

(2) شرقی گنگا کے بادشاہ مدھوکرنو دیو (Madhukamarnava Deva) (سی۔ پی نمبر 5 سنہ 19-1918ء) کی تانبا کی تختیوں کے سیٹ (Set) میں تین تختیاں ہیں ان میں پہلی اور تیسری تختی پر تحریر نہیں ہے اس لیے وہ جلد کا کام دیتی ہیں ۔[13]

(3) راجا راجا اول (سی۔ پی نمبر 4 سنہ 19-1918ء) اور وجرہستا (Vajrahasta) مشرقی گنگا کے بادشاہ سی۔ پی نمبر 3 سنہ 19-1918ء کی تانبا کی پلیٹوں کے سیٹ میں بالترتیب پانچ اور چھ تختیاں ہیں۔ اوّل الذکر کی باہری سطح پر تحریر نہیں ہے اور آخری یعنی پانچویں تختی کی تحریر مٹادی گئی اس لیے وہ جلد کا کام دیتی ہیں ۔[14] جبکہ آخرالذکر میں پہلی تختی کے اوپری حصہ پر تحریر نہیں ہے اور آخری یعنی چھٹی تختی مٹائی ہوئی پلیٹ ہے جو جلد کا کام دیتی ہیں ۔[15]

راجندر چولا اوّل (1044-1012) کا ترودلنگڈو (Tiruvalangadu) فرمان 31 بڑے اوراق پر مشتمل ہے اور راجندر چولا اوّل کا کرنڈی (نزد تنجور) فرمان 55 بڑے اوراق پر مشتمل

---

12. J.A.H.R.S. Vol. VIII, p. 191
13. J.B.O.R.S. VOL. XVIII, pt.3, pp. 272-295.
14. J.A.H.R.S., Vol.VIII, pp. 164-167.
15. J.A.H.R.S., Vol.VIII, pp. 164-167.

ہے۔ ان دونوں کو چھلّوں سے باندھ کر یکجا رکھا گیا ہے۔[16]

جب سے ہندوستان میں کاغذ کی ابتدا ہوئی، کتاب کاغذ کے اوراق کو جمع کر کے بنائی گئی۔ ان اوراق کو ترتیب سے لگا کر سی دیا جاتا تھا تاکہ یکجا رہ سکیں کتاب کی پشت پر دو یا اس سے زیادہ چمڑے کے تسمے ہوتے تھے جن کے گرد یہ سلائی ہوتی تھی۔

شروع زمانہ میں عام طور پر مخطوطہ کو دو لکڑی کے ڈھکنوں میں رکھا جاتا تھا لیکن مزید آسانی کے خیال سے پھر یہ مناسب سمجھا گیا کہ کتاب اور تختوں کو اس طرح یکجا کر دیا جائے کہ کتاب کے جزوں کو تختوں سے جوڑ دیا جائے۔ اس کے بعد تختے کو ڈھکنے کے لیے چمڑا استعمال کیا گیا۔

ہندوستان میں قدیم کتابیں ایک ہی لمبے کاغذ کے ورق پر ہوتیں جسے لپیٹ دیا جاتا اور موڑ کر جزو بنا لیے جاتے تھے۔ ان اوراق کو اس طرح یکجا رکھا جاتا تھا کہ نیلے رنگ کا دھاگہ تختوں کے درمیان سے گزارا جاتا۔ جزوں کو لچکدار پٹیوں پر سی دیا جاتا اور تسمے کتاب کی پشت سے زاویہ قائمہ پر ہوتے۔ کتاب کے اوراق کو تختوں پر رکھنے سے پہلے سی دیا جاتا تھا۔

مسلم عہد حکومت میں ہم دیکھتے ہیں کہ مخطوطے کاغذ پر لکھے جاتے تھے مگر ان کا سائز کھجور کی پتیوں کی طرح ہوتا تھا۔ مجلد کتابیں بھی استعمال میں تھیں جیسے جیسے مسلم بادشاہوں کی طاقت میں اضافہ ہوا عہد مغلیہ میں جلد سازی اور سجاوٹ کو بھی فروغ ہوا۔

عہد مغلیہ میں فن جلد سازی کو خاصا عروج حاصل ہوا۔ ہمایوں جو بابر کا بیٹا اور جانشین تھا جلاوطن بادشاہ کی طرح ایران میں رہا۔ یہ شاہ طہماسپ کا دور تھا۔ وہ دربار طہماسپ کی فنکاری سے بے حد متاثر ہوا۔ جب اسے اپنا تخت و تاج حاصل ہو گیا تو اس نے فن اور دستکاری کی شاہی انداز سے سرپرستی کی اور ایرانی مصوروں اور جلد سازوں کو اپنے یہاں مقرر کیا۔

فن جلد سازی ایتھوپیا حبشہ سے ہندوستان کس طرح آیا یہ ایک دلچسپ داستان ہے، جب مسلم سلطنت مضبوط ہوئی تو یہ فن نقطۂ عروج پر پہنچا۔ مسلم حکومت ہی نے چمڑا پکانے کے کارخانے قائم کیے اور جلد سازی کے لیے بہترین خام مال مہیا کیا۔

فاضل عرب ماہر لسانیات الجاحظ اپنی ایک تصنیف میں لکھتا ہے:-

"حبشہ (ABYSSINIA) کے لوگوں نے عربوں کو مجلد اور چیزوں کے

---

16. I.A., Vol. V, No.1

مجلد کتاب (مصحف) سے روشناس کرایا۔ جلدمیں کتاب کے اجزاء آسانی سے مضبوطی سے اور خوبصورتی سے رکھے جا سکتے ہیں۔ ہمیں اس بیان کی صداقت پر شک نہیں۔ مزید برآں عربی لفظ "مُصحف" یا "مِصحف" حبشہ کی زبان سے لیا گیا ہے۔[17]

جلدسازی کا فن جنوبی عرب میں فروغ پاتا رہا کیونکہ شروع ہی سے جنوبی عرب میں چمڑے کی صنعت ترقی پذیر تھی تقریبًا 570ء میں ایران نے جنوبی عرب کو حبشہ (Abyssinia) کے قبضہ سے آزاد کرالیا تھا اور کافی حد تک وہاں چمڑے کی صنعت کو فروغ دیا۔

ہندوستان میں عہد مغلیہ میں بادشاہوں اور نوابوں نے ایرانی جلدسازوں کو اپنے یہاں ملازمتیں دیں اس لیے کہ یہ لوگ کاغذ اور چمڑے کی چیزوں کے بنانے میں ماہر فنکار ہوا کرتے تھے۔

مسلمانوں کی فتح سے بہت پہلے کشمیر میں چمڑا جلدسازی کے کام آتا تھا۔[18] لیکن قبل اسلام چمڑے کا استعمال اتنا عام نہ تھا۔

مغلوں کے زمانہ سے چمڑا بحیثیت سامانِ جلدسازی کے ہندوستان میں وسیع پیمانہ پر استعمال ہونے لگا۔

مغلوں کی شاہی سرپرستی کی بدولت مُرصع جلدسازی، فن خطاطی اور مصوّر کتابوں کے فن نے حیرت انگیز ترقی کی۔ کتابیں عمدہ زرافشاں دولت آبادی کاغذ پر لکھی جاتی تھیں جن پر سنہری افشاں بکھری ہوتی تھی اور ہر صفحہ کا رنگ الگ ہوتا تھا۔ مغل شہنشاہ اس فن کے بہت ہی قدر دان اور شائق تھے اور اس کی اونچی قیمت ادا کرتے تھے۔

ہمایوں نے تحفۃ السلاطین مصنفہ میر علی کے 2500/- روپے ادا کیے۔ یہ بیان کتاب کے سرورق پر درج ہے۔ نور جہاں نے دیوان مرزا کامران تین سنہری مہروں کے عوض خریدا۔ منعم خاں نے 976 ہجری میں بہادر خاں کو کلیات حضرت شیخ سعدی کے ایک خوبصورت مجلد نسخہ کے لیے 1500/- روپے انعام میں دیے۔ جہانگیر نے یوسف زلیخا کے ایک نسخہ کے لیے 100 مہریں ادا کیں۔[19]

---

17. The Islamic Book, T.W. Arnold and A. Grohmann, p.30
18. The Commercial Products of India, Sir George Watt, p.636
19. Society and Culture in Mughal Age, R.N.Chopra, pp.160-162

اورنگ زیب نے خوبصورت قلمی مجلد نسخۂ قرآن کو -/9000 روپے میں خریدا۔ اس نسخہ کو ہارون بن بایزید نے 1613-14ء میں تحریر کیا تھا اور اب یہ شاہی لائبریری انگلستان میں محفوظ ہے[20]

شاہجہاں نامہ کا قلمی نسخہ محمد امین مشہدی نے لکھا تھا اور اسے پوری طرح سجایا اور باتصویر بنایا گیا تھا۔ اس نسخہ کو لکھنؤ کے نواب نے -/1500 پونڈ میں خریدا۔

1779ء میں لکھنؤ میں مقیم برطانوی وزیر نے اس نسخہ کو لارڈ ٹیگن ماؤتھ (Lord Teign mouth) کے ذریعہ جارج سوئم (George III) کی خدمت میں بھیجا۔ لارڈ ٹیگن ماؤتھ۔ اس وقت ہندوستان میں گورنر جنرل تھے۔ اس شاندار مخطوط کے سر ورق کی ایک رنگین تصویر جرنل آف انڈین آرٹ اینڈ انڈسٹری (Journal of Indian Art & Industry) جلد 5 نمبر 43 میں چھپی ہے (پلیٹ نمبر 69)

ہندوستان کے مسلم عہد میں جلد سازی کو ایک فن کی حیثیت حاصل تھی اور محکمۂ جلد سازی لائبریری کا ایک لازمی جز تھا۔ تقریباً ہر بڑی لائبریری میں دیگر عملہ کے ساتھ حاشیہ بنانے والے اور جلد ساز مقرر کیے جاتے تھے اور قابل جلد ساز بڑے بڑے تنخواہ دار افسران ہوتے تھے۔

مسلم جلد سازوں نے چمڑے کو سجانے کا ایک نیا طریقہ شروع کیا۔ پہلے وہ جلد کے چمڑے کو چھاپتے تھے اور چھپے ہوئے ڈیزائن کے نشیبی حصوں پر سنہرا رنگ لگاتے تھے۔ اس کے بعد ایک اور نیا طریقہ ایجاد ہوا۔ جب رنگ کو مستقل صورت دی گئی یعنی چھاپہ کو گرم کر کے سنہرے ورق کی مدد سے چھاپہ دوبارہ لگا دیا جاتا تھا (پلیٹ XII)

چمڑے سے جلد سازی کے مندرجہ ذیل چار طریقے اور سجاوٹ کے اسلوب جو مسلم عہد میں پروان چڑھے معمولی تبدیلیوں کے ساتھ یورپ کے کارخانوں میں جلوہ نما ہوئے[21]

(1) نازک پھول دار، پیچ در پیچ ڈیزائن بے شمار چھاپوں کی مدد سے چھاپے لیے جاتے ہیں۔

(2) مرکز میں ایک سنہرا نقش اس کے اوپر نیچے اور ہر ایک کونے میں

---

20. J.I.A.I., Vol.5, No.43 (Illus).

21. The Legacy of Islam, Thomas Arnold, p. 146

نشیبی گل بوٹے جنھیں فیتہ یا جھالر وغیرہ سے سجایا جاتا ہے ۔

(3) مرکز میں ایک بیضاوی نوک دار ڈیزائن جس کے کونے چاروں طرف جاتے ہیں ۔

(4) اسی قسم کے ایک ڈیزائن اور کونوں پر سنہری وضع کندہ کی ہوئی ۔

مذکورہ بالا نمونوں کی رنگین تصویریں جرنل آف انڈین آرٹ اینڈ انڈسٹری جلد 5 نمبر 43 میں چھپی ہیں ۔

الور ایک اہم مرکز تھا جہاں جلد سازی کے بہترین نمونے بنائے گئے تھے ۔ نواب الور نے عظیم فن کار قاری احمد اور ان کے دو بیٹوں قاری عبدالرحمن اور عبدالخالق کو ملازم رکھا تھا ۔ قاری احمد پہلے شاہان دہلی کی خدمت میں تھے وہ 1820ء میں راجہ بنی سنگھ کی دعوت پر گلستان سعدی کے قیمتی نسخہ کی جلد سازی کے لیے آئے ان کے بڑے لڑکے نے جن کی تربیت ایران میں ہوئی تھی ، اس نسخہ کے کناروں کی نقاشی میں اپنے باپ کی مدد کی ۔ قاری احمد کے مرنے کے بعد یہ فن ختم ہوگیا ۔ ان کے ہاتھوں میں (عبدالرحمن اور عبدالغفار) یہ فن محض ایک تجارت بنے گا اور انحطاط پذیر ہو جائے گا ۔ عبدالرحمن کے کام میں وہ عیوب نظر آتے ہیں جنھیں پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا ۔

اسی طرح ہندوستان میں بہت سے خوبصورت فنون ختم ہوتے گئے ۔ ایک جوہر قابل کسی فن کو فروغ دیتا ہے ۔ خواہ بیرونی حضرات سے کچھ اشارے حاصل کرکے یا اپنی جودت طبع سے لیکن جلن اور حسد کے باعث یا اپنی اجارہ داری ختم ہونے کے ڈر سے وہ صرف اپنے خاندان کے لوگوں کو فن سکھاتا ہے ۔ افراد خاندان ہوسکتا ہے اتنے ذہین نہ ہوں اور اکثر وہ خالی از صفت ہوتے ہیں ، اس طرح ایک یا دو نسلوں کے بعد فن کا کوئی عنصر باقی نہیں رہ جاتا صرف اس کا سایہ یا مضحک شکل رہ جاتی ہے ۔[22]

مرصع جلد سازی کے فن میں الور کے فنکاروں نے کافی عرصہ تک اپنی روایت کو برقرار رکھا ۔ روایتی فنکاروں کی طرح قاری احمد کے بیٹوں اور پوتوں نے دہی پیتل کے بلاک اور چھاپے استعمال کیے جو انھیں اپنے دادا سے حاصل ہوئے تھے ۔

---

22. J.I.A.I., Vol.5, No.43

اور کے فنکار کتاب کی جلد کو گرولیر (Grolier) کے انداز سے سجاتے تھے جس میں وقتی پر رنگ لگائے جاتے ہیں۔ اس طریقہ میں وضع زیادہ تر پیتل کے بلاکس کے ذریعہ بنالی جاتی ہے پھر برش سے رنگ لگائے جاتے ہیں۔ اور فنکار پورا پس منظر پہلے سے رنگین بنالیتا ہے یا پس منظر کا کچھ حصہ بنالیتا ہے اور پیتل کے ان ہی بلاکس کے ذریعہ عجیب تاثر پیدا کرتا ہے۔

"کتابوں کے کونے (یعنی پتیاں) رنگین وضع سے سجے ہوتے ہیں مثلاً گلستانِ سعدی کا کنارہ خوبصورت رنگین نقوش سے مرقع ہے۔ اس کا بیرونی حصہ نیلی زمین کے ساتھ زرین بنایا گیا ہے۔ اندرونی حصہ پر مختلف موڑ والی زمین ہے اس کی پشت پر سیاہ زمین کے ساتھ سنہرا ڈیزائن بنایا گیا ہے۔ اندر نیلی زمین ہے"۔ [23]

اور کے فن کار جو رنگ استعمال کرتے تھے وہ معدنی تھے اور زیادہ عرصے تک قائم رہتے تھے۔

سترہویں صدی کے آخر میں یورپی لوگوں نے جلد سازی کا نیا طریقہ رائج کیا۔ اس کی تصدیق اونگٹن (OVINGTON) کے حسب ذیل بیان سے ہو جاتی ہے وہ 1689ء میں ہندوستان آیا تھا۔

"وہ لوگ (ہندوستانی) انگریزی طریقۂ جلد سازی کی کچھ کچھ نقل کر سکتے ہیں"۔ [24]

ہندوستان میں جب چھاپے خانے کی ابتدار ہوئی اور بتدریج کتابوں کی اشاعت بڑھی تو جلد سازوں کو نئی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا یعنی کام کی زیادتی سے وہ تکمیل کام میں ناکام رہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد سازوں کے نئے طبقے منظر عام پر آئے اور جلد سازی کا فن تجارت بن کر رہ گیا۔ فن جلد سازی روایتی دستکاروں کے ہاتھ سے نکل کر پیشہ ور جلد سازوں کے پاس پہنچ گیا اور انھوں نے اپنے نام یا نام کے ابتدائی حروف یا مہر کتابوں کی جلد پر لگانی شروع کر دی۔

÷ ÷ ÷

---

23. J.I.A.I., Vol.5, No.43

24. A Voyage to Surat in 1689, Rev.J.Ovington, pp.251-52.

باب ہشتم

کتابوں اور مخطوطوں کو باتصویر اور مطلا منقش کرنا

1 — کتابوں اور مخطوطوں کو باتصویر اور مطلا منقش کرنا۔
2 — مشرقی ہند کے باتصویر مخطوطے
3 — مغربی ہند کے باتصویر مخطوطے
4 — مخطوطوں کے مصوّر بنانے کے فن کی مغل سرپرستی۔
5 — لکڑی اور دھات پر کندہ کاری

1 — کتابوں اور مخطوطوں کو باتصویر اور مطلا منقش کرنا

انسان نے فن مخطوطہ نویسی سیکھنے کے فوراً بعد مخطوطوں کو خوبصورت بنانے پر توجہ صرف کرنا شروع کردی۔ دو طریقے ہیں جن کے ذریعہ مخطوطے اور کتابیں قارئین کو پرکشش نظر آسکتی ہیں۔ اوّل بذریعہ نقوش و گلکاری، دوئم تصویروں نقشوں اور شکلوں کے ذریعہ

مخطوطوں اور کتابوں کی سجاوٹ یہ ہے کہ حروف مطلا، پھولدار ہوں اور ان میں جامیٹری کے ڈیزائن بنائے گئے ہوں اور صفحات کے کنارہ پر رنگین تصویریں بنائی گئی ہوں۔ اس کا مقصد کتاب یا مخطوطے کو سجانا ہے۔ انگریزی کا یہ لفظ لاطینی اور اطالوی فعل "Illuminare" سے نکلا ہے جس کے معنے

ہیں روشنی ڈالنا، روشن کرنا، چمکانا۔ اسی طرح اس کا مقصد کتاب کے نفس مضمون کو واضح کرنا نہیں بلکہ اس کی خوبصورتی اور سجاوٹ ہے

عام طور سے کتاب کو باتصویر بنانے کا فن کتاب میں جو خیالات اور واقعات الفاظ میں پیش کیے گئے ہیں ان کو تصویری شکل دینا ہے۔ کتاب کو باتصویر کرنے والے کا کام خیالات کے اظہار کے لیے دوسرا انداز اختیار کرنا ہے۔

سب سے قدیم باتصویر کتاب جو درخت کی چھال یعنی پیپرس (PAPYRUS) پر ہے، بیسویں صدی قبل مسیح کی ہے۔ اس میں تیس تصویریں ہیں جو تقریبات کے لیے لکھے ڈرامے کو پیش کرتی ہیں۔ یہ ڈرامہ فرعون سیاسٹرس (Pharaoh Sesostris) اوّل کے لیے جو بارھویں پشت میں تھا لکھی گئی تھی۔ دوسرا قدیم باتصویر نمونہ (Book of The Dead) (مُردے کی کتاب) ہے۔ اس کے کئی نسخے پائے گئے تھے۔ اس میں مستطیل لمبوتری پٹیاں ہیں۔ متن کتاب حاشیوں کے اندر ہے اور اوپری حصہ پر بڑی مہارت سے تصویریں گردہ در گردہ بنائی گئی ہیں۔ اس کتاب کی نقول برٹش میوزیم (LOUVRE) لوورے اور برلن یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ پروفیسر کے۔ ویٹزمن (K. Weitzmann) جو Book of the Dead پر مستند ہستی ہیں بتاتے ہیں کہ اس کتاب میں چکردار تصویروں کے سب سے قدیم نمونے ہیں۔

سب سے قدیم یونانی اور رومی باتصویر کلاسیکی کتابیں مصری طرز کے زیر اثر تھیں۔ ایس رنسی من (S. Runciman) لکھتے ہیں کہ اسکندریہ کے نمونے سامنے آئے اور تمام یونانی و رومی دنیا میں ان کی نقل کی گئی۔

مصری، یونانی اور رومی پیپرس (PAPYRUS) کی پلندہ نما کتابوں میں سادی تصویریں ہیں جو کتاب میں دیے گئے واقعات کو ظاہر کرتی ہیں۔

"ایک بار ایک تصویر یا سلسلۂ تصاویر جس سے ادبی، مذہبی یا سائنسی مضمون کا اظہار ہوتا ہے تخلیق ہو گئی تو بعد میں اسی مضمون کی وضاحت کے لیے وہ ایک نمونہ بن گئی۔" اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انجیل، ہومر (Homer) یا دیگر سائنسی اور مذہبی مضامین کے مخصوص نمونے بن گئے اور ان ہی کو ایک کتاب سے دوسری کتاب میں نقل کیا گیا۔

تیسری صدی عیسوی کی یورپی کتابیں پلندہ نہ تھیں بلکہ ان کو موڑ کر سی دیا جاتا تھا اور لکڑی کے تختوں میں باندھا جاتا تھا۔ دو لاطینی مجلد کتابیں جو ورجل (Virgil) کے کلام کے نسخے ہیں اور

ویٹکن (Vatican) لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ایسی باتصویر کتابوں کی سب سے قدیم مثالیں ہیں۔ یہ نسخے چوتھی صدی عیسوی سے قبل کے اور چھٹی صدی کے بعد کی نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح کتابی مصوری کا فن اسکندریہ میں عیسائی عہد کے شروع میں وسیع طور پر رائج تھا۔ بزنطینی (BYZANTINE) عہد حکومت میں اور یورپ کے قرون وسطیٰ میں بھی یہ فن رائج تھا۔

ہندوستان میں اس کے سب سے قدیم نمونے موہن جودارو اور ہڑپا میں مستطیل مہروں اور تعویذوں کی شکل میں ملتے ہیں۔ ان میں انسانوں اور جانوروں کی تصویروں کا اتحاد ملتا ہے۔ تصویریں افقی متوازی لائینوں میں ترتیب دی گئی ہیں۔ یہ ریکارڈ تیسری صدی قبل مسیح کے ہیں۔

ہندوستان میں فنِ مصوری ماقبل تاریخ بھی کافی ترقی یافتہ تھا۔ اس فن کی تاریخ باقی ماندہ نمونوں سے بھی مرتب کی جا سکتی ہے اور ادبی ذرائع سے بھی۔ کیونکہ وہ سامان تحریر جن پر مسیحی دور سے پہلے نقاشی کی گئی دیرپا نہ تھا اس لیے زیادہ تر یہ مواد تباہ ہو گیا اب ہمیں ادبی ذرائع ہی سے نتائج اخذ کرنے ہوں گے وتسایَن (Vatsayana) کے کام سوتر سے پتہ چلتا ہے کہ مصوّروں کے پیشہ ورانہ ادارے تھے۔ شاہی محلات کے بڑے کمرے منقش اور چونسٹھ کلاؤں میں مصوّری کو اہم مقام حاصل تھا یہاں تک کہ امراء کی عورتیں بھی مصوری میں دسترس رکھتی تھیں۔ وشنو دھرم مہاپران جو تیسری یا چوتھی صدی عیسوی کا ہے چتر بنانے کے اصول کو تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ ان شواہد سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ قدیم ہندوستان میں فنِ مصوری فروغ پر بھی تھا اور رائج بھی۔

بے شمار باتصویر مخطوطے جو ہندوستان کے مختلف حصّوں سے دریافت ہوئے خاص طور سے شرقی اور مغربی ہندوستان سے حاصل شدہ نمونے بلاشبہ اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ یہ فن ہندوستان میں ترقی پر تھا اور وسیع طور سے رائج تھا۔

باتصویر سنسکرت مخطوطوں کے ابتدائی حوالوں میں ہم سروتا، سیلوا سوتر،[1] چکر سمہتا اور کئی شلپ سوتر[2] کی کتابوں کے نام لے سکتے ہیں جن میں قربانی کے آلات، قربان گاہ، آلات جراحی کی اشکال وغیرہ تصویروں کے ذریعہ دکھائی گئی ہیں۔ اور یہ تصویریں کتاب کے مضمون کے مطابق ہیں

---

1. History of Indian Literature: Weber, p.256
2. Special Number of Trubners American and Oriental Library Record, 1874, pp. 27-28

کچھ قدیم کتابیں جو فن جنگ پر ہے ان میں چکر ویہو وغیرہ کی تصویریں ملتی ہیں۔ مندانا کے راج بلبھ سے اور حوالے مل سکتے ہیں [3]

درشیہ کاویہ یعنی ڈرامہ کی طرح چترکاویہ یا کتابوں کو باتصویر بنانے کا فن اس لیے رائج تھا کہ نظر آنے والی شکلیں بنائی جائیں۔ سنسکرت ادب میں چترکاویہ بہت مقبول تھا جہاں نظموں اور مضامین کو بندھوں میں ترتیب دیا جاتا ہے ان بندھوں یا اشکال میں عام طور پر استعمال ہونے والی شکلیں رتھ کنول تلوار، سانپ وغیرہ ہیں۔ "چترکاویہ بندھودیا" کا مخطوطہ جو اڑیا زبان کے شاعر اوپندر بھنج نے لکھا تھا کافی تصویروں کا حامل ہے۔ یہ مخطوطہ وشو بھارتی کی اڑیا سیمنار لائبریری میں محفوظ ہے۔ ادبی تصنیف جیسے وشوا ناتھ کی ساہتیہ درپن سے اس نکتہ کی اور وضاحت ہو جائے گی [4]

بھوج شالہ واقع کمال مولیٰ مسجد دھارا کے ستونوں پر جو نقوش ہیں اور ایک دوسری عمارت پر جواُون (اندور ریاست) میں ہے "سرپ بندھ" کندہ ہیں یعنی ایک دوسرے میں لپٹے ہوئے سانپوں کی شکلیں ہیں۔

بندھوں کے علاوہ اکشر تیاس یعنی تصویروں اور جامیٹری ڈیزائن میں حروف کی تقسیم بھی تانتر ادب میں بہت پہلے سے رائج تھا۔

چترکاویہ کو جس کی نمائندگی بندھوں کے ذریعہ ہوتی ہے دراصل کتابی مصوری کا اصلی فن نہیں کہا جاسکتا۔ بندھوں کی شکلیں مخصوص ہوتی تھیں اور مضمون اس محدود جگہ میں لکھا جاتا تھا جو ڈیزائن کے خاکہ میں ہوتی تھی ان شکلوں کا نفس مضمون سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا تھا اس لیے بندھوں کو کتابی مصوری نہیں کہا جاسکتا۔

ہندوستان کے قدیم باتصویر مخطوطوں میں دیوی دیوتاؤں کی چھوٹی چھوٹی تصویریں ملتی ہیں جن کا کتاب کے نفس مضمون سے کوئی تعلق نہیں، اسی وجہ سے ڈاکٹر اے۔ کے۔ کمار اسوامی لکھتے ہیں:۔

> "ہندوستان میں کبھی کتابی مصوری کا فن فروغ نہ پاسکا جو تصویریں ملتی ہیں وہ مربع اشکال ہیں جو صفحات پر بنے ہیں اور ان کا نفس مضمون سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا" [5]

---

3. Gackwad's Archaeological Series, No.1,p.2
4. Gackwad's Archaeological Series, No.1,p.2
5. Catalogue of Indian Collections in the Museum of Fine Arts, Boston.

ڈاکٹر کمار اسوامی کا بیان جزوی طور پر درست ہو سکتا ہے لیکن اسے پورے طور سے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر کمار اسوامی نے شاید اہم باتصویر سنسکرت مخطوطوں کو نظر انداز کر دیا۔ انھوں نے رامائن، مہابھارت، بھگوت گیتا، بدھ اور جین مذہبی کتب کے مصوّر مخطوطوں پر جنھیں اب تک دریافت کیا جا چکا ہے غور نہیں کیا۔

سابق ڈائریکٹر آثار قدیمہ بڑودہ اور ماہر علم کتبات ڈاکٹر ہیرانند شاستری نے بہت لیاقت سے ڈاکٹر کمار سوامی کے نظریہ کو رد کیا۔ انھوں نے کہا:۔

"مجھے یہ نظریہ حقیقت سے بہت دور معلوم ہوتا ہے مختلف ادوار کا فن کتابی مصوری اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں پائے گئے منقش مخطوطے اس نظریہ کو غلط کر دیتے ہیں"۔[6]

اس خیال کی حمایت میں ڈاکٹر ہیرانند شاستری نے ایک چھوٹی کتاب "ہندوستان کا فن کتابی مصوری" (INDIAN PICTORIAL ART AS DEVELOPED IN BOOK ILLUSTRATION) شائع کی۔ انھوں نے اپنے نظریہ کو مثالوں کے ساتھ ثابت کیا ہے۔[7] ڈاکٹر ڈی۔ راگھون نے جرنل آف اورینٹل ریسرچ مدراس (Journal of Oriental Research) میں ایک مقالہ شائع کیا (جلد 27 صفحہ LIV) جس میں ایسے باتصویر مخطوطوں کی ایک فہرست ہے جو ہندوستان کے مختلف میوزیم اور لائبریریوں میں موجود ہیں۔

تمام ہندوستان سے دریافت شدہ باتصویر مخطوطوں کی روشنی میں نیز مسلم حکمرانوں کی زیر سرپرستی خصوصاً مغل بادشاہوں کی سرپرستی میں فن کتابی مصوّری کے فروغ کے پیش نظر ڈاکٹر کمار اسوامی کا یہ بیان کہ ہندوستان میں فن کتابی مصوّری بالکل معدوم تھا ترمیم طلب ہے۔ اُن کے اس بیان سے ہندوستان کی صحیح تصویر سامنے نہیں آتی۔

عہد وسطیٰ کے آغاز ہی سے کافی تعداد میں منقش اور باتصویر مخطوطے اچھی حالت میں محفوظ نظر آتے ہیں۔ عام طور سے مذہبی کتابوں کی چھوٹی چھوٹی تصویروں کے ذریعہ شرح کی جاتی تھی اور کتابوں کے متن اور تصویروں میں جمالیاتی ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ کھجور کی پتی کے مخطوطہ پر مصوری اور خطاطی

---

6. Gackwad's Archaeological Series, No.1, p.2

7. Gackwad's Archaeological Series, No.1, p.2

کی ترتیب اس طرح رہتی کہ لمبی سطح کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا تصویر مرکز میں ہوتی اور اس کے دونوں طرف تحریر ہوتی تھی ۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ مستطیل چھوٹی تصویریں اوپر اور نیچے ہوتیں اور درمیانی جگہ تحریر کے لیے مخصوص ہوتی لیکن یہ طریقہ سختی سے قابل عمل نہ تھا۔ پتیوں کی لمبوتری دفتی اور انکے یکجا کرنے کے طریقہ کو پیش نظر رکھ کر تصویر اور تحریر کی ترتیب طے کی جاتی تھی۔ اگر یکجا رکھنے کے لیے سوراخ بیچ میں کرنا ہو تو لمبی سطح کو تین حصوں میں تقسیم کر کے مرکز میں کم سے کم جگہ سوراخوں کے لیے ہوتی، تصویر اور تحریر اس کے دونوں طرف ہوتیں۔ اگر مخطوط کے بیچ میں باندھنے کے لیے سوراخ نہ کرنا ہوتا، تو دونوں طرف تحریر ہوتی اور تصویر بیچ میں ہوتی تھی (پلیٹ XV)

کاغذ کی ابتدا ہوئی تو فن کار اور خطاط کو کشادہ جگہ ملی اسی وجہ سے کتابی مصوری کا کردار بدل گیا۔ فن کار نے مصوری میں طویل مناظر، بڑی تخلیقات اور کناروں کے ڈیزائن بنانے شروع کیے ۔ اب مصور کو زیادہ رنگ استعمال کرنے کا موقع ملا مثلاً سنہرا، روپہلا، نیلا، نارنجی اور زرد۔ کھجور کی پتی کے مخطوطوں پر چوڑائی کی طرف زیادہ جگہ ہوتی تھی جبکہ کاغذ پر عمودی جگہ بڑی ہوتی تھی (پلیٹ XIV)۔

> "پندرہویں صدی میں کاغذ کے مخطوطے سائز میں بڑے ہو کر 11" x 4½" ہو گئے۔ سترھویں صدی میں اور بھی بڑے ہو گئے جب مغل طرز مصوری نے قدیم مغربی طرز کو ختم کر دیا تو مخطوطوں کا سائز 16" x 6" اور اس سے بھی بڑا ہو گیا"۔[5]

1550ء سے 1800ء تک مغل اور راجپوت دور کے مخطوطوں میں کتابی مصوری کی روایتی ترتیب میں عظیم تبدیلی ہوئی۔ چوڑائی کے بجائے عمودی مصوری کو اہمیت دی گئی اور چھوٹی چھوٹی تصویروں کو زینت دینے پر زیادہ توجہ کی گئی اور تصویروں کی نوک پلک درست کرنے کا ایک پیچیدہ انداز ابھرا۔

اب مرکزی تصویر اعلیٰ فنکار بناتا اور دوسرا فنکار جس کو دستکاری میں خاص مہارت ہوتی تھی مرکزی تصویر کے چاروں طرف پھولدار کنارہ بناتا تھا جس میں پتیاں اور اشکال کو سنہرا رنگ چھڑک کر سجایا جاتا تھا۔ تصویر اور حاشیہ کے اتصال پر بنی ہوئی پٹی ہمیشہ ہوتی تھی جسے پھولکاری کہا جاتا تھا اور دو رنگین دھاریاں ہوتی تھیں جنھیں سنہرا بنایا جاتا تھا۔

اسلامی دنیا سے رابطہ اور عربی خطاطی نے ہندوستان میں مخطوطوں کی مصوری کا طرز

---

5. A.I. Vol. V, No.2, 1958, p. 7.

بدل دیا جس سے مندرجہ ذیل خصوصیات اس میں پیدا ہو گئیں :۔

(۱) تصویر تحریر سے آزاد ہو گئی اور

(۲) فارسی اور اردو تحریر کے مناسب خطوط نے پرانے ہندوستانی طرز کی جگہ لے لی.

لیکن باوجود اسلامی اثر کے کچھ راجپوت اور علاقائی مخطوطوں میں سترہویں سے انیسویں صدی تک تصویر اور تحریر کا پرانا طرز برقرار رہا۔[9]

پرانے ہندوستانی طرز میں نقل نویس کچھ جگہ (آلیکھیہ استھان) مصور کے لیے چھوڑ دیا کرتا تھا اور تحریر کا کام ختم ہونے کے بعد نقل نویس مخطوطہ کو مصور کے پاس بھیج دیا کرتا۔ اور بعض اوقات خطاط حاشیہ میں مصور کی رہنمائی کے لیے اشارات لکھ دیا کرتا تھا۔ اس کے بارے میں پروفیسر براؤن تحریر کرتے ہیں :۔

"دو آدمیوں کو مقرر کیا جاتا تھا ایک خوش نویس کتابت کے لیے دوسرا مصور تصویر بنانے کے لیے۔ مخطوطے کے اوراق پر پہلے سے خطاط مستطیل جگہیں مصور کے لیے چھوڑ دیتا اوراق کے دقت نظر کے ساتھ مطالعہ سے حقیقت واضح ہو جاتی ہے کیونکہ تحریر کی سطریں تصویر کے اوپر تک پہنچی ہوئی ملتی ہیں"[10]

لیکن یہ بات کلیہ کے طور پر درست نہیں ٹھہرتی اگر خوش نویس مصوری کا فن بھی جانتا ہوتا تو دونوں کام وہی انجام دیتا۔ ڈاکٹر ہیرانند شاستری نے اس بات کی تصدیق ان الفاظ میں کی ہے:۔

"میں نہیں کہہ سکتا کہ اس طرح کا کلیہ بن سکتا ہے (جیسا کہ پروفیسر براؤن نے کہا ہے) ... کچھ جگہوں پر پروفیسر براؤن کا بیان درست ہو سکتا ہے کیونکہ کچھ مخطوطوں میں تحریر کی سطور تصویروں کے اوپر گئی ہوئی نہیں ملیں گی لیکن جین مخطوطوں میں بھی ہمیشہ ایسا نہیں ملتا۔ میں نے ہندوستانی اور جینی مصوروں کو دیکھا ہے کہ تحریر کے وقت تصویریں بھی بنائے جاتے ہیں۔ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ کشمیری پنڈت آج بھی ایسا کرتے ہیں"[11]

9. A.I.Vol. V, No.2, 1955, pp.7-8
10. The Story of Kalaka; Prof. N . Brown, p. 15
11. Gackwad's Archaeological Series, No. 1,p. 14

ڈاکٹر شاستری نے باتصویر کتاب " جین چترکلا دُرم" کا حوالہ بھی دیا ہے جس میں ایسی مثالیں موجود ہیں جو ان کے بیان کی مؤید ہیں جو چیز ڈاکٹر شاستری نے ثابت کرنے کی کوشش کی وہ بلاشبہ درست ہے لیکن ایسی مثالیں شاذ و نادر ہیں۔ ہندوستان کی باتصویر کتابوں کے اقسام کو دیکھا جائے تو ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ایسے مخطوطے جہاں خطاط اور مصور ایک ہی شخص ہو بہت کم ہیں۔

2۔ مشرقی ہند کے باتصویر مخطوطے

پال بادشاہوں کے عہد حکومت میں (750-1155 A.D.) میں مشرقی ہند نے مصوری، ادب، فلسفہ اور تعلیم کے میدان میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ فیض رساں حکمرانوں کی سرپرستی میں ممتاز مصنفین اور شعراء نے اہم تخلیقات کیں۔ اس سرپرستی کے نتیجہ میں مخطوطہ نویسی اور مصوری کی مخصوص حوصلہ افزائی ہوئی۔

بیرونی لوگوں کے جوشِ بت شکنی کی وجہ سے مخطوطوں کی بڑی تعداد برباد ہو گئی اور ہمارے پاس بہت کم باقی بچا ہے لیکن ان باقیات سے بھی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کھجور کی پتی پر کتابی مصوری کا فن اس زمانہ میں مروج تھا

اس دور کے کھجور کی پتی پر لکھے باتصویر مخطوطوں میں حسب ذیل بہت اہم ہیں[12] ہاں ان میں ایک چیز قابل غور ہے وہ یہ کہ کچھ تحریروں کا تصویروں سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔

(1-2) دو استسہسرکا پرنجا پرمیتا مخطوطے (AATASAHASRIKA PARANJA PARAMITA) جو مہاپال برس 5 اور 6 کے ہیں ان میں سے ایک کیمبرج کے ذخیرہ (Add. 1464) میں اور دوسرا ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے ذخیرہ میں ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے مخطوطہ میں بارہ تصویریں ہر ورق پر تین تصویریں ہیں جنہیں مہاتما بدھ کے واقعات دکھائے گئے ہیں۔ اور دوسرے مخطوطہ میں مہایانا بدھ دیوی دیوتا ہیں۔

(3)۔ استسہسرکا پرجنا پارمیتا مخطوطہ (ASTASAHASRIKA PARANIA PARAMITA) (پہلے ورنڈن برگ ذخیرہ میں تھا) جو رام پال سال کے انتالیسویں برس کا ہے

(4-5)۔ دو استاسہاسریکا پرجنا پرمیتا مخطوطے جن میں ایک راجا ہری ورمن کے انیسویں سال کا ہے اور دوسرا بارہویں صدی عیسوی کا ہے۔ یہ دونوں مخطوطے ورنڈر الیسرچ

---

12. History of Bengal, Dacca University, Vol. 1, p. 549.

بدل دیا جس سے مندرجہ ذیل خصوصیات اس میں پیدا ہو گئیں :-

(۱) تصویر تحریر سے آزاد ہو گئی اور

(۲) فارسی اور اردو تحریر کے متناسب خطوط نے پرانے ہندوستانی طرز کی جگہ لے لی۔

لیکن باوجود اسلامی اثر کے کچھ راجپوت اور علاقائی مخطوطوں میں سترہویں سے انیسویں صدی تک تصویر اور تحریر کا پرانا طرز برقرار رہا[9]

پرانے ہندوستانی طرز میں نقل نویس کچھ جگہ (آلیکھیہ استھان) مصور کے لیے چھوڑ دیا کرتا تھا اور تحریر کا کام ختم ہونے کے بعد نقل نویس مخطوطہ کو مصور کے پاس بھیج دیا کرتا۔ اور بعض اوقات خطاط حاشیہ میں مصور کی رہنمائی کے لیے اشارات لکھ دیا کرتا تھا۔ اس کے بارے میں پروفیسر براؤن تحریر کرتے ہیں :-

"دو آدمیوں کو مقرر کیا جاتا تھا ایک خوش نویس کتابت کے لیے دوسرا مصور تصویر بنانے کے لیے۔ مخطوطے کے اوراق پر پہلے سے خطاط مستطیل جگہیں مصور کے لیے چھوڑ دیتا۔ اوراق کے دقت نظر کے ساتھ مطالعہ سے حقیقت واضح ہو جاتی ہے کیونکہ تحریر کی سطریں تصویر کے اوپر تک پہنچی ہوئی ملتی ہیں۔"[10]

لیکن یہ بات کلیہ کے طور پر درست نہیں ٹھہرتی اگر خوش نویس مصوری کا فن بھی جانتا ہوتا تو دونوں کام وہی انجام دیتا۔ ڈاکٹر ہیرانند شاستری نے اس بات کی تصدیق ان الفاظ میں کی ہے:-

"میں نہیں کہہ سکتا کہ اس طرح کا کلیہ بن سکتا ہے (جیسا کہ پروفیسر براؤن نے کہا ہے) ... کچھ جگہوں پر پروفیسر براؤن کا بیان درست ہو سکتا ہے کیونکہ کچھ مخطوطوں میں تحریر کی سطور تصویروں کے اوپر گئی ہوئی نہیں ملیں گی لیکن جین مخطوطوں میں بھی ہمیشہ ایسا نہیں ملتا۔ میں نے ہندوستانی اور جینی مصوروں کو دیکھا ہے کہ تحریر کے وقت تصویریں بھی بنائے جاتے ہیں۔ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ کشمیری پنڈت آج بھی ایسا کرتے ہیں"[11]

---

9. A.I.Vol. V, No.2, 1955, pp.7-8

10. The Story of Kalaka; Prof. N . Brown, p. 15

11. Gackwad's Archaeological Series, No. 1,p. 14

ڈاکٹر شاستری نے باتصویر کتاب "جین چترکلا ڈرم" کا حوالہ بھی دیا ہے جس میں ایسی مثالیں موجود ہیں جو ان کے بیان کی موئد ہیں جو چیز ڈاکٹر شاستری نے ثابت کرنے کی کوشش کی وہ بلاشبہ درست ہے لیکن ایسی مثالیں شاذ و نادر ہیں۔ ہندوستان کی باتصویر کتابوں کے اقسام کو دیکھا جائے تو ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ایسے مخطوطے جہاں خطاط اور مصوّر ایک ہی شخص ہو بہت کم ہیں۔

2۔ مشرقی ہند کے باتصویر مخطوطے

پال بادشاہوں کے عہد حکومت میں (750-1155 A. D.) میں مشرقی ہند نے مصوّری، ادب، فلسفہ اور تعلیم کے میدان میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ فیض رساں حکمرانوں کی سرپرستی میں ممتاز مصنفین اور شعراء نے اہم تخلیقات کیں۔ اس سرپرستی کے نتیجہ میں مخطوط نویسی اور مصوّری کی مخصوص حوصلا افزائی ہوئی۔

بیرونی لوگوں کے جوشش بت شکنی کی وجہ سے مخطوطوں کی بڑی تعداد برباد ہوگئی اور ہمارے پاس بہت کم باقی بچا ہے لیکن ان باقیات سے بھی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کھجور کی پتی پر کتابی مصوری کا فن اس زمانہ میں مروّج تھا

اس دور کے کھجور کی پتی پر لکھے باتصویر مخطوطوں میں حسب ذیل بہت اہم ہیں[12]۔ ہاں ان میں ایک چیز قابل غور ہے وہ یہ کہ کچھ تحریروں کا تصویروں سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔

(2-1) دو استسہسر کا پرنجا پرمتیا مخطوطے (Astasahasrika Parania Paramita) جو مہا پال برس 5 اور 6 کے ہیں ان میں سے ایک کیمبرج کے ذخیرہ (Add. 1464) میں اور دوسرا ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے ذخیرہ میں ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے مخطوطہ میں بارہ تصویریں ہر ورق پر تین تصویریں ہیں جنہیں مہاتما بدھ کے واقعات دکھائے گئے ہیں۔ اور دوسرے مخطوطہ میں مہایانی بدھ دیوی دیوتا ہیں۔

(3)۔ استسہسر کا پرجنا پارمیتا مخطوط (Astasahasrika Parania Paramita) جو رام پال سال کے انتالیسویں برس کا ہے (پہلے در لنڈن برگ ذخیرہ میں تھا)

(4-5)۔ دو استاسہاسریکا پرجنا پرمیتا مخطوطے جن میں ایک راجا ہری ورمن کے انیسویں سال کا ہے اور دوسرا بارہویں صدی عیسوی کا ہے۔ یہ دونوں مخطوطے در ندر ریسرچ

---

12. History of Bengal, Dacca University, Vol. 1, p. 549.

سوسائٹی راج شاہی کے ذخیرہ میں ہیں۔

(6)۔ استاسہاسریکا پرجنا پرمیتا مخطوطہ جو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے ذخیرہ میں ہیں اور نیواری سنہ (Newari Era) کے 191 یعنی سنہ 71ء کا ہے اس میں 35 چھوٹی چھوٹی تصویریں دیوی دیوتاؤں کے اہم مندروں کی ہیں۔
یہ تصویریں کیمبرج مخطوطوں کی طرح ہیں اور تصاویر کے نیچے عبارت میں انکی وضاحت کی گئی ہے۔

(7.8)۔ دو مخطوطے جن میں ایک کرندویہو کا اور دوسرا بودھی چاریاوترکا ہے۔ دونوں بارھویں صدی عیسوی کے ہیں اور V.R.S. ذخیرہ کے ہیں۔

(9)۔ بوسٹن میوزیم کا مخطوطہ نمبر 20589 جو گوپال سنہ کے چوتھے سال کا ہے (ان تصویروں کو کماراسوامی نے پورٹ فولیو آف انڈیا آرٹ میں چھاپا تھا)

(10) سوامورا مخطوطہ (اس کی تصویریں برلن (Ostasiatische Zeitschrift 1926ء میں شائع ہوئی تھیں۔ پلیٹ 10-9)

(11) استاسہاسریکا پرجنا پرمیتا مخطوطہ جو برٹش میوزیم میں ہے اور گوپال سنہ کا پندرھویں سال کا ہے۔

(12-13)۔ پنچ رکشا (Panchraksha) مخطوطہ جو ناسپال سنہ کے چودھویں سال کا ہے۔ دوسرا مخطوطہ (Add. No. 1643) سنہ 1015ء عیسوی کا ہے یہ دونوں کیمبرج ذخیرہ میں ہیں۔

(14) استاسہاسریکا پرجنا پرمیتا مخطوطہ جو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے ذخیرہ میں ہے اور نیواری سنہ (Newari Era) 268 یعنی سنہ 1148ء کا ہے جس میں بدھ کو اپنی مختلف شعبہائے حیات میں دکھایا گیا ہے (نمبر 4203)۔

(15)۔ استاسہاسریکا پرجنا پرمیتا مخطوطہ جو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کا ہے اور گوبند پال دور حکومت کے اٹھارھویں سال کا ہے یعنی بارھویں صدی عیسوی کے نصف آخر کا ہے۔ اس کے صرف آخری ورق پر بدھ دیوی دیوتاؤں کی تصویریں ہیں۔

(16) گنڈ دیہو کھجور کی پتی کا مصور مخطوطہ جو گیارھویں یا بارھویں صدی کا ہے

اور کلیولینڈ (Cleveland) میوزیم آف آرٹ (U.S.A.) کے ذخیرہ میں ہے

پلیٹ X.V.

(17) پنج رکشا (PANCHARKASHA) کے دو مخطوطے جو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے ذخیرہ میں ہیں ان میں سے ایک نیواری سمبت 385 یعنی 1265ء کا ہے اور دوسرا اس کا سمبت 11ء یعنی 1289ء کا ہے۔ ہر ایک میں پانچ پانچ تصویریں پنج رکشا دیویوں کی ہیں۔

مذکورہ بالا باتصویر مخطوطے بنگال (مشرقی پاکستان یعنی بنگلہ دیش سمیت) بہار اور نیپال کے ہیں۔ اگر ان مخطوطوں کو فنِ مصوری کے پہلو سے جانچا جائے تو یہ سب ایک ہی گروہ کے نظر آئیں گے اسی لیے ان کو ایک گروہ کا کہا جاتا ہے۔

جن تصویروں کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے اگر دیکھا جائے تو انھیں کتابی مصوری کے طبقہ میں نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ کتاب کے نفسِ مضمون سے ان تصویروں کا براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تصویریں دیوی دیوتاؤں کی ہیں مثلاً تارا، لوک ناتھ، مہاکالا، ایتابھ، میتریا، دھرم پانی وغیرہ۔ چھوٹی تصویریں دھرم یان اور تنتر یان مورتیوں کو پہچاننے میں مدد دیتی ہیں۔

ان دیوی دیوتاؤں کی تصویروں کا رنگ فنِ بت سازی کے اصولوں کے ذریعہ طے ہوتا تھا۔ عام طور سے ہرا، سفید، سیاہ، زرد، آسمانی اور سرخ رنگ استعمال کیا جاتا تھا۔ پہلے تصویر کا خاکہ سرخ یا سیاہ رنگ سے بنا لیا جاتا اس کے بعد اس میں رنگ بھرا جاتا تھا۔

اس فنِ مصوری کی روایت اجنتا اور ایلورا سے چلی آتی ہے اور اس کو زمانۂ قدیم اور قرونِ وسطیٰ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر کرامرش (Dr. Kramrish) نے ایک مقالہ میں جو جرنل آف انڈین سوسائٹی آف اورینٹل آرٹ جلد 1 نمبر 2 میں شائع ہوا ہے اس نکتہ پر پوری بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ مصوری کا طرز (اسٹائل) قدیم اور مخطوط کی کشش دورِ وسطیٰ کے طرز پر مبنی ہے

ڈاکٹر نہار رنجن رے نے اس نظریہ کی حمایت کرتے ہوئے کہا ہے:۔

"قدیم اسٹائل مکمل طور پر سانچے میں ڈھلے ہوئے تصویروں کا ہے اور دورِ وسطیٰ کا اسٹائل خطوطی ہے دونوں طرز جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں لیکن کبھی کبھی دونوں کی ایک دوسرے میں آمیزش بھی نظر آتی ہے جیسے ایلورا کی تصویروں میں اور مشرقی ہند کے

بہت سے منقش مخطوطوں میں ہے"۔[13]

بنگال کی تانبا کی تختیوں پر جو نقوش ہیں ان میں خطوطی مصوری کا اظہار ہے تانبہ کی ایسی تین تختیاں دستیاب ہوئی ہیں جن پر خطوطی مصوری ہے اور وہ حسب ذیل ہیں[14]:-

(1)۔ گیارھویں صدی کی تانبے کی تختی جس پر بیل کی تصویر اور دم کا ٹکڑا کندہ ہے۔

(2)۔ سندربن تانبا کی تختی جس پر نقوش کندہ ہیں وہ دھرم پال کے عہد کی ہے۔

(3)۔ مہر تانبا کی تختی جو اشوتوش میوزیم کلکتہ یونیورسٹی میں رکھی ہے۔

"مشرقی ہند کی کتابی مصوری زیادہ تر خطاطی ہے اس میں نقشہ نویسی زیادہ زور دار ہے اور اس نازک شئے کا خیال رکھا گیا ہے (یعنی نرم کھجور کی پتی) جس پر تصویر بنائی گئی ہے خطوط اور رنگوں کی خوبصورتی دیکھنے والے کو تعریف پر مجبور کرتی ہے"۔[15]

3۔ مغربی ہند کے باتصویر مخطوطے

مشرقی ہند کے کھجور کی پتی والے بدھ مخطوطوں کی طرح گجرات اور مغربی ہند کے مخطوطے بھی خصوصاً جین مخطوطے اپنی رنگین تصویروں، چمک، سجاوٹ اور نقشہ نگاری میں ممتاز ہیں۔ مغربی ہند کے منقش مخطوطے دو زمانوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ ابتدائی زمانہ والے کھجور کی پتیوں پر ہیں اور بعد کے مخطوطے کاغذ پر ہیں۔ وہ جین بھنڈاروں میں پائے گئے تھے اور بارھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد کے ہیں۔

گجرات خوش قسمت تھا کہ اس میں مشہور راجاؤں نے حکومت کی مثلاً سدھا راجا جے سمہا (1094۔1143 A.D.) اور کمار پال (1143۔1174 A.D.) وہ علوم کے عظیم سرپرست تھے ان کے عہد میں ملک کے طول و عرض میں بے شمار کتب خانے قائم ہوئے، تحریر نقل نویسی اور مصوری کو راجاؤں، رئیسوں اور عوام کی طرف سے حوصلہ افزائی نصیب ہوئی۔

مغربی ہند کے پرانے مخطوطوں کی تصویروں کو چونکہ وہ نفس مضمون سے براہ راست تعلق نہ رکھتی تھیں محض سجاوٹ کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر موتی چند جیسے عالموں نے انھیں باتصویر مخطوطے کہا ہے

13. History of Bengal, Dacca University, Vol. 1, p. 555.

14. History of Bengal, Dacca University, Vol. 1, p. 555.

15. Rupam, April.July 1928.

اور کتابی مصوری اور سجاوٹ کے درمیان جو باریک فرق ہے اس کو نظرانداز کر دیا ہے۔ اگر کھجور کی پتیوں پر لکھے مخطوطوں کی تصویروں کو دیکھا جائے جو مغربی ہند کے ہیں تو ان پر سجاوٹ والے ڈیزائن اور دیوی دیوتاؤں کی تصویریں بنی ہیں جن کی اہمیت مورت سازی کے لحاظ سے ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عطیہ دینے والوں کی، راہبوں کی اور ترتھنکروں کی تصویریں بھی پائی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر موتی چند نے اپنی کتاب "جین منی ایچر پینٹنگس فرام ویسٹرن انڈیا" (Jain Miniature painting from Western India) میں کھجور کی پتیوں والے مرقع مخطوطوں کو طرز کے اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں پہلا گروپ سنہ 1100ء سے سنہ 1350ء کا ہے اور دوسرا گروپ سنہ 1350ء سے سنہ 1450ء کا ہے۔

دوسرے گروپ کی نقاشی فنی لحاظ سے زیادہ اعلیٰ ہے اس میں باریک تفصیلات اور رنگ بہتر انداز کے ہیں۔ مضمون کے نقطۂ نظر سے جینیوں (Jain) کی زندگی کے واقعات کی وہی تصویریں مخطوطوں میں رکھی گئیں جن کا تحریر سے کوئی ربط ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سجاوٹ دھیرے دھیرے کتابی مصوری میں بدل گئی۔

پہلے گروپ کے مخطوطوں کی تصویروں کے بارے میں مندرجہ ذیل دریافتیں کی گئی ہیں۔[16]

(1) ایک نسی تھاچورنی (Nisithachurni) مخطوطہ جس میں گلکاری سے سجاوٹ کی گئی ہے اور جیومیٹری والے ڈیزائن ہیں۔ یہ دیوا پرساد ساکن بھڑوکچا (موجودہ بڑودہ) نے لکھا تھا اور جے سمہا کے عہد کا ہے جس نے گجرات پر سنہ 1049ء سے سنہ 1143ء تک حکومت کی۔ یہ مخطوطہ بکرمی سمبت 1157 یعنی سنہ 1100ء کا ہے

(2) شٹ کھنڈ اگما (Shatkhandagma) کا کھجور کی پتے والا مخطوطہ جس پر دھاولا تیکا ایک اہم دگمبر جین مذہبی کتاب تحریر ہے اور یہ سنہ 1113ء سے سنہ 1120ء

---

16. Jain Ming ture Paintings from Western India: Dr. Motichand, pp.2831.

میں لکھا گیا۔ اس پر چکیشوری دیوی، راھبوں، جینیوں (Jains) کی تصویریں اور سجاوٹ والے ڈیزائن بنے ہوئے ہیں۔

(3) ـــ اس کے بعد جناتا سوترا (Janata Sutra) کا کھجور کی پتیوں والا مخطوطہ ہے جو سنہ 1127ء کا ہے۔ اس پر دو تصویریں ہیں ایک میں مہاویر سوامی بیٹھے ہوئے ہیں اور دوسری علم کی دیوی کی تصویر ہے۔

(4) ـــ داس ویکا پکا لگھو ورتی (Dasavaikalika Laghuvritti) مخطوطہ جو سنہ 1143ء کا ہے۔ اس میں غالباً ہیم چندر چاریہ اور ان کے شاگرد مہندرا سوری اور کمار پال کی تصویریں ہیں۔

(5) ـــ اوگھا نرو کتی مخطوطہ اور چھ دوسری کتابیں جو سنہ 1116ء کی ہیں۔ مخطوطہ پر دیوی کی 19 تصویریں ہیں جن کی مورت سازی کے لحاظ سے اہمیت ہے۔

(6) ـــ مہاویر چرتر کا مخطوطہ، تری ششتی سلاکا پرش چرتر سوپہ پروان مصنفہ ہیم چندرا۔ اس میں تین چھوٹی تصویریں غالباً کمار پال اور اس کے استاد ہیم چندر کی ہیں اور ایک شاسنا سری دیوی کا ہے۔

(7) ـــ اس کے بعد نامی ناتھ چرت کا مخطوطہ ہے جو سنہ 1241ء کا ہے۔ اس میں چھوٹی تصویریں امبیکا دیوی اور تری تھنکر نیمی ناتھ کی ہیں۔

(8) ـــ کتھا رتنا ساگر مخطوطہ جو سنہ 1256ء کا ہے۔ اس پر سوا ناتھ جینی راھبوں، راھباؤں کی تصویریں ہیں۔

(9) ـــ سراوکر پرتی کرمن چرنی کا مخطوطہ۔ یہ سنہ 1260ء کا ہے اور اودے پور میواڑ سے حاصل ہوا ہے اس پر چھ چھوٹی تصویریں ہیں

(10) کلپ سوتر مخطوطہ۔ جس پر پانچ چھوٹی چھوٹی تصویریں جین راہبوں اور راہباؤں کی ہیں اور یہ ۱۲۰۰ء کا ہے۔

(11) تاریخی لحاظ سے اس کے بعد کے حسب ذیل مخطوطے ہیں:۔

کلپ سوتر مخطوطہ اور کالکا چاریہ مخطوطہ کا ایک نسخہ سنہ 1273ء کا ہے۔ اس پر برہم شانتی، مکیش اور لکشمی کی تصویریں ہیں جن کی فن صورت سازی کے اعتبار سے اہمیت ہے۔

اس کے بعد ستیا ہو کتھا کا مخطوطہ اور سات دوسری کتھاؤں کے مخطوطے جن پر 33 چھوٹی چھوٹی تصویروں میں نیمی ناتھ کی زندگی کی کہانی دکھائی گئی ہے۔ یہ 1288ء کا ہے

بہت سے کھجور کی پتیوں والے بغیر تاریخ کے مخطوطے جو طرز مصوری کے اعتبار سے دور اوّل کے ہیں، سارا بھائی نواب کے ذخیرہ میں، سنگھوی پاڑہ پٹن بھنڈار پٹن اور جیسلمیر گیان بھنڈار میں محفوظ ہیں۔

مصور مخطوطے (؟)، جو دور ثانی کے ہیں تاریخی اعتبار سے حسب ذیل ہیں:۔

(1) کلپ سوتر اور کالکا چاریہ کتھا مخطوطوں میں چھ تصویریں ہیں جو مہاویر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہیں مخطوطہ 1370ء کا ہے۔

(2) کلپ سوتر مخطوطہ (سیٹھ آنند جی منگل جی کی پیڑھی گیان بھنڈار واقع ایدر) جس میں 40 چھوٹی تصویریں ہیں ان میں مقدس نشانات اور مہاویر کی زندگی کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ پروفیسر نارمن براؤن نے اس مخطوطہ کی تاریخ چودھویں صدی عیسوی کے آخر کی مقرر کی ہے۔

(3) سدھ ہیم دیاکرن مخطوطہ اسی دور کا ہے۔ اس میں چار تصویریں ہیں جن میں حسب ذیل مناظر دکھائے گئے ہیں:۔

(الف) جے سمہا دیو ہیم چندر سے دیاکرن لکھنے کی درخواست کرتے ہوئے۔

(ب) کتاب تکمیل کے بعد ایک جلوس کی شکل میں بادشاہی ہاتھی پر رکھ کر لے جائی جاتی ہے۔

(ج) کرمانت جو اننت پربھا اپادھیایہ کا وزیر ہے اس کتاب کی ایک نقل کرنے کی درخواست کرتا ہے۔

(ط) ـــــ رتی رہسے کا باتصویر مخطوطہ جو شروع پندرہویں صدی عیسوی کا ہے۔

(ی) ـــــ دستاراویامی کا نشر شدہ مخطوطہ جو پندرہویں صدی عیسوی کا ہے۔

مغربی ہندوستان میں کاغذ تیرھویں صدی کے آخر اور چودھویں صدی کے شروع میں وسیع پیمانے پر رائج تھا۔ کاغذ کی ابتدا سے کتابوں کی تعداد بھی بڑھی اور مصور کے کام کا میدان بھی وسیع ہوا۔ اس زمانہ میں بے شمار مخطوطے کاغذ پر نقل کیے گئے اور کتابی مصوری کو فروغ حاصل ہوا۔ مصوروں نے آزادی سے سنہرے اور روپہلے رنگ استعمال کیے اور مخطوطوں کے حاشیوں کو پھولوں، جانوروں کی تصویروں اور جامیٹری کے ڈیزائنوں سے خوب سجایا۔

مغربی ہند کے مکتب مصوری کے لیے کچے مال کا سب سے زیادہ زرخیز وسیلہ کھجور کی گوناگوں قسم کی پتیاں اور کاغذ ہے جن پر دو شوتامبر جین کتابیں کلپ سوتر اور کالکا چاریہ کتھا تحریر ہیں اور ان میں جینیوں (Jains) کی زندگی کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔

گجرات وشنوازم کا مرکز رہا ہے یہی وجہ ہے کہ بھاگوت، گیتا گوند اور بال گوپال استوتی کی چھوٹی تصویریں کثرت سے بنائی گئیں۔ اس کے ساتھ "سکتا" چھوٹی تصویریں جو دیوی مہاتمایا سے لی گئی ہیں اور غیر مذہبی چھوٹی تصویریں جو رتی رہسے سے لی گئی ہیں گجرات میں زیادہ ملتی ہیں۔

اجنبی حکمرانوں کی آمد نے جین امن پسند حکمرانوں کو پریشان کر دیا۔ نئے حالات میں ان کے لیے فوری طور پر ضروری ہوگیا کہ اپنے مقدس صحیفوں کو محفوظ رکھیں۔ نیک اور مخیر مالداروں خاص طور سے تاجر طبقہ نے اہم مذہبی کتابوں کی نقلیں کرا کے مذہبی فضیلت حاصل کی۔ یہ دوسری اہم وجہ بڑی تعداد میں باتصویر مخطوطوں کے وجود میں آنے کی تھی۔

کاغذی دور (1400-1600 A.D) کے اولین مصور مخطوطے جو مغربی ہند میں پائے گئے کلپ سوتر کے مخطوطے ہیں جو سنہ 1415ء کے ہیں۔ ان میں سے ایک مخطوطہ پاٹن ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری میں ہے اور دوسرا آنندجی کلیان جی پیدھینا گیان بھنڈار لمبڈی میں ہے۔

دوسرا باتصویر کلپ سوتر مخطوطہ مورخہ 1427ء انڈیا ہاؤس لندن کے ذخیرہ میں ہے۔ اس میں 113 اوراق ہیں (31 کلپ سوتر کے اور باقی کالکا چاریہ کے) اور 46 تصویریں ہیں۔

کلپ سوتر کے پندرہ اور مخطوطے دریافت کیے گئے جو پندرھویں صدی عیسوی کے ہیں۔ ان میں بیشتر گیان بھنڈار پٹن اور بڑودہ میں رکھے ہیں۔ ان مخطوطوں کی ایک مکمل فہرست تفصیلی بیانات

کے ساتھ موتی چند کی کتاب "جین مینی ایچر پینٹنگس فرام ویسٹرن انڈیا" میں دی گئی ہے۔

دوسرے کاغذ پر تحریر کئے اہم باتصویر مخطوطے جنھیں اب تک دریافت کیا جا چکا ہے حسبِ ذیل ہیں:۔

(1) ۔ اتر دھیایانہ سوتر (سنہ 1472ء)

(2) ۔ دیوی مہاتما یہ جس میں[17] تیرہ چھوٹی تصویریں ہیں (سنہ 1400ء)

(3) ۔ بھاگوت دسم کنڈا (سنہ 1610ء)

(4) ۔ بال گوپال استوتی[18] ایک مخطوطہ بوسٹن میوزیم میں اور دوسرا بڑودہ میں[19] ہے

(5) ۔ گیت گوبند[20] جس میں سات چھوٹی تصویریں ہیں وہ کالکا ماتا مندر مشرقی گجرات میں ہے۔

(6) ۔ گیت گووند[21] جو شری این۔ سی۔ مہتہ کے ذخیرہ میں ہے وہ پندرھویں صدی کے آخر کا ہے۔

(7) ۔ رتی رہسیے (15ویں صدی عیسوی) جو مسٹر سارابھائی نواب کے ذخیرہ میں ہے۔

4۔ مخطوطوں کے فن تشریح کی مغل سرپرستی

مغل شہنشاہوں نے بابر سے شاہجہاں تک فنِ مصوری کی حوصلہ افزائی کی۔

بابر (1483 ـ 1530) نے جس نے سنہ 1526ء میں ہندوستان کو فتح کیا فنِ مصوری اور باتصویر مخطوطہ کے فن کو اپنی سرپرستی عطا کی۔ عظیم شہنشاہ نے اپنی یادداشتوں میں جو فارسی زبان میں ہیں اور مہاراجہ الور کے ذخیرہ میں موجود ہیں دو مصوّروں بہزاد اور شاہ مظفر کے نام لکھے ہیں۔

---

17. J.I.S.O.A.1938, p.128

18. E.A.:Vol.II,1930, pp.167-206

19. J.I.S.O.A. 1942, p. 26

20. J.U.B.Vol.VI, May 1938, p.124

21. J.G.R.S., Vol. VIII, No.4,1915, pp.139-146.

تیموری شہزادوں کی مانند بابر مصوری کا ہولنے سے عاشق تھا اور باتصویر مرقع مخطوطوں کو اپنے پاس حفاظت سے رکھتا تھا اس کے انتہائی عشق کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب وہ کابل کی طرف فرار ہوا تو ہرات کے مصوروں کے مصور مخطوطوں کو ساتھ لیتا گیا۔

ہمایوں کو (56 ـ 1508) جو بابر کا بیٹا اور جانشین تھا فوجی مہارت کی کمی کے باعث پندرہ سال جلاوطنی میں ایران میں گزارنے پڑے وہاں اس کی شاہ طہماسپ کے درباری مصور سے ملاقات ہوئی۔ ہمایوں میں تیموری روایت کو ہمایوں کی شکل میں خوب حوصلہ افزائی ملی جب شاہ طہماسپ کے دربار کا مصوروں سے اس کا رابطہ قائم ہوا اور جب وہ ایران سے دہلی واپس آیا تو اپنے ساتھ ایرانی مصوروں کی ایک جماعت لے آیا۔

وہ شاندار مخطوطہ جس میں امیر حمزہ کی داستانِ عشق دکھائی گئی ہے اس دور کے فنِ مصوری کی ایک اہم مثال ہے۔ اس کا بڑا حصہ دیانا میں محفوظ ہے اور اس کے 25 صفحات انڈین میوزیم کنسنگٹن لندن میں ہیں۔ اس مخطوطے کے اوراق کا سائز "22 x "28 ہے۔ اس طرح مصوروں کو موقع ملا کہ اپنے فن کو اس ایرانی طرزِ مصوری میں ڈھالیں جو پندرھویں اور سولھویں صدی میں ایرانی بادشاہوں کے محلات کی دیواروں پر تھا۔

اس مخطوطے کی بارہ جلدیں ہیں اور ہر جلد میں سو اوراق ہیں۔ ہر ورق پر ایک تصویر ہے یہ تصویریں سوتی کپڑے پر ہیں۔

داستانِ امیر حمزہ کو باتصویر کرنے کے لیے پچاس مصور مقرر کیے گئے جنھوں نے میر سید علی کی رہنمائی میں جو تبریز کے باشندے تھے کام کیا بعد میں عبد الصمد کی نگرانی میں کام ہوا جو شیراز کے رہنے والے تھے۔ ہمایوں اپنے زمانۂ جلاوطنی میں موخر الذکر سے ملا۔ جب ہمایوں کو تخت واپس ملا تو انھوں نے اس مصور کو اپنے دربار میں بلایا۔ اول الذکر مصور کی شہنشاہ ہمایوں نے بڑی سرپرستی کی اور نادر الملک کا خطاب عطا کیا۔ چونکہ ہمایوں کے مختصر دورِ حکومت میں یہ عظیم کام ختم نہ ہوسکتا تھا اس لیے اکبر نے اس نیک کام کو انجام تک پہنچایا۔

اکبر (1605 ـ 1542) نے عبد الصمد کی شاگردی میں فنِ مصوری کا مطالعہ کیا مصوری اور کتابی تصویر سازی سے اکبر کو غیر معمولی رغبت تھی۔

اکبر جب اپنے تخت پر پوری طرح متمکن ہوگیا تو 1570ء میں اکبر نے تمدنی مشغلوں کی طرف خصوصی توجہ کی ابو الفضل جو اکبر کا بہت معترف ہے ہمیں بتاتا ہے کہ اس کے دربار میں سو سے زیادہ

مصور تھے جو فتح پور سیکری میں ایک الگ عمارت میں رہتے تھے۔ یہ مصور ایرانی مصوروں یعنی میر سید علی اور خواجہ عبد الصمد کی رہنمائی میں کام کرتے تھے۔ شہنشاہ ذاتی طور پر ان لوگوں کے کام کا معائنہ کرتا تھا۔ مصوروں کا کام شبیہ سازی اور کتابی مصوری ہوتا تھا۔ شہنشاہ ان کو لیاقت اور برتری کے مطابق انعام و اکرام دیتا تھا۔

مصوری کے لیے جو اکبر کے دل میں عزت و محبت تھی اس کا بیان خود اس کے اپنے الفاظ میں بہتر طور پر ممکن ہے۔ اس کا کہنا تھا:

"بہت سے لوگ ہیں جو مصوری سے نفرت کرتے ہیں مگر ایسے آدمیوں کو میں اچھا نہیں سمجھتا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصور کے پاس خدا کو پہچاننے کے خاص ذرائع ہوتے ہیں۔ کیونکہ مصور جب کوئی ذی روح کو تصویر کے سانچے میں ڈھالتا ہے اور یکے بعد دیگرے اعضاء بناتا ہے تو وہ ضرور محسوس کرتا ہوگا کہ وہ اس کو زندگی نہیں بخش سکتا اس وقت وہ مجبور ہوتا ہوگا اس خدا کے بارے میں سوچنے پر جو سب کو زندگی بخشنے والا ہے ایسے طرح اس کا خدا پر یقین بڑھے گا۔"[22]

"جس طرح مصوروں کی حوصلہ افزائی ہوتی بالکل اسی طرح زیورات کے مرصع کاروں، ملمع سازوں، نقشہ نویسوں اور وراقوں کے پیشوں کی بھی سرپرستی کی جاتی تھی۔"[23]

"جب مصوری کی حوصلہ افزائی ہوئی تو باتصویر شاہکاروں کی تعداد بھی بڑھنے لگی۔ فارسی نثر و نظم کی کتابوں کی کتابی مصوری کی گئی اور تصویروں کی ایک بڑی تعداد جمع ہوگئی۔ داستان امیر حمزہ کی بارہ جلدوں کو مصور کیا گیا اور دانا مصوروں نے ایک ہزار چار سو صفحات کی کتاب کی حیرت انگیز تصویریں بنائیں۔ چنگیز نامہ، ظفر نامہ، رزم نامہ، رامائن، نل دمن، کلیلہ دمنہ اور عیار دانش وغیرہ کتابوں کو بھی مصور کیا گیا۔"[24]

---

22. Ain-i-Akbari (Blochman , 1857) Vol.1, p.115
23. Ain-i-Akbari (Blochman , 1857) Vol. 1, p.115
24. Ain-i-Akbari (Blochman , 1857) Vol. 1, p.115

کتابی مصوروں کے لیے اکبر کے اشتیاق کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ داستانِ امیر حمزہ کو ایک سلسلۂ تصاویر کے ذریعہ مصوّر کیا گیا۔ ہمایوں نے اس عظیم کام کا آغاز کیا اور اکبر نے اس کو جاری رکھا۔ مآثر الامراء سے ہمیں مندرجہ ذیل اطلاع ملتی ہے :۔

"امیر حمزہ کی ہر جلد میں سو اوراق تھے۔ ہر ورق ایک کیوبٹ (12" [illegible] 18") لمبا تھا، ہر ورق پر دو دو تصویریں تھیں۔ ہر تصویر کے سامنے اس کی تفصیل خواجہ عطاء اللہ منشی قزوین کی خوبصورت تحریر میں لکھی تھی۔ نہ کسی نے کبھی ایسا کوئی شاہکار دیکھا ہے اور نہ کسی بادشاہ کی ملازمت میں ایسے فن کاروں کا کوئی ہمسر تھا اس وقت یہ کتاب امپیریل لائبریری میں موجود ہے"۔[25]

اکبر کی شاہی لائبریری میں ایسی کئی شاندار مصوّر کتابیں تھیں۔ اکبر کا مہابھارت کا نسخہ جو فارسی میں تھا اس میں 169 چھوٹی تصویریں تھیں۔ اس کتاب کو باتصویر بنانے پر چالیس ہزار (40,000) پونڈ خرچ ہوئے تھے۔

داستانِ امیر حمزہ کی تصویروں کی طرح چوبیس[24] تصویروں کا ایک مجموعہ جس میں جنگ، خون اور غارت گری کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ انڈین سیکشن وکٹوریہ البرٹ میوزیم جنوبی کنسگٹن میں محفوظ ہے۔ یہ تصویریں سولھویں صدی عیسوی کے وسط میں کشمیر میں بنائی گئی تھیں۔ یہ کسی ایسے مخطوطے کی تصویریں ہیں جس کا اب تک سراغ نہیں لگایا جا سکا ہے۔

رسیکا پریا مخطوطہ جو فنی خطابت اور ادبی تجزیہ پر ہے اس کی تصویریں بھی اس دور کی کتابی مصوری کی دلچسپ مثالیں ہیں۔ اس کتاب کا مصنف کیسوداس تھا اور یہ 1591ء میں لکھی گئی تھی یہ خالص ہندی تصنیف ہے جو ہندی یعنی ناگری رسم الخط میں لکھی ہوئی ہے مگر اس کی مصوری ایک مغل مصوّر نے کی ہے۔ بوسٹن میوزیم میں اس مخطوطہ کے اوراق ہیں جن پر دونوں طرف تصویریں ہیں میٹروپولیٹن میوزیم نیویارک میں [illegible] کے دو ورق، برٹش میوزیم میں ایک ورق اور باقی اوراق ڈاکٹر کمارا سوامی کی ملکیت میں اور کچھ راس (Ross) ذخیرہ میں موجود ہیں۔[26]

---

25. Catalogue of Indian Collections of the Museum of Fine Arts, Boston, Vol. I, p. 9.
26. Catalogue of Indian Collections of the Museum of Fine Arts, Boston, vol. I, p.21.

1560ء سے 1580ء کے دوران احمد نگر دکن کے دربار نے فن اور مصوری کی سرپرستی کی اور عجائبات کی نظموں کی تشریح کے طور پر تصویروں کی ایک اچھی تعداد پیدا کی۔ ان تصویروں کے تیکھے نقوش کا طرز وجے نگر کی دیوار کی تصویروں سے لیا گیا ہے۔

کتابی مصوری کے لیے مصوروں کی جماعت کا مل کر کام کرنا اس دور کا عام رواج تھا۔ مصوروں کا ایک گروہ کام کے مختلف حصوں کو مثلاً خاکہ بنانا، رنگ بھرنا، چہرے بنانا وغیرہ آپس میں بانٹ لیا کرتا تھا اور متفقہ طور پر کام کرتا تھا۔ اکبر نامہ کا کلارک مخطوطہ جنوبی کنسنگٹن میوزیم لندن میں محفوظ ہے۔ اسے چمکدار خوبصورت رنگوں میں بنایا گیا ہے جن میں خاص طور پر رنگ سرخ، زرد اور نیلا ہیں۔ اس میں مچھلی کا منظر ہے جس کا خاکہ مسکین نے بنایا تھا۔ چہرے ایک دوسرے مصور نے جس کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ شکلیں مادھو نے بنائیں اور تصویر سروان (SHRWAN) نے بنائی تھی۔[27]

ایک اور مخطوطہ "واقعات بابری (یعنی بابر کے زمانے کی تاریخ)" جو 1600ء میں لکھا اور مصور کیا گیا جبکہ اکبر کا دور حکومت تمام ہو رہا تھا (برٹش میوزیم 3714) اس میں اسمتھ (Smith) نے بائیس مصوروں کے نام دیکھے جنہوں نے اس کو مصور کرنے کے مختلف پہلوؤں پر کام کیا۔[28]

داراب نامہ کی جسے شاہنامہ کی کہانیوں سے اخذ کیا گیا تھا مصوری اکبر کے حکم سے کی گئی تھی۔ پہلے یہ شاہی لائبریری لکھنؤ میں رہی اب برٹش میوزیم (پی ایم اور آر 5 1615 سپلیمنٹری کیٹلاگ صفحہ 385) میں محفوظ ہے۔ اس تصویر (fol. 103 r.c.v.) میں دو مرد اور ایک عورت ایک پہاڑی منظر میں دکھائے گئے ہیں اور اس پر دستخط ہیں "عمل بہزاد اور اشتہا خواجہ عبدالصمد" اس کا مطلب ہے کہ تصویر بہزاد نے بنائی اور اس میں اصلاح خواجہ عبدالصمد نے کی۔ وہ اکبر کا محبوب مصور تھا۔

جہانگیر (1606ء سے 1628ء) اپنے باپ کی طرح اس فن کا بڑا سرپرست تھا۔ بہت سے مصور جو اس کے باپ کی ملازمت میں تھے اس کے ساتھ رہے۔

جہانگیر نے فن مصوری کی سرپرستی کتابی مصوری کے لیے نہیں کی بلکہ اپنی آرٹ گیلری کے لیے الگ سے تصویریں بنوانے کے لیے کی۔ لیکن وہ کتابوں کی مصوری کے ذوق سے بے بہرہ قطعی نہ

---

27. A History of Fine Art in India and Ceylon, V.A.Smith,p.462

28. A History of Fine Art in India and Ceylon, V.A.Smith,p.462

تھا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے یوم تاجپوشی پر وہ اپنے باپ کے کتب خانہ سے مصور مخطوطے لایا اور ان میں سے ہر ایک پر اپنے قلم سے تاریخیں لکھیں۔ باتصویر مخطوطہ "کلیلہ دمنہ" 1406ء میں مکمل ہوا اور برٹش میوزیم (Ms Add. 18579) میں محفوظ ہے وہ جہانگیر کے زمانہ کا ایک اہم نمونہ ہے۔

اکبر کے زمانہ میں اور خاص طور سے جہانگیر کے زمانہ میں مصوری پر مغربی اثر گہرا ہوگیا۔

> "یوروپی تصویروں کی نقول کا ایک البم جسے کیوداس نے بنایا تھا 1558ء میں مکمل ہوا۔ جہانگیر نے مغربی یوروپی تصویروں میں زیادہ دلچسپی لی اور بیشمار مذہبی اور غیر مذہبی تصویروں کے نمونے عیسائی پادریوں سے اور سر تھامس رو انگریزی سفیر اور پرتگالی تاجروں سے حاصل کیے۔ بیشتر یوروپی تصویریں چھوٹی چھوٹی تصویروں کی شکل میں بنائی گئی تھیں"[29]

شاہجہاں بھی جس نے 1628ء سے 1659ء تک حکومت کی مصوری کا دلدادہ تھا لیکن شاہی سرپرستی ان مصوروں کی مالی کفالت کے لیے کافی نہ تھی جو اکبر اور جہانگیر کے دور میں تھے اس لیے بازاری مصوروں کا ایک طبقہ ابھرا جنھیں عمائدین کبھی کبھی کام پر بلا لیتے تھے اس طرح کتابی مصوری اور فنِ مصوری کا زوال شروع ہوا جس کی اورنگ زیب کے زمانہ میں موت واقع ہوگئی۔

لیکن شاہی سرپرستی اور قدردانی میں کمی کے باوجود فنِ کتابی مصوری ان ریاستوں میں بدستور رہا جہاں ہندو حکمراں تھے۔

مہاراجہ بنارس کے ذخیرہ میں رام چرت مانس کا ایک خوبصورت باتصویر مخطوطہ ہے۔ یہ پانچ جلدوں میں ہے اور اس میں 500 سے زائد تصویریں ہیں۔ اس مخطوطہ کی جلدیں بنارسی کپڑے میں عمدہ طریقے سے باندھی گئی ہیں۔ یہ تقریباً اٹھارھویں صدی کا ہے اور اس پر 160,000 (ایک لاکھ ساٹھ ہزار) روپے خرچ ہوئے[30]

بلیوتھیک نیشنل Bibliotheque National پیرس میں بہت سے باتصویر مخطوطے ہندو مذہبی داستانوں پر موجود ہیں۔ جس میں ایک مخطوطہ جو بھگوت پران کا ہے اور جسمیں

---

29. Catalogue of Indian Collections of the Museum of Fine Arts, Boston, Vol.VI, p.II

30. A History of Fine Art in India and Ceylon, V.A.Smith, p.338

76 تصویریں ہیں خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔

5۔ لکڑی اور دھات پر کندہ کاری

جب بنگال میں مطبوعہ کتابوں کی مقبولیت بڑھی تو مصنفین اور ناشرین میں کتابی مصوری کا ذوق اور بڑھا۔ لیکن لوہے اور تانبے کی تختیوں پر کتابی مصوری کا میدان محدود تھا۔ بنگال کے مصوروں نے انیسویں صدی کے آغاز میں نرم دھاتوں اور لکڑی پر دست کاری شروع کی[31]

لکڑی پر نقاشی جو بنگالی کتابوں میں پیش کی گئی ہے وہ فنی نقطۂ نظر سے بہت زیادہ معیاری نہیں ہے مگر تاریخی اعتبار سے اہم ہے۔

فادر لاسن (Father Lawson) اس زمانہ کا مشہور لکڑی کا کندہ کار تھا، اور بنگال کے فنکاروں میں سے کئی نے اس سے تربیت حاصل کی تھی جن میں رام چندر رائے اور رام دھن سورن کار کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ وہ تانبے کی پلیٹوں پر بھی نقش نگاری کے ماہر تھے۔

بنگال کی تقادیم میں بیشتر کتابوں پر لکڑی کی چھپائی سے بنائی گئی تصویریں ملتی ہیں اور آج بھی تقادیم پر اس قسم کی تصویریں ہمیں بنگال کی قدیم روایات کی یاد دلاتی ہیں۔

اس کے علاوہ فولاد پر کندہ کاری کے بنگالی فنکار لکڑی پر کندہ کاری کے بھی ماہر تھے۔ اور ان میں سے بعض نے بیرونی ماہرین سے تربیت حاصل کی تھی۔ ان فنکاروں نے لیاقت کے اعلیٰ مدارج طے کیے جیسا کہ کلکتہ بک سوسائٹی کی دوسری سالانہ رپورٹ (19 — 1818) کی مندرجہ ذیل سطور سے معلوم ہوتا ہے:۔

> "جائس (Joyce) کا علم شیشے اور نجوم پر ایک مکالمہ ... کاشی ناتھ مستری نے جو ایک مقامی فنکار ہے دھات کی تختیوں پر اتنی قابل تعریف کندہ کاری کی ہے کہ فراموش نہیں کی جا سکتی۔ نیز مقامی فنکاروں نے ثانیہ پر خوبصورت کندہ کاری کے فن میں خوب ترقی کی ہے۔"

اولین چھپی ہوئی کتاب جس پر کندہ کاری سے تصویریں بنائی گئی ہیں بھارت چندر کی تصنیف آنند منگل ہے۔ اس کتاب کے ناشر مرحوم گنگا کشور بھٹاچاریہ تھے اور یہ 1816ء میں کلکتہ میں

---

31. Bangiya Sahitya Parishad Patrika,2nd Issue of 46th year.

چھپی تھی۔ اس میں چھ تصویریں ہیں جو لکڑی اور تانبہ کی کندہ کاری سے بنائی گئی ہیں۔

مندرجہ ذیل کتابوں میں لکڑی کی کندہ کاری ہے:۔

(1) کالی کیولیہ دینی مصنف نند کمار بھٹاچارجی۔ شائع شدہ سنہ 1836ء

(2) بھاگوت گیتا جو سنہ 1836ء میں پتامبر سین سوادا یا کے پریس میں چھپی۔

(3) نوتن پنجکا جو نوادیپ سے 1242 و 1243 بکرمی سمبت میں شائع ہوئی۔

(4) ہرپاروتی منگل مصنف رام چندر ترکالنکار ساکن ہری نوی سنہ 1857ء۔

(5) آنند منگل دوسرا ایڈیشن جو پورن چندر ودیا پریس سے بکرمی سمبت 1264 میں چھپا۔

(6) تیج دشی دوسرا ایڈیشن شائع شدہ سنہ 1852ء۔

ان مندرجہ بالا کتابوں کی تصویریں ساہتیہ پرشد پتریکا کے سال 46 شمارہ نمبر 2 میں 1346 بکرمی سمبت میں چھپی تھیں۔

بنگالی کتابوں کی ایک فہرست جس میں لکڑی اور دھات کی کندہ کاری ہے حسب ذیل ہیں[32]

(1) سنگیت ترنگا مصنف رادھا موہن داس۔ یہ کتاب سنہ 1818ء میں شائع ہوئی اس میں چھ کندہ کی ہوئی تصویریں ہیں جنھیں رام رائے نے بنایا تھا اس میں "راگ بلاش اور دیپک راگ" دکھایا گیا ہے۔

(2) گوری بلاش مصنف رام چندر ترکالنکار۔ یہ کتاب سنہ 1824ء میں شائع ہوئی اس میں چار لکڑی اور تانبہ سے کندہ کی ہوئی تصویریں ہیں جن میں درگا دیوی کو دس ہاتھوں کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ یہ کندہ کاری بشومبر اچاریہ نے کی تھی۔

(3) گنگا بھکتی ترنگنی مصنف درگا پرشاد بھوپادھیائے۔ یہ کتاب سنہ 182[illegible]ء میں شائع ہوئی اس میں تصویریں بشومبر اچاریہ نے بنائی تھیں جن میں سب سے زیادہ اہم بھاگیرتھ گنگا کی ہے۔

(4) بھاگوت گیتا مترجمہ رام رتن نیایہ پنچانن۔ یہ کتاب سنہ 1824ء میں شائع ہوئی۔

---

32. Prabasi, 1353 B.S., Sravan, pp 393.-95 (illus).

(5) بدّ مود ترنگنی مصنفہ جے نجیو شرما۔ یہ کتاب 1825ء میں شائع ہوئی اسکی تصویروں میں جو مادھوچندر داس نے بنائی ہیں "وکرماسین کے دربار کا منظر" بہت مشہور ہے۔

(6) بترس سنگھاسن جو بشوا ناتھ دیو کے پریس میں 1826ء میں چھپی۔ اس میں بشومبر اچاریہ کی بنائی ہوئی دو تصویریں ہیں جس میں بکرمادتیہ اور بترس سنگھاسن کے دربار کا منظر دکھایا گیا ہے۔

(7) آنند لاہری مصنفہ رام چندر ودیالنکار۔ یہ کتاب 1826ء میں شائع ہوئی اس میں ایک تانبہ کی کندہ کاری کی تصویر ہے جس میں "سری راجیشوئی" کو دکھایا گیا ہے۔ اسے روپ چند اچاریہ نے بنایا تھا۔

(8) آنند منگل 1829ء میں مہتاب پریس میں شائع ہوئی۔ اس میں تانبہ کی کندہ کاری کی دس تصویریں ہیں جنہیں بیرچندر دتا، روپ چند اچاریہ، رام دھن سورنکار اور رام ساگر چکرورتی نے بنایا تھا۔

اس میں سے کچھ کتابیں (نمبر 6، 7، 8) بنگیہ ساہتیہ پریشد لائبریری کلکتہ میں محفوظ ہیں۔

* * *

بابِ نہم

لائبریری تکنیک اور نظام

1۔ درجہ بندی۔
2۔ کیٹلاگ گری۔
3۔ عمارت۔
4۔ طریقۂ انتظام۔
5۔ عملہ، حیثیت اور تنخواہ۔
6۔ تحفظ۔

اب ہم ان مباحث کو جو کتب خانوں کی ترقی و فروغ کے سلسلہ میں گزشتہ ابواب میں چھیڑے گئے تھے زمانۂ قدیم سے شروع کرتے ہوئے ذرا تفصیل سے بیان کریں گے۔ اب تک ہم نے ہندوستان کے علمی مراکز کا تفصیلی نقشہ پیش کیا ہے۔ ان کے اغراض و مقاصد اور ان میں استعمال ہونے والے سامان اور طریقے بیان کیے ہیں۔ اب ہم اس مضمون کے دوسرے پہلوؤں کی طرف آتے ہیں یعنی ان اداروں میں استعمال ہونے والے تکنیکی طریقے اور طریقۂ انتظام۔

بہت سست روی کے ساتھ اداروں نے تکنیکی اور انتظامی طریقوں کے موجودہ انداز کو وضع کیا۔ جیسے جیسے ادارے بڑھے اور ان کا میدانِ عمل وسیع ہوا ان کے انتظامی طریقے بتدریج معیاری ہوتے گئے۔ کتب خانہ کے نگراں کا عہدہ دوسرے فرائض سے عملاً مختلف ہونے کی بنا پر وجود میں آیا۔ نگہداشت

اور تحفظ پر خصوصی توجہ کی گئی تحریری مواد کو ضابطے کے تحت مرتب کرنے کے پیش نظر ان کی درجہ بندی کی گئی۔ اس باب میں ان تمام امور حصولِ علم کے طریقوں، کتابوں کی درجہ بندی، کیٹلاگ گری، طریقۂ انتظام عمارت، عملہ، اس کی تنخواہ اور حیثیت اور کتابوں کے تحفظ کی تکنیک اور طریقوں پر مزید مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ مزید براں لائبریری کے مقاصد کی تکمیل و ترویج میں خطاطوں نے خاص طور سے چھپائی کی ایجاد سے پہلے جو بڑا اہم کردار ادا کیا اس کہانی کو مکمل کرنے کے لیے ہم نے کوشش کی ہے کہ لائبریری تحریک میں ان کے حصہ کی قدر و قیمت کا تعین بھی کیا جائے اور ان کی سماجی حیثیت کا ایک جائزہ بھی لیا جائے۔

1۔ درجہ بندی

یہ حقیقت ہے کہ شروع ہی سے انسان نے چیزوں کے نام رکھنے اور ان کو ایک دوسرے سے ممیز کرنے کی کوشش کی ہے۔ گو بہت ابتدائی شکل ہی میں سہی لیکن انسان میں شعور آنے سے پہلے ہی درجہ بندی شروع ہو چکی تھی۔ اس طرح "درجہ بندی کی تاریخ اگر وسیع مفہوم میں دیکھا جائے تو انسانی فکر کی تاریخ ہے"۔

صدیوں میں اور اصولِ ارتقاء کے تحت انسانی فکر کو فروغ ہوا اور ابتدائی مفکرین نے ہی چیزوں کی درجہ بندی اپنے خیال و فہم کے مطابق کرنی شروع کر دی۔ قدیم ممالک جیسے شام اور مصر نے حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے بہت پہلے لائبریری کے سامان کی درجہ بندی کا ایک خام طریقہ وضع کر لیا تھا۔

لیکن تمام علوم کی درجہ بندی کی کوشش افلاطون (428-347 B.C.) سے بھی پہلے ہندوستانی ماہرینِ فلسفہ نے کی تھی۔ ہندوستان کے قدیم مفکرین نے علوم کا مکمل جائزہ لیا اور اسے حصوں میں تقسیم کیا اس کے بعد حصوں کی شاخیں اور ماتحت شاخیں ایک دوسرے کے باہم رشتہ کے اعتبار پر قائم کیں۔

افلاطون کے زمانہ ہی سے یورپی علماء اور فلسفیوں نے اسی روش پر چلنے کی کوشش کی اور فرانسس بیکن (1605) سے پہلے تقریباً تیس اسکیمیں عالم وجود میں آئیں۔ جن میں خاص طور سے قابلِ ذکر پورفائری (Porphyry) (305 A.D) کپیلا (Capella) (439 A.D.) راجر بیکن (Roger Bacon) (1266 A.D) آلڈس مانوٹیس (Aldus Manulius) (1498 A.D.) اور کونراڈ گیسنر (Conrad Gasner) (1548 A.D.) وغیرہ ہیں۔

٭ ٭ ٭

درجہ بندی — فلسفیانہ

چیزوں کی عقلی لحاظ سے درجہ بندی میں ہندوستان کا ذہنی رجحان دکھانے کے لیے ہم نمونہ کے طور پر چند فلسفیانہ منصوبوں کا یہاں ذکر کریں گے۔

جین مذہب لامعلوم زمانۂ قدیم سے چلا آتا ہے۔ اس مذہب کا مبلغ اول رسبھ دیو تھا اور آخری استاد مہاویر جو چھٹی صدی قبل مسیح میں تھے۔ سب ملا کر چوبیس رہنما تھے جنھوں نے نجات حاصل کی۔

جین فلسفیوں نے علوم کی درجہ بندی اسطرح کی ہے :-[1]

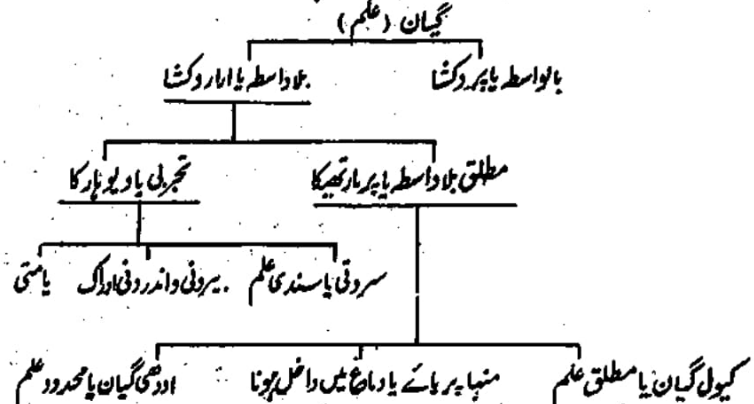

جین فلسفیوں نے مادہ کی درجہ بندی اس طرح کی ہے :-[2]

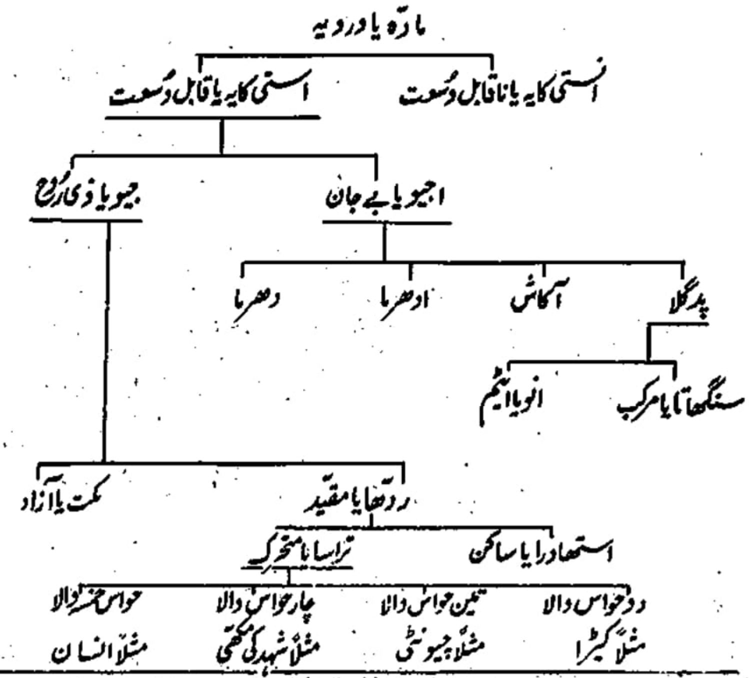

1. An Introduction to Indian Philosophy, Datta and Chatterjee pp.78-79.

2. An Introduction to Indian Philosophy, Datta and Chatterjee, p.94

یہاں پر درویہ یا مادہ ایک نوع ہے جس کو جسم کا وجود دے دیا جاتا ہے اور پھر درویہ کو آتی کا یہ یا جسم کی طرح موجود اور انستی کا یہ یا بغیر جسم کے ناموجود میں تقسیم کر دیا گیا۔

دوسری منزل کا فرق ہے زندگی۔ جب زندگی کو اس میں شامل کر دیا جاتا ہے تو دو قسمیں پیدا ہو جاتی ہیں جیو یا ذی روح اور اجیو یا بے جان۔ یہاں تک اصول وسعت و گہرائی پورفائری (Porphyry) کے درخت سے بہت مشابہ نظر آتا ہے۔ دونوں نظام درجہ بندی تقسیم کو انفرادی حد تک جاری رکھتے ہیں۔ جینیوں نے تقسیم کو سائنسی بنیاد پر مکمل کیا اور منفی مضامین فروغ دیئے۔ جبکہ پورفائری کا درخت نامکمل ہے اور منفی مضامین کو فروغ دینے میں بھی ناکام رہا۔

ہندو نیایہ (Nyaya) فلسفہ کی بنیاد ایک عالم گوتم (اکش پاد) نے ڈالی تھی۔ یہ فلسفہ صحیح طرز فکر کی شرائط اور سچے علم کی تفسیر کرتا ہے۔ نیایہ (Nayaya) فلسفہ کے مطابق علم مقاصد کا اظہار ہے اور اس کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے:[3]

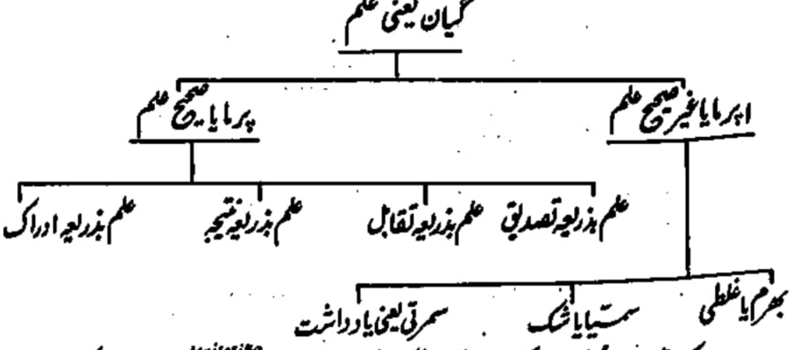

کناڈا جسے اُلوکا بھی کہتے ہیں ایک عظیم عاقل تھا اس نے ویشیشکا (Vaisheshika) نظام فلسفہ کی بنیاد ڈالی یہ نیایہ (Nyaya) کی طرح حقائق و دلائل پر مبنی نظام ہے اور دونوں نظاموں کا مقصد آخر ایک ہی ہے یعنی فرد کی نجات۔

اس نظام کے مطابق علم اور مادہ کی تقسیم حسب ذیل ہے:[4]

گیان یعنی علم

(1) درویہ (مادہ)، (2) گن (صفت)، (3) کرم (عمل)، (4) سامانیہ (عام)، (5) وشیش (خاص)، (6) ساماویا (موجود ہونا)، (7) ابھاؤ (غیر موجود)

3. An Introduction to Indian Philosophy, Datta and Chatterjee, p.173.

4. An Introduction to Indian Philospphy, Datta and Chatterjee, pp.227-252.

دروّیہ یعنی مادہ کو نو شاخوں میں بانٹا گیا ہے :۔

(ا) پرتھوی یا زمین

(ب) جل یا پانی

(پ) تیج یا آگ

(ت) وایو یا ہوا

(ٹ) آکاش یا ایتھر (Ether)

(ث) کال یا وقت

(ج) دِیک یا خلاء

(چ) آتما یا رُوح

(ح) مانس یا دماغ

افادی درجہ بندی

ہم نمونہ کے طور پر چند قدیم ہندوستانی نظام ہائے درجہ بندی بیان کر چکے ہیں۔ ان سب نظاموں کا مقصد چیزوں کا باہم تعلق تلاش کرنا ہے۔

لیکن افادی درجہ بندی یا کتابی درجہ بندی کا مقصد تمام موجودہ علوم کی کتابوں کو عملی نقطۂ نظر سے درجات و ماتحت درجات میں تقسیم کرنا ہے۔

قدیم ہندوستانی مفکرین نے افادی نقطۂ نظر سے کائناتِ علم کو حسب ذیل حصوں میں تقسیم کیا :۔

1۔ دھرم۔ 2۔ ارتھ۔ 3۔ کام۔ 4۔ موکش

ہندوؤں کے ظاہری علوم کو سُرُتی کہتے ہیں جو چار ویدوں میں موجود ہے۔ ویدوں نے علم کو دو بڑے حصوں میں بانٹا "پرا اور اپرا"۔ پرا ودیا کا مقصد ہے صداقت آخری جبکہ اپرا ودیا میں وید اور چھ ویدانگ ہیں یعنی شکشا۔ کلپا۔ ویاکرن۔ نرکت۔ چھند اور جیوتش۔

چھندوگیا اپنشد (VII 1.4) سے ہمیں علم کی مزید تفصیلی تقسیم معلوم ہوتی ہے۔ جو حسب ذیل ہے :۔

رگ وید، یجر وید، سام وید، اتھر وید، اتہاس پُران، ویدنام وید (قواعد)،

پتریا، راسی، دیوا، ندھی، دکوواکیا، ایکائن، دیوودیا، سرب اور دیوجن ودّیا، برہادرانکیہ اپنشد (4.10 ll) سے ہمیں ایسی ہی ایک فہرست ملتی ہے:۔

کوٹلیہ نے جو ارتھ شاستر کا مصنف ہے (ننا۔ ؛) کائناتِ علم کو چار حصّوں میں تقسیم کیا ہے،

(1) انوکشکی۔

(2) تریئی۔

(3) وارتا۔

(4) ڈنڈنیتی۔

انوکشکی میں سانکھیہ، یوگ اور لوکایتا ہیں۔ تریئی میں تین وید، اتھروید، اتہاس وید اور چھ ویدانگ ہیں، زراعت، مویشی پالنا اور تجارت وارتا میں ہیں اور ڈنڈنیتی میں علم حکومت ہے۔

شکرنیتی (iii - iv) نے علم کو مندرجہ ذیل 32 حصّوں میں تقسیم کیا ہے:۔
رگ وید، سام وید، یجروید، اتھروید، آیوس، دھنس، گندھری تنتر شکشا، دیاکرن، کلپا، نروکت، جیوتش، چھند، مماسا، ترک، سانکھیا، ویدانت، جوگ، اتہاس، پران۔ سمرتی، ناستک، ارتھ شاستر، کام شاستر، شلپ شاستر، النکار، کادیہ، دیش بھاشا، اواسر وکتی، یون ماتا اور دیش ادی دھرم۔

اس کے علاوہ ہمیں 64 فنون و سائنس رامائن (1.95) بھاگوت پران (36 و45، X) مہابھارت (57 .1. ؛) رساگمارچرتا (21 ۔ ii) کام سُوتر ولت وستار وغیرہ سے معلوم ہوتے ہیں۔*

ہندوؤں کی طرح جین اور بُدھ لوگوں نے اپنے مذہبی اور غیر مذہبی لٹریچر کو عملی نقطۂ نظر سے مختلف حصّوں اور چھوٹے حصّوں میں بانٹا ہے۔

---

* سر برجندر ناتھ سیل نے اپنی کتاب "پازیٹو سائنسز آف این شینٹ ہندوز" میں کچھ قدیم افادی نظاموں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

* Sir Brojendranath Seal in his book "Positive Sciences of the Ancient Hindus" described some of ancient utilitarian schemes in detail.

جین حضرات نے اپنی مذہبی لٹریچر کو مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا:۔

(1) 12 انگ
(2) 12 اُپ انگ
(3) 10 پَرکیرنا
(4) 6 چید سوتر یا چید سوتر
(5) 2 انفرادی کتابیں
(6) 4 مُول سوتر

بودھی لٹریچر کی درجہ بندی

بدھ مذہبی لٹریچر کے موجودہ شکل میں مرتب ہونے سے پہلے بدھ اس وقت کے بدھ لٹریچر کو جسے "بدھ وچنم" کہا جاتا ہے۔ شکل اور نفسِ مضمون کے اعتبار سے 9 یا 12 حسب ذیل حصوں میں تقسیم کرتے تھے۔

(الف) پالی لٹریچر کے مطابق:۔

(1) ستّا
(2) گییا
(3) ویاکرن
(4) گاتھا
(5) اُدانا
(6) اتی وُتکا
(7) جاتکا
(8) ابھوت دھمّا
(9) [illegible]

(ب) [illegible]

(1) ستّا۔ (2) گییا۔ (3) ویاکرن۔ (4) گاتھا
(5) اُدانا۔ (6) ندانا۔ (7) اودانا۔ (8) اتی وُتکا

(۹) مشاکا۔ (۱۰) ویپلیا۔ (۱۱) ابھوتادھما۔ (۱۲) اپدیش۔

بعد میں مذہبی لٹریچر کی تقسیم بدھ اس طرح کرتے تھے۔[5]

تری پٹکا (TRIPITAKA)

(۱) دنے Vinaya (۲) ستا (Sutta) (۳) ابھی دھما (Abhidhamma)

1۔ دنے کی مزید تقسیم کی جاتی تھی۔

(الف) ستا دبھنگ۔ (ب) کھنڈاکا۔ (پ) پری وار۔

2۔ ستا (ب) کی ماتحت تقسیم 5 نکائیوں میں کی جاتی تھی جو حسب ذیل ہیں۔

(الف) ڈگھا (ب) مجھما۔ (پ) سامتیا (ت) انگوترا (ٹ) کھدانکایہ۔

3۔ ابھی دھما کی ماتحت تقسیم اس طرح تھی۔

(الف) دھما سنگنی۔ (ب) دبھنگ۔ (پ) دھاتو کتھا۔ (ت) پگالا پنتی

(ٹ) کتھا وتھو (ث) یماکا۔ (ج) پتھانا۔

اب یہ بالکل واضح ہوگیا کہ قدیم ہندوستان میں راہبانہ اور یونیورسٹی کتب خانوں میں... مخطوطوں کی درجہ بندی ان کی شکل اور نفس مضمون کی بنیاد پر ہوتی تھی اور کسی نہ کسی صورت میں مذکورہ درجہ بندی نظام استعمال ہوتا تھا۔ نیپال اور تبت میں اب تک راہبانہ کتب خانوں میں لاتعداد مخطوطوں کی درجہ بندی کے لیے وہی نظام درجہ بندی استعمال ہوتا ہے۔

عہد مغلیہ میں اکبر کی لائبریری میں کتب کی درجہ بندی مندرجہ ذیل مضامین میں کی جاتی تھی۔[6]

(الف) علم نجوم (ب) فلکیات۔ (پ) تفسیر۔ (ت) جیومیٹری۔ (ٹ) قانون۔

(ث) طب۔ (ج) موسیقی۔ (چ) لسانیات۔ (ح) فلسفہ۔ (خ) تصوف۔

(د) دینیات۔ (ڈ) حدیث۔

مذکورہ بالا مضامین کی تقسیم کے ساتھ اکبر کی شاہی لائبریری میں زبان اور اسلوب کے مطابق بھی کتابوں کی ترتیب کی جاتی تھی اور کتابوں کو قیمت کے مطابق بھی کیا جاتا تھا۔ حضور والا کی لائبریری کو

---

5. Gandha Vámsa, Journal of the Pali Text Society, 1886.

6. Ain-i-Akbari (Blochman), pp. 109-110

مختلف حصوں میں بانٹا جاتا ہے۔ کچھ کتابیں باہر اور کچھ اندرون حرم رکھی جاتی ہیں۔ لائبریری کے ہر حصہ کتاب کی قیمت اور سائنسی مضامین کے مطابق (جو کتابوں میں بیان کیے گئے ہیں) تقسیم کیا جاتا ہے۔ نثر کی، نظم کی کتابیں، ہندی، فارسی، یونانی، کشمیری اور عربی کتابیں علاحدہ علاحدہ رکھی جاتی ہیں"۔ [7]

فیضی کا ذخیرۂ کتب جو شاہی لائبریری کو منتقل کر دیا گیا تھا تین مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

(1) نظم، موسیقی، طب اور علم نجوم

(2) فلسفہ، لسانیات، تصوف، فلکیات اور جیومیٹری

(3) دینیات، فقہ اور تفسیر۔ [8]

دارے ([illegible]) خاندان کی لائبریری جو پونا میں ہے اور جس میں 3000 مخطوطے ہیں، ہمیں دلچسپ معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس لائبریری کا ذخیرہ اور اس کا تحفظ چھ پشتوں سے چلا آتا ہے۔ اس ذخیرۂ کتب کی ابتدا پرشوتم نے کی جو منتر شاستر میں مہارت رکھتے تھے اور رنگو نرائن راجہ بہادر کے پروہت تھے۔ اُنیس مہینے تک وہ بنارس میں رہے جہاں انھوں نے بدست خود بہت سی کتابیں نقل کیں اور 1900 روپے دیکر بہت سی کتابوں کی نقل کرائی اس ذخیرے کے بعض مخطوطے ایسے ہیں جن پر تاریخ کتابت بھی ہے اور یہ 1659ء سے 1935ء تک کے ہیں۔

اس ذخیرہ میں 250 سے 300 تک ہندوستانی ہیں۔ جن میں سے پندرہ دستان میں 304 مخطوطے جانچ کیے جا چکے ہیں۔ پندرہ دستانوں کے درجات یہ ہیں۔

(1) وید۔ (2) پُرانا۔ (3) اپنشد۔

(4) تانتر۔ (5) منتر شاستر۔ (6) یوگ۔

(7) ویدانت۔ (8) سرِوتا۔ (9) سمرتا۔

(10) دھرم شاستر۔ (11) ویدیاکا۔ (12) جیوتشی۔

(13) ساہتیہ۔ (14) ستوتر۔ (15) ویدک سوکت۔ [9]

دارے کے ذخیرۂ کتب کے مختصر جائزے سے یہ واضح ہو گیا کہ نجی کتب خانے بھی مخطوطوں کو

---

7. Ain-i-Akbari (Blochman), pp. 109-110

8. Ain-i-Akbari (Blochman), p. 550.

9. P.O.No. 1 and 2 of 1939.

محفوظ رکھتے اور ان کی درجہ بندی کرتے اور ممکن ہے کہ وہ ہر دستان کی فہرست بھی رکھتے تھے
جین گیان بھنڈاروں میں درجہ بندی میں ہر کتاب کا ایک مخصوص مقام ہوتا تھا مخطوطے اور وہ صندوق جن میں مخطوطے رکھے جاتے تھے ان پر اپنے اپنے نمبر دیئے جاتے تھے۔ نمبر شمار کے لیے 1، 2، 3، 4 وغیرہ نمبر استعمال ہوتے تھے۔ لیکن کہیں کہیں ہندسوں کے بجائے 24 ترتھنکروں کے نام لکھے جاتے تھے۔ 20 دہار مان ترتھنکروں کے نام۔ گیارہ شاگردوں یا مہاویر گندھروں کے نام بھی استعمال ہوتے تھے۔
ایسی صورت میں پہلے صندوق پر مہاویر کا نام لکھا جاتا دوسرے پر اجیت ناتھ اور اسی طرح چوبیسویں صندوق پر مہاویر کا نام آتا تھا۔ اگر اس کے آگے ضرورت پڑتی تو جس نام دہار مان ترتھنکروں کے استعمال ہوتے اور مہاویر کے شاگردوں وغیرہ کے نام بجائے ہندسوں کے لکھے جاتے تھے[10]
یورپ کی مذہبی (راہبانہ) لائبریریوں میں سولھویں اور سترھویں صدی میں اسی قسم کی درجہ بندی کا طریقہ رائج تھا جس کا نام تھا "کالجیٹ پریس مارکنگ سسٹم"۔ اس نظام کے مطابق کتاب بندوں، الماریوں اور کتابوں پر پریس نشان بنانے کے حروف اور ہندسے لکھے جاتے تھے[11]

2 ۔ کیٹلاگ گری

قدیم ہندوستان کے کتب خانوں میں طریقۂ کیٹلاگ گری کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا دائرہ سردست بہت محدود ہے۔ لیکن چند موجودہ کیٹلاگوں سے جو دو تین سو برس پرانے ہیں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ صندوق کا نمبر، مخطوطہ کا نمبر، مخطوطہ کا عنوان، نمبر صفحات اور کبھی کبھی مصنف کا نام کیٹلاگوں میں لکھتے تھے۔ برونتی پانیکا جس کے مدیر سری من جینوی جیاجی ہیں ایسے کیٹلاگ کی ایک مثال ہے۔
نرنیئے ساگر پریس نے بہت سی ایسی کتابیں شائع کی ہیں مثلاً درتنا رتناکر، چھندشاستر، وغیرہ جو کیٹلاگ گری کے معاملہ میں ادارت کے اعتبار سے یکتا ہیں۔
گوندراچاریہ (سولھویں صدی عیسوی) کی ذاتی لائبریری میں کیٹلاگ گری درجہ بندی کے اعتبار سے تھی۔ یہ کیٹلاگ مہامہاپادھیایہ دی پی، دیویدی نے بنارس کے کسی مٹھ سے حاصل کیا تھا جو گوندراچاریہ سوچی پترم کے نام سے گائیکواڑ اورینٹل سیریز (Gaekwad's Oriental Series) میں

---

10. Jaina Chitra Kalpadruma, S. Nawab, p.104.

11. An Introduction to Library Classification, Sayers, pp.83-84.

نمبر XVII پر چھپا ہے

اس کیٹلاگ میں 2192 مخطوطوں کی فہرست ہے اور ان کی مضامین وار ترتیب اس طرح ہے:

مضامین	نمبر شمار مخطوطہ
1 ۔ رگ وید	1 _ 4
2 ۔ اسوالیان سوتر	5 _ 24
3 ۔ رگ وید شاکھا	25 _ 31
4 ۔ یجروید سوتر وغیرہ	32 _ 64
5 ۔ کھیل (وید)	65 _ 103
6 ۔ ویاکرن	104 _ 165
7 ۔ نیایہ	166 _ 222
8 ۔ ویدانت	223 _ 338
9 ۔ سوتر	339 _ 341
10 ۔ یوگ	342 _ 354
11 ۔ مماسہ	355 _ 371
12 ۔ (الف) ۔ سروتا پرماپانا	372 _ 421
(ب) ۔ سروتا اپس تھا	422 _ 434
(پ) ۔ سروتا بیرانکلسا	435 _ 458
(ت) ۔ سروتا کاتیانیا	459 _ 553
(ٹ) ۔ سروتا اسوالنا	554 _ 571
(ث) ۔ سروتا سام سوتر	572 _ 586
13 ۔ سمرتی	587 _ 656
14 ۔ سمرتا پراکرتا	657 _ 798
15 ۔ جیوتش	799 _ 905
16 ۔ ویدیا	906 _ 1099

17_ منتر	1100 _ 1184
18_ دھرم	1185 _ 1230
19_ پوارانا	1231 _ 1465
20_ پراناگما	1466 _ 1629
21_ ساہتیا	1630 _ 1736
22_ تانتر	1737 _ 1820
23_ مہاتما	1821 _ 1870
24_ کوشا	1871 _ 1898
25_ (الف) کاویہ	1899 _ 1944
(ب) الکار	1945 _ 1962
(پ) ناٹک	1963 _ 1990
(ت) سنگیت	1991 _ 1999
(ٹ) چترپو	2000 _ 2010
(ث) بھان	2011 _ 2016
(ج) چھند	2017 _ 2024
26_ ناستکا	2025 _ 2028
27_ (الف) نیتی	2029 _ 2034
(ب) کتھا	2035 _ 2049
(پ) کوتک	2050 _ 2066
28_ پریکشا	2067 _ 2080
29_ چتوسستی کلا۔	2081 _ 2144
30_ سلپ	2145 _ 2162
31_ سالی ہوترا۔	2163 _ 2173
32_ ماتاگرنتھ	2174 _ 2192

-:- :- :-

3 ـ صفحات کی نمبر شماری

جین لوگوں میں یہ دستور تھا کہ کسی تصنیف کے مکمل ہونے کے بعد اشعار گن لیا کرتے تھے۔ 32 الفاظ مل کر ایک شعر بنتا تھا۔ اس طرح کتاب کے تمام الفاظ کے شمار سے یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ اس میں کتنے اشعار ہیں۔ ایک سو، پانچ سو، ایک ہزار اشعار کے بعد وہ ایک لفظ "گرنتھا گرام" استعمال کرتے تھے۔ مخطوطے کے ختم پر تصدیقی نوٹ کے طور پر لکھتے تھے "سرو گرنتھم"[12]

مخطوطوں پر صفحات کی نمبر شماری کا جین لوگوں کا مخصوص طریقہ قابل غور ہے۔ بائیں صفحات پر عام ہند سے لکھے جاتے تھے اور دائیں صفحات پر حروف اور الفاظ کے ٹکڑے لکھے جاتے تھے مثلاً "سوا۔ ستی" وغیرہ۔ یہ ہندسوں کے بجائے استعمال ہوتے تھے۔ اس طرح نمبر 1 کے لیے "سوا" نمبر 2 کے لیے "ستی"۔ نمبر 3 کے لیے "سری"۔ نمبر 100 کے لیے "سو" اور 200 کے لیے "سود" وغیرہ استعمال کیے جاتے تھے[13]

عام طور سے ہند و مخطوطوں کے صفحات کے بجائے اوراق پر نمبر ڈالے جاتے تھے۔ جنوبی ہند کے مخطوطوں میں ہر ورق کے پہلے صفحہ پر نمبر ملتے ہیں جبکہ ہندوستان کے دوسرے حصوں کے مخطوطے پر ہر ورق کے دوسرے صفحہ پر اور بعض اوقات دونوں کونوں پر یعنی بائیں طرف اوپر اور دائیں طرف نیچے کی جانب۔ تمام مخطوطوں میں (سوائے بعض جین مخطوطوں کے) ایک سے 300 تک نمبر استعمال کیے گئے ہیں[14]

ملابار کے ابتدائی زمانہ کے مخطوطوں میں صفحات کی نمبر شماری کا ایک نیا طریقہ نظر آتا ہے وہ ہندسوں کے بجائے حروف استعمال کرتے تھے۔ پہلا صفحہ "سری" سے شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد حروف مندرجہ ذیل طریقے سے استعمال ہوتے تھے:۔

نا=1، ننا=2، نیا=3، شکرا=4، جھرا=5، ہا=6، گرا=7، پرا=8،
درے=9، ما=10، تھا=20، لا=30، پٹا=40، با=50، ترا=60،
ترو=70، چا=80، نا=90 ([illegible])، نا=100 (Na)۔ گیارہ اور بارہ وغیرہ کے لیے ما اور تا۔

---

12. Jaina Chitra Kalpadruma, p. 107.
13. Gaekwad Oriental Series, Vol.LXXVI, p.40
14. Indian Paleography, Buhler, p. 86

ما اور نناوغیرہ۔ 12 اور 13 وغیرہ کے لیے تھا اور نا۔ لانا اور نا ملا کر استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح 200 اور 300 دو یا تین حروف جن سے ان ہندسوں کی نمائندگی ہوتی ہو استعمال کیے جاتے تھے۔

پندرھویں صدی کے بعد ملاباری ہندسے ایک سے نو تک داہنی طرف استعمال ہوتے تھے[15]

تانبہ کی تختیوں پر اوپر کی طرف نمبر ملتے ہیں[16] لیکن پہلی تختی پر نمبر پیچھے کی طرف ہے[18] کہیں کہیں اوپر اور پشت دونوں پر نمبر ملتے ہیں[19]

لائبریری کی عمارت

ادبی اور کتبہ خوانی کے شواہد سے اور عمارتوں کے باقی کھنڈرات سے یہ ثابت کرنا مشکل نہیں ہے کہ مخطوطوں کے ذخیرے کو رکھنے کے لیے عمارت کا الگ بندوبست کیا جاتا تھا۔

بھاسکر ساہتیہ واحد موجودہ ادبی متن ہے جس میں تجویز پیش کی گئی ہے کہ لائبریری عمدہ پتھر کی بنی عمارت میں ہونا چاہیے[20]

تبتی ذرائع کے مطابق نالندہ یونیورسٹی میں ایک شاندار لائبریری تھی جس کا نام دھرم گنج تھا، یہ تین عظیم عمارتوں پر مشتمل تھی۔ جن کے نام رتن ساگر۔ رتن داوھی اور رتن رنجیکا تھے۔ ان میں رتن داوھی نومنزلہ عمارت تھی جس میں پرجنا پرمیا سوتر کے مشہور مخطوطے رکھے ہوئے تھے۔

بدھ عہد میں بے شمار خانقاہی کتب خانے فروغ پاتے رہے۔ چینی سیاح ہمیں خانقاہی کتب خانوں کے بارے میں قابل قدر معلومات فراہم کرتے ہیں یہ کتب خانے مذہبی اداروں کا ایک جزو لاینفک تھے۔ ہوان سانگ نے جب کوشل کا دورہ کیا تو اس نے تقریباً سو (100) راہب خانے دیکھے۔ ان میں ایک کبوتر والی خانقاہ تھی جس کی بنیاد ناگار جن نے

---

15. J.O.I., Vol. 6, No.2-3.
16. Epi.Ind., Vol.III, pp.156,300.
18. Epi.Ind., Vol.XXXI, Plates between pp.4-5.
19. Epi.Ind., Vol.VI,pp.88 ff.+plate.
20. J.A.H'R.S.Vol.8,p.217.

ڈالی تھی۔[21] اس خانقاہ کی لائبریری عمارت کے سب سے اوپر والے ہال میں واقع تھی، جو حفاظتی وضمانتی نقطۂ نظر سے معیاری جگہ تھی۔

راہبانہ کتب خانوں کے اندرونی انتظامات کے بارے میں ہم براہ راست بہت کم اطلاع حاصل کر سکتے ہیں۔ نیپال، تبت اور ہندوستان کی دوسری سرحدی ریاستوں کی خانقاہی لائبریریاں جواب تک قدیم روایات کو قائم رکھے ہوئے ہیں ہندوستان کے راہبانہ فنِ تعمیر سے متاثر نظر آتی ہیں ان کتب خانوں میں مخطوطے لکڑی کی الماریوں میں رکھے جاتے تھے۔ یہ لکڑی کی الماریاں جن میں خانے بنے ہوتے تھے کمروں کی دیوار کے سامنے ترتیب سے رکھی جاتی ہیں۔

گیانسٹی راہب خانہ لہاسا کی لائبریری کے بارے میں مندرجہ ذیل بیان اس کی تصدیق کریگا

> "عبادت خانے کے مقام مقدسہ کے داخلی دروازہ کے دونوں طرف بدھ مقدس کتابیں "کہگیور" (Kahgyur) مترجمہ از ہندوستانی سنسکرت (جو تقریباً ایک ہزار برس پہلے لکھی گئی تھیں) اور ان کی تفسیریں "ٹنگیور" (Tangyur) ترتیب سے رکھی گئی تھیں۔ اول الذکر سو جلدوں میں اور آخر الذکر دو سو پچاس جلدوں میں تھی۔ ہر جلد ایک بھاری بلندہ ہے جو تقریباً 2½ فٹ لمبا اور 8 انچ چوڑا ہے جو دس سے تیس پونڈ تک بھاری ہے اس میں کئی سو کاغذ کے تختے ہیں جو کپڑے میں لپیٹ کر لکڑی کے تختوں کے درمیان رکھ دیئے گئے ہیں اور ایک سرے پر لیبل ہے"[22]

ہم بے کھٹکے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قدیم ہندوستان کے راہبانہ کتب خانوں میں اسی قسم کی اندرونی ترتیب ہوتی ہوگی اور ان میں چھوٹے خانوں والی لکڑی کی الماریاں استعمال ہوتی ہونگی لکڑی کی الماریوں کے ساتھ ساتھ لکڑی کے صندوق بھی ہوتے تھے جن میں نادر اور بیش قیمت مخطوطے رکھے جاتے تھے۔

جنوبی ہندوستان میں زیادہ تر بڑے مندروں میں ضروری ساز وسامان سے مزین کتب خانے تھے۔ نگائی (Nagai) میں جو کتبہ دریافت ہوا ہے وہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ اور

---

21. Yuan Chwang Watters, V.2,p.201.

22. Lhasa and its Mysteries, Waddell, pp.225-26.

ہمیں مندر کے کتب خانوں کے نظم ونسق کے بارے میں تفصیلی معلومات بہم پہنچاتا ہے ایک دلچسپ چیز قابل غور ہے کہ ان قدیم کھنڈرات میں :

"ایک بڑی عمارت ہے جس کے باہر بڑا صحن اور دونوں طرف کمرے ہیں اور ایک بڑا دروازہ ہے جو ایک بڑے ہال کی طرف لے جاتا ہے جہاں پتھر کی بنچیں (Benches) اور دیوار میں ساتے طاقچے ہیں"[23]

یہ کشادہ ہال لائبریری کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور مخطوطے ان طاقچوں میں رکھے جاتے تھے۔

مسلمانوں کے عہد سے قبل بیجاپور، ودیاپور کے نام سے مشہور تھا یہ مشہور مرکز علم تھا۔ کتبہ خوانی کے ثبوت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کلیان کے مغربی چالوکیہ بادشاہوں نے لائبریری کے مقصد کے لیے ایک عمارت تعمیر کرائی تھی اب جو تباہ شدہ حالت میں ہے[24]

گیارھویں صدی عیسوی میں ادبی سرگرمیوں کا ایک عظیم مرکز پٹن بن گیا جس کی تہذیبی روایت تقریبًا پانچ سو سال باقی رہی۔ تہذیبی وتمدنی سرگرمیوں کے نتیجہ میں بے شمار کتب خانے وجود میں آئے یہاں قیمتی ذخیرہ ہائے کتب کے رکھنے کے لیے خاص طور سے عمارتیں نہیں بنوائی گئیں۔ بھنڈار یا تو اپاشرے (upasraya) میں یا عام مکانوں میں تھے[25] مغربی ہند کے بیشتر جین مندروں میں تہ خانے تھے جن میں صدیوں تک مخطوطوں والے کتب خانے محفوظ رہے۔

تانجور سرسوتی محل یا لائبریری جو سولھویں صدی کی ہے اس زمانہ میں جب تانجور نیگو نایک بادشاہوں کے زیرنگیں تھا۔ ہندوستان کی لائبریریوں میں سب سے قیمتی تھی۔ یہ لائبریری ایک خاص اور موزوں ہال میں تھی۔ اس کا محل وقوع ایک اہم مقام پر اسلح خانہ کے قریب تھا جس کے اطراف حفاظتی مینار تھے۔ مخطوطے اور کتابیں بڑے لکڑی کے صندوقوں میں رکھی جاتی تھیں۔ لائبریری کے شمالی کنارے میں بڑی الماریوں میں انگریزی کی کتابیں تھیں جنھیں مہاراجہ سرفوجی

---

23. Hyderabad Arcnaeological Series, No,B,p.1

24. Arcnitecture of Bijapur, Fergusson, p.2.

25. Gaekwad Oriental Series, Vol. LXXVl.p.39

نے جمع کیا تھا۔[26]

ابتدائی مسلم حکمرانوں کی لائبریریوں کی بھی الگ عمارتیں نہ تھیں لیکن کتاب خانے محلوں تعلیمی اداروں، مسجدوں اور خانقاہوں میں ہوتے تھے۔ غازی خان کی جو ابراہیم لودی کا درباری تھا ذاتی لائبریری دہلی کے قلعہ میں تھی۔[27]

مغل شہنشاہ علم کے عظیم سرپرست تھے اور لائبریریوں کے بانی بھی تھے۔ ہمیں بابر کی لائبریری کی عمارت کے بارے میں کافی معلومات نہیں ملتیں۔ ہمایوں نے ہشت پہل دو منزلہ عمارت کو جو پرانا قلعہ دہلی میں واقع تھی لائبریری کی عمارت میں تبدیل کر دیا تھا۔ یہ شیر منڈل کے نام سے مشہور تھی اور گرینائٹ (Granite) اور سرخ پتھر کی بنی ہوئی تھی۔[28]

اکبر کی لائبریری آگرہ کے قلعہ کے اندر تھی۔ جہانگیر محل کے ملحقہ کمرے میں جنہیں حجرۂ اکبر کہا جاتا ہے ایک بڑا کمرہ ہے جو لائبریری کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور اس کی دیواریں تصویروں سے مزین تھیں۔[29]

فتح پور سیکری میں لڑکیوں کا اسکول خاص محل کے شمال مغربی کونہ پر واقع ہے۔ اس میں ایک اسکول کا کمرہ 22'-11" × 13'-6" اور ایک کلاس کا کمرہ 14'-10" × 8'-2" ہے اور اس کے شمال میں ایک برآمدہ ہے۔

"یہاں پتھر کی دیواروں میں کتابوں کی الماریاں بنی ہوئی تھیں۔ دیواریں 1'-9½" موٹی ہیں لیکن وہ ٹھوس نہیں ہیں۔ ان میں 5'-6" کے خانوں کا ایک سلسلہ ہے ان کی درمیانی جگہ باہر کی طرف سے چوکور پتھر کی تختیوں سے بند ہے اندر کی طرف ان سے نکلتی ہوئی زاویہ قائمہ پر دوسری تختیاں ہیں جن میں سامنے کی طرف کنگورے بنے ہوئے ہیں تاکہ محراب دار پردے لٹکائے جا سکیں مسطح پتھروں کے ساتھ مل کر یہ الماریوں کا کام دیتے ہیں۔"[30]

---

26. Peeps in Saraswati Mahal, S. Gopalan, pp.5-6
27. I.C.Oct.1945, p.331.
28. Promotion of Learning in India During the Muhammadan Period Law. p. 133
29. Handbook to Agra and Taj, Havell, p.66
30. The Moghul Architecture of Fatehpur-Sikri, Smith, V.I, p.8

عادل شاہی سلطنت بیجاپور ان پانچ سلطنتوں میں سے ایک تھی جو بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد ابھریں۔ وہ ایک مشہور مرکز علم تھی۔ سلطان نے بے شمار نجی کتب خانوں کی سرپرستی کی اور ایک شاہی لائبریری قائم کی۔ بیجاپور کے عصری محل میں عادل شاہی لائبریری کا ایک حصہ اب تک باقی ہے۔

محمود گاواں نے بیدر میں ایک عظیم کالج کی بنیاد ڈالی۔ یہ 1472ء میں مکمل ہوا یہ تین منزلہ عمارت فن تعمیر کا شاندار نمونہ تھی جس میں مسجد، لائبریری، درسگاہ کے کمرے اور اساتذہ وغیرہ کے کمرے تھے۔

"عمارت کے سامنے کا حصہ مختلف رنگوں کی مٹی چینی کی اینٹوں کو کئی طریقوں سے ترتیب دے کر بنایا گیا ہے اور ہر سمت ایک شاندار مینار ہے جو سو فٹ اونچا ہے۔ ان میناروں کو بھی اینٹوں کی لہردار ترتیب سے سجایا گیا ہے۔ اس ڈیزائن کی وجہ سے عمارت نہایت پرکشش ہو گئی تھی۔ یہ عمارت تین منزلہ ہے اور اس کا محل وقوع مرعوب کرنے والا ہے۔ اس کی کل لمبائی 205 فٹ ہے اور چوڑائی 180 فٹ۔ یہ کئی حصوں میں بٹی ہوئی ہے اس میں مسجد، لائبریری درسگاہ کے کمرے، اساتذہ کے کمرے اور طلبا کے لیے حجرے ہیں درمیان میں 100 مربع فٹ جگہ صحن کے طور پر ہے۔ اس عمارت میں روشنی اور ہوا کا اعلیٰ انتظام ہے"۔[31]

"چونکہ عمارت میں لائبریری والا حصہ پوری طرح تباہ ہو چکا ہے اس لیے اندرونی تنظیم کی صحیح تصویر ملنا ممکن نہیں ہے لیکن چونکہ مشرقی ماہرین تعمیر ایک عمارت کے تمام حصوں میں تعمیری یکسانیت رکھتے تھے اس سے عین ممکن ہے کہ لائبریری کی اندرونی تنظیم ایسی ہی ہو جیسی دوسرے حصوں میں ہے"۔[32]

---

31. The Antiquities of Bidar, Yazdani, pp. 21-22

32. Bidar: Its History and Monuments, Yazdani, p. 97.

ہندوستان کی ریاستوں کے راجا جیسے الور، بیکانیر، میسور، تانجور، جے پور، جموں وغیرہ اپنی اپنی لائبریریاں اور قدیم کاغذات کے محافظ خانے رکھتے تھے شاہی محلات میں ان کے لیے الگ عمارتیں یا کمرے مخصوص تھے۔

آسام میں اہوم راجہ مخطوطے، پرانے کاغذات، خطوط اور نقشے وغیرہ کے ذخیروں کو محفوظ رکھتے تھے۔ اور اس کے لیے محل سے ملحقہ حجرے ہوتے تھے۔[33]

طریقہ انتظام

عام طور سے حکمراں اور رؤسا کتب خانوں اور کاغذات کے محافظ خانوں کی سرپرستی اور مخطوطوں کی نقل کی حوصلہ افزائی کرتے تھے ہم نے سابقہ ابواب میں بیان کیا ہے کہ کسطرح دیوپال دیو،[34] مشہور پال راجہ، دلبھی راجہ، گوہاسینا اوّل اور گجرات کے راجہ جے سمہا اور کمار پال دیو وغیرہ لائبریریوں کے قیام کی سرپرستی اور مخطوطوں کو نقل کرانے اور خریدنے میں کوشاں رہتے تھے۔

اس کے علاوہ وجے نگر بادشاہوں بکا دوئم اور دیو رائے کے دو کاغذات جو ساؤتھ کنارا ضلع میں دریافت ہوئے ہیں ان میں واضح طور سے لکھا ہے کہ سرنگیری مٹھ سے متعلق لائبریری کی قیمتی جاگیر تھی اور اُسے دوسری مالی امداد بھی قیام لائبریری اور شکست و ریخت کے لیے ملتی تھیں۔[36]

یہ روایت انیسویں صدی عیسوی کے آخر تک رہی۔ روہیلکھنڈ میں نوابین رامپور اپنے کتب خانوں کے لیے کتابوں کی خرید میں بہت فیاضی سے کام لیتے تھے۔ نواب سیّد محمد سعید خاں نے لائبریری کے لیے 1583 روپے 8 آنہ کی کتابیں خریدیں۔ ان کے جانشین نواب یوسف خاں نے 2757 روپے 10 آنہ 6 پائی کتابوں پر خرچ کیے۔ ان کے بعد نواب کلب علی خاں نے کتابوں پر 3608 روپے 13 آنہ 6 پائی خرچ کیے۔ ان کے جانشین نواب حامد علی خاں نے لائبریری کی عمارت پر 4000 روپے اور کتابوں،

---

33. Descriptive Catalogue of Assamese Mss., Goswami, p.XIX.
34. Epigraphia Indica, V.17, 310.
35. I.An. VII, p. 67 f.
36. Annual Report of South Indian Epigraphy, 1936-37, pp.81-82.

عملہ و دیگر ضروریات پر 3,38,136 روپے صرف کیے۔

مندرجہ بالا مثالیں اس لیے پیش کی گئی ہیں کہ یہ ثابت ہو سکے کہ حکمراں لائبریری کی سرپرستی کرتے تھے اور کثیر رقم بطور انعامات خطاطوں، مصوروں اور مصنفین کو دیتے تھے۔[37]

بادشاہوں کے علاوہ وزیروں اور فوجی سرداروں نے بھی لائبریری کے سلسلہ میں اپنے آقاؤں کی مثال پر عمل کرتے ہوئے لائبریری کے ارتقا میں مدد دی۔ اس سلسلہ میں مغربی چالوکیہ بادشاہ کے کاغذات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکھون ملا سومیسورا، نگانی۔ ریاست حیدرآباد کے فوجی سردار نے چھو سرسوتی بھنڈاریکا (نگراں کتب خانہ) کے لیے مالی اعانت کی۔ یہ لائبریری ایک کالج سے متعلق تھی۔[38]

گجرات کے جین وزراء خاص طور سے قابل ذکر ہیں؛ شری وستو پال، تیج پال، شری پاتھا دا شاہ اور شری مدن منتری آج تک گجرات کی تاریخ میں کتابوں کی تیاری کی حوصلہ افزائی اور کتب خانوں کے قیام کے لیے مشہور ہیں۔ دوسرے جن وزیروں نے لائبریری کے مقاصد کی مدد کی وہ ہیں وملا شاہ، امر بھٹ، واگ بھٹ اور کرم شاہ۔

بعض اوقات عقیدت مند مریدوں نے بھی خانقاہوں اور کتب خانوں کے قیام کے لیے اوقاف قائم کیے۔ کتبہ خوانی کے پرانے کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عقیدت مند مسمّی گوہن او ہنگر ساکن علاقہ گورٹنے مناسب مالی اعانت کچھ خانقاہوں کی مرمت کے لیے دی جو کنہیری مغربی ہند میں واقع تھیں۔ ان خانقاہوں میں رہنے والے لوگوں کے لباس کے لیے بھی مالی امداد کی اور کچھ رقم خانقاہوں سے متعلق کتب خانوں کی کتابوں کے لیے دی۔[39]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے قدیم اور متوسط زمانہ میں حکمرانوں، ریاستوں کے رؤسا، اعلیٰ افسران اور مذہبی اشخاص نے لائبریری کے ارتقا میں سرپرستی اور اعانت کی۔

---

37. I.C.Jan. 1946, p. 17.

38. Hyderabad Archaeological Series, No.8 and also annual report on South Indian Epigraphy, 1938-39, pp. 70-95.

39. I. An. V.13, p. 135.

عہد سلطنت اور عہد مغلیہ میں بھی یہی اعانت کی داستان دہرائی گئی جس کے کچھ تفصیلی کوائف سابقہ ابواب میں بیان کیے گئے ہیں۔

لائبریری عملہ، حیثیت اور تنخواہ

نگائی کے کتبہ مؤرخہ 1058ء سے ہمیں آخر چالوکیہ راجاؤں کے زمانہ کی لائبریری عملہ کی حیثیت اور تنخواہ کے بارے میں مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں[40]

نگائی کے کتبہ سے (جس کا پہلے ذکر آچکا ہے) معلوم ہوتا ہے کہ لائبریری عملہ اور کالج کے استادوں کے لیے زمین مختص کی گئی تھی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لائبریری عملہ کی اور استادوں کی حیثیت مساوی تھی۔ اور استادوں اور لائبریری عملہ کو برابر تنخواہ ملتی تھی۔

ابتدائی سلطنت عہد میں بادشاہ شاہی محل میں لائبریری قائم کرتے تھے جسے کتاب خانہ کہا جاتا تھا اور اس کے نگراں کو کتاب دار۔ سلطان جلال الدین خلجی علم کا عظیم سرپرست تھا۔ اس نے امیر خسرو کو جو ایک فاضل اور عظیم شاعر تھے شاہی لائبریری کے نگراں کی حیثیت منتخب کیا۔ لائبریرین کا عہدہ بہت معزز خیال کیا جاتا تھا۔ امیر خسرو کو طبقۂ امراء میں شمار کیا گیا اور اسے وہی حقوق و مراعات دی گئیں جو کسی امیر کو حاصل ہوتی تھیں[41]

عہد مغلیہ میں لائبریری کا اعلیٰ ترین افسر ناظم کہلاتا تھا۔ ملا پیر محمد اور شیخ فیضی یکے بعد دیگرے اکبر کی شاہی لائبریری کے ناظم بنے۔ مکتب خاں جہانگیر کے ناظم تھے اور یہ تمام حضرات دربار شاہی میں نہایت اہم افراد تھے۔

اس ادارہ کو فروغ کے ساتھ ساتھ مختلف درجات کے لائبریری افسران و عملہ وجود میں آئے۔ دور مغلیہ اور اس کے بعد کے زمانہ میں جو لائبریری عملہ وجود میں آیا۔ ان کے فرائض حسب ذیل ہیں۔[42]

(۱) ناظم لائبریری کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا اور آج کل کے یونیورسٹی لائبریرین یا بڑی

---

40. Hyderabad Archaeological Series, No.6.

41. Tarikhi - Firuz - Shahi (Elliot) iii; p. 144.

42. I.C. Jan. 196, p. 10

پبلک لائبریری کے نگراں کی طرح عالم اور لائق منتظم ہوتا تھا۔

(2) داروغہ یا مہتمم دوسرے درجہ پر ہوتا تھا اور وہ تکنکی کام اور نظم و نسق کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ وہ کتابوں کی خرید، انتخاب اور درجہ بندی کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

(3) صحاف اور وراق داروغہ کے زیر ہدایت کام کرتے تھے اور ان کا کام تھا کہ وہ کتابوں کا اجرا کریں اور بعد استعمال انکو ٹھیک جگہ پر واپس رکھدیں۔[43]

(4) مصحح کا کام تھا مخطوطوں کی غلطیوں کی درستی اور مخطوطوں کی دیکھ بھال۔ جب مخطوطوں کو کیڑے نقصان پہنچا دیتے تھے تو وہ اس کے ٹکڑوں کو بدل دیتا تھا اس طبقہ کے افراد کے لیے ضروری تھا کہ وہ عالم بھی ہوں اور تکنیکی کام کے ماہر بھی ورنہ انکے لیے مشکل ہوتا کہ وہ نقصان زدہ حصہ کو بدلیں۔ خانخاناں کی لائبریری میں مولانا صوفی مصحح تھے۔[44]

(5) مترجم

(6) کاتب جو نادر مخطوطوں کی نقل کیا کرتے تھے۔

(7) خوش نویس یا خطاط۔

(8) مقابلہ نویس کا کام یہ تھا کہ وہ کاتب اور خوش نویس کے کام کو اصل سے مقابلہ کرکے تصدیق کرے۔

(9) جلد ساز

(10) کتابی مصوری کے ماہر یا مصور

(11) جدول ساز کا کام یہ تھا کہ وہ تحریر ہونے والے کاغذوں پر مختلف قسم کے حاشیے کھینچے۔

(12) کلرک یا محرر کتابوں کا شمار رکھتے اور حسابات بناتے تھے۔

(13) خدمت گار صفائی اور گرد جھاڑنے کے لیے ہوتے تھے۔

جین گیان بھنڈاروں میں لائق شاگرد اور شرامن مخطوطے لکھنے میں اور مختلف ایڈیشنوں کے

---

43. I.C. Jan. 1946, p. 18

44. I.C. Oct.1945, p.335 and also Jan. 1946, pp.18-19.

انتخاب میں مدد کرتے تھے بعض اوقات قابل اپاسک بھی مخطوطے لکھنے میں مدد دیتے تھے تکمیل شدہ مخطوطے قابل اور تجربہ کار آدھاریہ کے پاس آخری رائے کے لیے بھیجے جاتے تھے۔

رامپور لائبریری کی کیٹلاگ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کلرک کتابوں کی مضمون وار فہرست بناتے تھے۔

1848ء میں ایک انگریز جن کا نام اسپرنگر (SPRENGER) تھا لکھنؤ آیا اس نے شاہان اودھ کی شاہی لائبریری کی تفصیل بیان کی ہے۔ آصف الدولہ کے وقت میں لائبریری کا ذخیرۂ کتب تقریباً تین لاکھ تھا اور بہت سے نوکر صفائی اور گرد جھاڑنے کے لیے تھے[45]

مذکورہ بالا بیان سے واضح ہوتا ہے کہ قدیم اور قرون وسطیٰ کے ہندوستان میں کتب خانوں کے انتظام و نگہداشت کے لیے کافی عملہ ہوتا تھا۔ یہاں ہم دو ایک اور مثالیں پیش کرتے ہیں:۔

بیجاپور کی شاہی عادل شاہی لائبریری میں عملے کے جملہ ممبران ساٹھ تھے[46] عبدالرحیم خانخاناں کی ذاتی لائبریری میں مختلف قسم کے پچانوے 95 کارکن تھے[47] عادل شاہی لائبریری کا نگراں ایک ہندو عالم تھا جو فارسی کا ماہر تھا۔ اس کی سالانہ تنخواہ ایک ہزار ہُن یا تقریباً 3500 (تین ہزار پانچ سو) روپے تھی[48]

اڑیسہ کے بھوما کاراس کے کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک افسر پست پال یا پستک پال ہوتا تھا[49] جو شاہی کتب خانہ کا نگراں دوسرا پیٹ پال اور پید پال یعنی مخطوطوں کے صندوقوں کا محافظ ہوتا تھا جو پستک پال کے نیچے کام کرتا تھا[50]

ہمیں حیرت ہوتی ہے جب ہم سوچتے ہیں کہ نالندہ اور ٹکسلا جیسی یونیورسٹی کے کتب خانوں

---

45. I.C. Jan. 1946, p. 15

46. I.C. Jan. 1946, p. 15

47. Society and Culture in the Mughal Age, Chopra, p. 35

48. Sarda Satabdi Special volume of the J.A.S. of Bombay, V. 31-32, p. 107.

49. EP. Ind. XXIX, p. 88

50. EP. Ind. XXVIII, p. 216; XV. p. 5: Bhandarkar's list, No.2041

میں یا مغلوں کی شاہی لائبریریوں میں جہاں شاہجہاں کے زمانہ میں چوبیس ہزار خوبصورت مجلد کتابیں تھیں کتنے ملازم کام کرتے ہوں گے۔[51]

سرسوتی محل تانجور مشرق کی بڑی لائبریریوں میں سے ایک تھی۔ اس لائبریری کی سرپرستی مراٹھا حکمرانوں نے کی خاص طور سے سرفوجی نے کی۔ سنہ 1832ء میں اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا شیواجی تخت نشین ہوا اور اس نے اپنی دلچسپی اور محبت لائبریری کے لیے برقرار رکھی۔ سنہ 1849ء میں اپنی کل سالانہ آمدنی 1,45,439 روپے میں سے 21,549/- اس نے لائبریری پر خرچ کیے۔[52]

کاتب

اس ملک میں طباعت کے آغاز سے پہلے کاتب یا نقل نویسوں کا پیشہ ایک منفرد حیثیت رکھتا تھا۔

ہندوستانی رزمیات اور بدھ لٹریچر سے معلوم ہوتا ہے کہ کاتبوں کا سب سے قدیم نام "لیکھکا" تھا۔[53] یہی نام ارتھ شاستر میں استعمال ہوا ہے۔[54] لیکن لپی کار یا لبی کار کا لفظ اشوک کی چودھویں چٹان کے فرمان میں استعمال کیا گیا ہے۔[55] سدّاپور فرمان کے تحریر کرنے والے نے اپنے لپی کار بتایا ہے۔ اور سانچی کے کتبہ (استوپ نمبر 1 نمبر 143) میں "راج لپی کار" کا استعمال کیا گیا ہے[56] یہ اصطلاح (چوتھی صدی قبل مسیح) میں پانینی کو معلوم تھی۔[57]

مغربی ہندوستان میں فارسی لفظ دبیر یعنی کاتب دویر بن کر عام طور پر استعمال ہوتا تھا۔

---

51. Mandelos Travells, p. 118.
52. Peeps in Saraswati Mahal, p. 25.
53. Indian Paleography, Buhler, ch. 39, p. 94
54. Artha Sastra, Shamsastry, p. 94
55. Indian Paleography, Buhler, p.94
56. Epigraphia Indica, 2,p. 102
57. India As Known to Panini, Agarwala, p. 311.

ساتویں اور آٹھویں صدی کے ولبھی کتبات میں کاتب یا مخطوطہ نویس کے لیے دویرپتی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

جب ہیوان سانگ کشمیر آیا تو بادشاہ نے اس کے لیے مخطوطوں کی نقل کرنے کے لیے ۲۰ (بیس) کاتب مقرر کیے۔ کشمیر میں کاتبوں کو دویر کہا جاتا تھا۔ راج ترنگنی اور دوسری کشمیری تصنیفات میں جو گیارھویں اور بارھویں صدی کی ہیں شمیندر نے "لوک پرکاش" میں کاتبوں کی تقسیم اس طرح کی ہے:-

"گنج دویر یعنی بازار کا کاتب، گرام دویر یعنی گاؤں کا کاتب، نگر دویر یعنی شہر کا کاتب اور خواص دویر وغیرہ"[58]

شمالی اور مشرقی ہندوستان میں آٹھویں صدی سے کاتبوں کو "کائستھ" کہا جاتا تھا۔ یہ اصطلاح سب سے پہلے یجنا والکیہ سمرتی (1.335) میں استعمال ہوئی تھی۔ دوسرے الفاظ جو کاتب کے لیے استعمال ہوتے تھے وہ ہیں کرن، کرانک، کراتن، شاسنک اور دھرم لیکھن[59]

کائستھوں کا سماج میں ایک باعزت مقام تھا گیارھویں صدی میں انھیں خاص امتیاز حاصل ہوا اور خاص طور سے مرکزی ہندوستان میں ممتاز ہوئے جیسا کہ چندیلا کتبات سے ظاہر ہے[60]. مندرجہ ذیل سطور سے کائستھوں کی اصل سماجی حیثیت جو انھیں گیارھویں صدی میں حاصل تھی ظاہر ہو جائے گی:-

"چھتیس قصبے تھے جہاں کاتب ذات کے لوگ رہتے تھے، (کرن، کرم نواس پوستے) ان کو دوسرے قصبے کے لوگوں سے زیادہ آسانی حاصل تھی۔ ان میں سب سے زیادہ اعلیٰ خیال کیا جانے والا مقام دیوٹ دیوناؤں کا گھر نکار تھا۔ وہ قابل رشک تھا اور جب اس قصبہ میں طلبا کے گروہ ویدوں کو پڑھتے تو یہ گونجنے لگتا۔ یہاں وستویہ خاندان میں کائستھ پیدا ہوئے جن کی شہرت پھیلی اور جنھوں

58. Indian Paleography, Buhler, p. 95.

59. Indian Paleography, Buhler, p. 95.

60. History of the Chandellas, N.S. Bose, p. 153.

کسے طرح سفید ہو گئے جیسے ہر جگہ روشن ہو گئی"۔ [61]

مندرجہ بالا کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کاتبوں کو عاقلوں میں شمار کیا جاتا تھا۔

گجرات کے راجہ شری سدھا راج نے تین سو کاتب مقرر کیے اور حکم دیا کہ طلبا کے لیے سدھ ہیم ویاکرن کی 5000 ہزار نقول تیار کی جائیں۔ پربھاؤ کا چرت اور کمار پال پربندھ ایسے حوالوں سے پُر ہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ ضرورت مند طلبا کو کتابیں دی گئیں۔

ترک، افغان، سلاطین اور رؤسا، چونکہ علوم کے عظیم سرپرست تھے اس لیے انھوں نے تحریر، نقل اور مخطوطوں کے ترجمہ کی خاص حوصلہ افزائی کی۔ ان کے ساتھ بڑی تعداد کاتبوں کی ہوتی اور بعض اوقات شاہانِ روم کی طرح غلاموں کو نقل نویسی کی تربیت دیتے تھے۔

بڑی مقدار میں کاغذ کی مقدار کی وجہ سے مغل حکومت کو کاغذی راج کہا جاتا ہے اس عہد میں بے شمار نقل نویس، کلرک اور خبر نویس، لائبریرین، دفاتر، سیکریٹری میں اور کاغذات کے محافظ خانوں میں ملازم رکھے جاتے تھے۔

مغلوں کی طرح مراٹھے بھی بڑی تعداد میں کلرک اور نقل نویس اپنے دفاتر اور لائبریری کے لیے رکھتے تھے۔ شاہی دفتر کے لیے مراٹھے دو سو کارکنان کو ملازم رکھتے تھے۔ کارکنوں کی ماہانہ تنخواہ بارہ سے پندرہ روپے تک ہوتی تھی۔ [62]

اس کے علاوہ گاؤں میں پاٹل یعنی گاؤں کے مکھیا کے ساتھ کاتب ہوتے تھے اِن کاتبوں کو کلکارنی یا گرام لیکھک کہا جاتا تھا۔ [63] کلکارنی کا درجہ پاٹل کے بعد ہوتا تھا ان لوگوں کی گزارہ کی رقم گاؤں کے ٹیکسوں سے حاصل ہوتی تھی۔ [64]

آسام کے اہوم راجہ محلوں میں بہت سے کاغذات کے محافظ خانے اور کتب خانے قائم کرتے تھے۔ شاہی اہوم لائبریری کے ذمہ دار افسر کو گاندھیا برواکہا جاتا تھا جو ایک اعلیٰ افسر ہوتا تھا اسے لکھا کار بروا کہتے تھے وہ کاتبوں اور محرروں کی ایک بڑی تعداد کا نگراں ہوتا تھا۔ [65]

---

61. Epigraphia Indica, V.I.p. 333, Vs.2,4.

62. Administrative System of the Marathas, S.N.Sen, p. 256.

63. Administrative System of the Marathas, S.N.Sen, p.506

64. Administrative System of the Marathas, S.N.Sen, p.227.

65. Descriptive Catalogue of Assamese Mss., Goswami, p.xix.

ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ تک بے شمار کاتب تحریر کا کام کر کے اپنی روزی کماتے تھے۔ انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کے بنگال، مدراس اور بمبئی کے نالی کاغذات کے (جو تیرہ سو موٹی جلدوں سے کم میں نہیں ہیں) جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی کلرکوں کی بہت بڑی تعداد کمپنی کی ملازمت میں تھی۔[66]

اس طرح نقل نویسوں کا ایک منفرد پیشہ تھا۔ پیشہ ور نقل نویسوں کے علاوہ عورتیں، راہب اور عام آدمی جو مذہبی معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے نقل نویسی میں حصہ لیتے تھے۔[67]

خطاط کاتبوں کا وہ طبقہ تھا جو کتابت کو ایک فن کی حیثیت سے فروغ دیتا تھا۔ وہ نقل اس لیے نہیں کرتے کہ اس جیسی دوسری چیز پیدا کریں بلکہ تحریر کی خوبصورتی کے لیے لکھتے تھے۔

خطاطی بنیادی طور پر سجاوٹ کی چیز ہے۔ کاتبوں کی رنگارنگی اور وہ اُپج جس کا وہ اپنی سجاوٹ میں مظاہرہ کرتے تھے اور جو اس فن کے لازمی اجزا میں ہے اس لیے اس فن میں داخل ہوئے کہ اسلام میں زندہ چیزوں کی تصویرکشی ممنوع ہے۔

مسلم عہد میں خطاطی ایک قابل فخر پیشہ بن گیا ماہر خطاطوں کی بادشاہ، روٴسا اور عام لوگ بہت زیادہ قدر کرتے تھے۔

یاقوت مستعصمی (م 1203ء) ایک مشہور خطاط تھا اور خط نسخ کا بہت بڑا ماہر تھا۔ 1324ء میں اس نے بوعلی سینا کی کتاب شفا کی ایک نقل محمد تغلق کو بھیجی۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس نے خطاط کو 2 0,000,000 سونے کے مثقال بھیجے لیکن خطاط نے اس تحفہ کو کم خیال کر کے لینے سے انکار کر دیا۔[68]

مشہور خطاط میر خلیل اللہ نے دکن کے ابراہیم عادل شاہ کو نورس کا ایک نسخہ پیش کیا۔ وہ اتنا خوش ہوا کہ اس نے نہ صرف اُسے "قلم کا بادشاہ" کا خطاب دیا بلکہ ایک تقریب کا اہتمام کیا جس میں خطاط کو وقتی طور سے اپنے تخت پر بٹھایا۔[69]

---

66. I.A., V,VII, No.1, p.100.

67. Prasasti Samagraha, 1,pp.19,27,31,36,43,46 and 71.

68. Les Calligraphes et les Miniaturistes, Huart,p.85.

69. Moslim Calligraphy, Ziauddin, p.38.

2

دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی فنِ خطاطی نے مسلم حکومت کے آغاز سے فروغ پایا لیکن کتبات کے سوا خطاطی کے پرانے نمونے ملتے نہیں ہیں۔

عہدِ مغلیہ میں فنِ خطاطی کا ایک نیا منظر اس وقت سامنے آتا ہے جب ہندوستان میں وہ ممتاز خطاط نظر آتے ہیں جن کا ذکر سابقہ باب میں کیا گیا ہے اور جن کے نمونے ہندوستان کے میوزیم اور لائبریریوں کی زینت بنے ہیں۔

ماہر خطاطوں کو انکی لیاقت کے مطابق اعزاز دیے جاتے تھے مندرجہ ذیل خطابات ان لوگوں کو دیے گئے تھے[70]:۔

زرّیں قلم۔ شیریں رقم۔ روشن رقم اور مشکیں رقم۔

شاہجہاں "یک سوتی" کا خطاب عطا کرتے تھے جب کوئی اپنی خطاطی کا نمونہ اُسے پیش کرتا تھا[71]۔ کچھ شاگرد اپنے استاد اور مشہور خطاطوں کے نام سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ ضیاء الدین کی کتاب "مسلم خطاطی" سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا خواجہ محمد ایک عظیم استاد خطاطی، ملّا میر علی کے نام کا ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ ملّا میر علی کی مندرجہ ذیل تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے شاگرد سے انھیں کیا شکایت تھی اور ان کی ذہنی حالت کیا تھی:۔

"خواجہ محمد کچھ عرصہ تک میرا شاگرد رہا اور میں نے اس کی تربیت کی بہت کوشش کی یہاں تک کہ اس کی تحریر میں ایک انداز پیدا ہوا۔ میں نے اس کے ساتھ کبھی کوئی برائی نہیں کی نہ اس نے میرے ساتھ کی۔ ہاں اچھا یا بُرا جیسا اس سے تحریر ہوتا ہے ویسا لکھ کر میرا نام بطور دستخط اس کے نیچے لکھ دیتا ہے"[72]

خطاطوں کو اپنے فن پر ناز تھا اور بعض اوقات وہ لوگ اپنے غرور کی وجہ سے شہید ہوئے۔ ملّا میر علی کی جن کا جہانگیر بڑا مدّاح تھا اپنے قلم کی لکھی مندرجہ ذیل سطور ثابت کر دیں گی کہ وہ لوگ اپنے فن سے کتنا عشق رکھتے تھے:۔

---

70. Promotion of Learning in India by Early European Settlers, Law, Ch.V, p.99.

71. Moslim Calligrapny, Ziauddin, p.40

72: Moslim Calligrapny, Ziauddin, p.40

"میرا قلم معجز نما ہے اور میرے لکھے ہوئے الفاظ اپنی خوبصورتی کی وجہ سے
اپنے معنی و مطالب پر برتری رکھتے ہیں۔ اگر میں اپنے الفاظ کے
دائرے بنا نا سکھاؤں تو محرابِ جنت اپنی غلامی کا اقرار کرے۔
میرے قلم کا ہر خط جادو الفن ہے"۔[73]

آخری مغل دور میں اس فن کی زیادہ حوصلہ افزائی ہوئی بہادر شاہ اس فن میں گہری دلچسپی رکھتے تھے اور دکنی سلاطین نے اس روایت کو برقرار رکھا اور یہ سلسلہ حیدرآباد کے نظام بادشاہوں تک جاری رہا۔

اگرچہ یہ فن تیزی سے ختم ہو رہا ہے پھر بھی اب بھی ماہر خطاط دہلی، لکھنؤ، رامپور، اور حیدرآباد میں موجود ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مصور دفع ابھی ہندوستان کے اردو کاتبوں میں مقبول نہیں ہے۔

مخطوطوں، کتابوں، کاتبوں اور خطاطوں کی تاریخ انسانی کوشش کا ایک دلچسپ باب ہے۔ کاتبوں اور خطاطوں کی کتنی نسلوں کا ہمارے اوپر احسان ہے کہ جنھوں نے صدیوں تک عقلاء، صوفی، شعراء، فلسفی، مفکر حضرات کی تصانیف کی منقول کر کر کے ہندوستان کے قدیم اور قرونِ وسطیٰ کے علم کو ہم تک پہنچایا۔

بعض اوقات ہم حیرت کے ساتھ سوچنے لگتے ہیں کہ کیا یہ تحریریں تحفظ علم اور ترویج علم کے لیے تھیں۔ لیکن تاریخی تجزیہ ظاہر کرے گا کہ خالص علمی ذوق کے ساتھ ساتھ دوسرے اسباب بھی تھے۔ جن سے مخطوطوں کی تحریر، نقل اور سجاوٹ کی حوصلہ افزائی ہوئی۔

ہندوستان کے عہد قدیم و وسطیٰ میں کتاب اور مخطوطوں کی تعداد میں اضافہ کا خاص طور سے ذمہ دار علمی ذوق رہا ہے اور اس کی تاریخ سابقہ ابواب میں بیان کر دی گئی ہے لیکن کچھ اور سماجی و مذہبی وجوہ بھی تھیں اور یہ مفید ہوگا اگر ہم چند حقائق کا خلاصہ اس بیان کی تصدیق کے لیے پیش کریں۔

(1) __مذہبی وجوہ__ ادبی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی مخطوطوں کا پیش کرنا اور ان کی نقلیں کرانا بڑے درجے کا مذہبی کام مانا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر گیتا، پُرانے

---

73. Moslim Calligraphy, Ziauddin, p.40

اور ویدوں کی نقلیں تقسیم کی جائیں تو دلی مرادیں پوری ہونگی اور اس کارِ خیر کے کرنے والے دوبارہ جنم نہ لیں گے۔[74] دان ساگر میں پُران دان اور ودیا دان کے حصّے ایسے حوالوں سے پُر ہیں۔

(2) **سیاسی وجہ** مخطوطوں کا ہدیہ اور کتب خانوں کا باہمی ربط و ضبط عام طور پر سیاسی جماعتوں اور ریاستوں کے درمیان دوستانہ مراسم کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ کامروپ کے راجہ بھاسکر ورمن نے قنوج کے راجہ ہرش وردھن کو عمدہ تحریر کی مجلد تصانیف پیش کیں۔ جہانگیر نے گجرات کے رؤسا میں فیاضی سے کتابیں تقسیم کیں تاکہ سیاسی دوستی مضبوط ہو اور ان کی محبت و ہمدردی حاصل ہو۔

(3) **اقتصادی وجہ** نقل نویسی اور خطاطی کا پیشہ ایک ممتاز پیشہ تھا اور بڑی تعداد میں لوگ قلم سے اپنی روزی کماتے تھے۔ عہدِ مغلیہ میں "کوئی ایسی سڑک یا بازار نہ تھا جہاں کتب فروش سرِراہ کھڑے ہو کر عرفی یا سراج اور حسین ثنائی شعراء کے دیوان نہ فروخت کرتے ہوں۔ ایرانی اور ہندوستانی اُسے خریدتے تھے"۔[75]

پیشہ ور کاتبوں کو قدیم زمانہ میں اچھی اجرت ملتی تھی۔[76] عہدِ وسطیٰ میں مغربی ہند میں نقل نویسی کی اجرت نسبتاً زیادہ تھی۔[77] کاتبوں کا کام سخت اور محنت طلب تھا۔ کیونکہ انھیں مخطوطوں کی نقل کرنی پڑتی تھی۔ "پشت، کمر، گردن اور سر جھکے رکھ کر کام کرنا ہوتا تھا (بھنگ پر ستھا کٹی گرداد ھو مکھا)"۔[78]

---

74. Nandi Purana, 1,2,12.

75. Badauni, III, p.280.

76. Prasasti Samgraha, 1, 32, and 61.

77. Gaekwad's Oriental Series, V.LXXVI, p.40

78. Gaekwad's Oriental Series, V.LXXVI, p.71.

چھپائی کو ہندوستان میں آسانی سے قبول نہیں کیا گیا کیونکہ اس سے خطاطی کے پیشہ کو نقصان پہنچا تھا اور ایک بڑی تعداد نقل نویسوں کی بے روزگار ہو جاتی تھی۔ اوونگٹن جو تقریباً سنہ 1689ء میں ہندوستان آیا اس بات کی تصدیق ذیل میں کرتا ہے :-

" انھوں نے ہندوستان میں چھپائی کو قائم کرنے کی کوشش نہیں کی اس سے کاتبوں کی وقعت کم ہو جائے گی اور ان بہت سے لوگوں کی روزی ختم ہو جائے گی جو قلم کے ذریعہ اپنے خاندانوں کو پالتے ہیں"[79]

انیسویں صدی کے شروع میں کاتبوں کی اجرت کم ہو گئی۔ مندرجہ ذیل حقائق سے معلوم ہو گا کہ عام شرح معاوضہ اس وقت کیا تھی :-

(1) سنہ 1817ء میں رامائن کا بنگالی نسخہ کرتی واس نے صرف پانچ روپے میں نقل کیا۔

(2) مہابھارت کا بنگالی نسخہ (ویراٹ پردن) بکرمی سمبت 1110 مطابق سنہ 1703ء میں صرف ایک روپیہ میں نقل ہوا۔

(3) مہابھارت کا بنگالی نسخہ (شانتی پردن) بکرمی سمبت 1253 مطابق سنہ 1846ء میں صرف -/13/0 (تیرہ آنے) میں نقل کیا گیا[80]

اس کے علاوہ وارڈ (WARD) سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں 32000 سطریں نقل کرنے کی اجرت بارہ آنے سے لگا کر ایک روپیہ تک تھی۔ اس کی رائے میں وہ شرح معاوضہ بھی زیادہ تھی کیونکہ بڑی کتابیں مثلاً مہابھارت کو نقل کرنے کی مزدوری بہت زیادہ ہو گی۔ آر۔ ایل۔ مترا (R.L.Mitra) سے معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ صدی کی چھٹی دہائی میں ایک ہزار اشلوک نقل کرنے کی اجرت چار روپے تھی[81]

تحفظ زمانۂ قدیم ہی سے مخطوطوں کی بڑی قدر و منزلت تھی وہ سرسوتی پوجا یا بسنت پنچمی کے دن

---

79. A Voyage to Surat in 1869 by J. Ovington, pp.251-52.

80. J.R.A.S.B.V. XVI, "Value and importance of Mss. in olden times."

81. J.R.A.S.B.V. XVI, "Value and importance of Mss.in olden times"

پوجے جاتے تھے۔ جینیوں نے اس کو اور بھی عزت بخشی انھوں نے اجمان اور گیان پوجا تیوہار شروع کیے کہ لوگوں کو علم اور مقدس کتابوں کے بارے میں معلومات ہوسکیں۔[82] ادبی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے لوگ مخطوطوں کی بہت قدر کرتے تھے اور ان کی ملکیت اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مخطوطوں کی دیکھ بھال اور تحفظ ہر صورت سے کرتے تھے۔

تینالی راما کرشنا نے جو مشہور عہد وسطیٰ کا تیلگو شاعر تھا، لکھا ہے کہ آگ، موسم اور کیڑوں سے نقصان، غلط جگہ پر رکھنا اور چور یہ چار سب سے بڑے خطرات کتب خانہ کے لیے ہیں۔[83] قدیم زمانہ کے لوگ مذکورہ بالا وجوہات سے بخوبی واقف تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ مخطوطوں کے آخر میں ایسے اشعار لکھ دیا کرتے تھے کہ جو ان کی چوری کرے گا اس کا برا ہوگا اور مخطوطہ کی طویل عمر کی دعا مانگی ہوتی تھی اور دوسروں سے ان کی حفاظت کی درخواست کی جاتی تھی۔[84]

ہندوستان کا یہ قدیم مقولہ اہم ہے کہ:۔

"قلم، کتاب اور بیوی اگر کسی دوسرے کو دی تو ہمیشہ کے لیے گئی"۔

بعض اوقات متعصب لوگ مخطوطوں کے ساتھ اتنی عزت اور تقدس جوڑ دیتے تھے کہ پرانے مخطوطوں کو پاک دریاؤں میں اس ڈر سے ڈال دیتے تھے کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی بےحرمتی نہ کی جا سکے۔[85]

ہندوستان کی قدیم لائبریری میں کتابوں کے تحفظ کے بارے میں ہمیں بہت کم معلومات حاصل ہیں لیکن نیپال اور تبت کی قدیم خانقاہی لائبریریوں سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ مخطوطوں کے رکھنے کے لیے الماریاں اور صندوق ہوتے تھے۔ کوٹلیہ کے ارتھ شاستر میں جو نگراں حسابات کے دفتر کی تفصیل ملتی ہے وہ اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ قدیم ہندوستان کی چوتھی صدی قبل مسیح

---

82. Jaina Chitra Kalpadruma.

83. J.A.H.R.S.V.VIII, pt. 4,p.222.

84. J.R.A.S.B., V.XVI,pp.257-60.

85. Papers relating to the collection and preservation of ancient Sanskrit literature in India, Gaugh, p.48.

میں مخطوطے رکھنے کے لیے لکڑی کی الماریاں ہوتی تھیں۔[86]

لیکن عہد وسطیٰ کے بارے میں ہمیں اس موضوع پر کافی اور جینی چتر کلپا درم سے قابلِ قدر معلومات ملتی ہیں۔

عہد وسطیٰ کے کتب خانوں میں مخطوطے زیادہ تر یا تو لکڑی کے صندوقوں میں رکھے جاتے تھے یا لکڑی کی الماریوں میں اس کے علاوہ آخری دور میں مخطوطے طاقوں میں یا دیوار کی اندرونی الماریوں میں رکھے جاتے تھے۔[87]

جین گیان بھنڈاروں میں قیمتی مخطوطے رکھنے کے لیے لکڑی، دفتی چمڑے یا ہاتھی دانت کے صندوق ہوتے تھے۔ انھیں کیڑوں اور نمی سے بچانے کے لیے صندوقوں کی باہری سطح پر پالش کیجاتی تھی۔ مخطوطے جنھیں صندوقوں (دابھو داس) میں رکھتے تھے ان پر کوئی چیز ڈھکنے کے طور پر نہ رکھی جاتی کیونکہ صندوق خود کپڑے میں لپٹا رہتا تھا۔

تانجور کی سرسوتی محل لائبریری میں "بڑی الماریاں جن میں کتابیں اور مخطوطے رکھے جاتے ہیں صدیوں سے موجود ہیں۔ لائبریری کے شمالی کونہ میں جہاں بڑی لکڑی کی الماریاں قدیم وضع کی ہیں ان میں مطبوعہ انگریزی کتابیں ہیں جنھیں مہاراجہ سرفوجی نے جمع کیا تھا"۔[88]

مخطوطوں کے صندوق

دفتی کے صندوق عمدہ دفتی کے صندوق ردّی کاغذ اور میتھی کو ملا کر بنائے جاتے تھے۔ ریشمی یا سوتی کپڑا ان کو ڈھکنے کے لئے استعمال ہوتا تھا لیکن کپڑے کا غلاف ہمیشہ استعمال نہیں ہوتا تھا اس کے بجائے صندوقوں کو رنگوں کے مجموعہ سے رنگ دیا جاتا تھا۔ پٹن کے بھنڈاروں میں دفتی کے نلکی دار صندوق چھوٹے سائز کے کھجور کی پتی والے مخطوطے رکھنے کے لیے ملتے ہیں۔

چمڑے کے صندوق صندوقوں کو ڈھکنے کے لیے چمڑے کے خول بھی استعمال ہوتے تھے۔ جن صندوقوں پر ایسا خول ہوتا تھا اسے چمڑے کا صندوق کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات چمڑے کے ٹکڑوں کو

---

86. Artha Sastra, Shamsastri, B.II. Ch. VII.

87. I.C. Jan. 1946, pp. 7, 10,11.

88. Peeps into the Saraswati-Mahal, p. 6.

ڈھکن کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا آج ایسے چمڑے کے صندوقوں کو مخطوطوں کے تقدس کے پیش نظر بہت سے لوگ استعمال کرنے میں اعتراض کر سکتے ہیں، لیکن جین گیان بھنڈاروں میں ایسی مثالیں بہت ملتی ہیں۔

لکڑی اور ہاتھی دانت کے صندوق عام طور سے لکڑی کے صندوق ساگون لکڑی کے ہوتے تھے لیکن کلپ سوتر جیسے مخطوطے جو چاندی اور سونے کے حروف میں لکھے ہوتے تھے ان کے رکھنے کے لیے دیودار وغیرہ کے صندوق ہوتے تھے یا ہاتھی دانت کے صندوق جن پر باہر کی طرف خوبصورت نازک وضعیں بنی ہوتی تھیں۔

بڑے صندوق مزید حفاظت کی وجہ سے چھوٹے صندوقوں کو بڑے صندوقوں کے اندر رکھے جاتے تھے جنھیں پٹارا کہتے تھے اور مضبوطی کے لیے ان پر لوہے اور پیتل کے ٹکڑے جڑے ہوتے تھے۔ کچھ مقامات پر مضبوط الماریاں یا دیوار میں لگے تختے (بھنڈاکیا) اس مقصد کے لیے بنائے جاتے تھے۔ پٹن میں پٹارا اور بھنڈاکیا دونوں استعمال ہوتے تھے لیکن مستقل استعمال کے لیے آخرالذکر میں زیادہ آسانی تھی۔ پٹلا کو "ماجو" بھی کہا جاتا تھا۔ بھنڈاکیا جو دیوار میں بنائے جاتے تھے مخطوطوں کو نمی سے بچاتے تھے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لکڑی کے صندوق، لکڑی کی الماریاں اور طاقچے مخطوطے رکھنے کے لیے عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں خاص طور سے استعمال ہوتے تھے۔ عہد وسطیٰ کے یوروپ کی لائبریریوں میں بھی اسی قسم کے طریقے عام تھے "وہاں سب کتابیں سوائے مستقل استعمال کی کتابوں کے درازوں میں، الماریوں میں، شکنجوں میں اور نقاش کے شکنجوں میں رکھی جاتی تھیں"۔[89]

رحل Book Stand مطالعہ کے وقت مخطوطے کو گرد اور نمی سے بچانے کے لیے ایک کتاب اسٹینڈ کا استعمال ہوتا تھا جس کو "سمپدا یا سمپدی" کہتے تھے۔ اسی قسم کا اسٹینڈ جتاکا کے وقت میں بھی استعمال ہوتا تھا اور اسے "آدھارکے" کہتے تھے (235-111)۔ مغلوں نے بھی اس کا وسیع طور پر استعمال کیا ہے اور اس کو جن ناموں سے پکارا جاتا تھا: رحل، سمپدا، سمپدی، چاپدا وغیرہ۔

---

89. The Medieval Library, James W.Thompson, p. 619.

جو رحل موڑے جا سکتے تھے ان کو چاپرا کہتے تھے اور جو نہ موڑے جا سکتے تھے ان کو سمپدا کہتے تھے۔

آرادھنا اور اتی چار امخطوطوں میں جو بالترتیب دکرمی سال 1353 اور 1369 کے ہیں ان میں کتاب اسٹینڈ کے لیے یہ الفاظ ملتے ہیں" سمپتکا، سمپتی کا اور سمپدا یا سمپدی۔ زاج شیکھر کے کاویہ مماسا میں بھی یہی الفاظ ہیں۔

مالدار آدمی صندل کے رحل بنواتے تھے اور ان پر خوبصورت وضع اور رنگ کرواتے تھے

سطح پوش[1] کبالی یا سطح پوش بانس کی کھپچیوں سے بنایا جاتا اور اس پر ریشمی یا سوتی کپڑا چڑھایا جاتا ہے۔ یہ چینی بانس کے کنڈر کے نمونہ پر بنایا جاتا ہے کھلے اوراق کو پڑھتے وقت عارضی طور سے روکنا ہوتا تو یہ سطح پوش استعمال کرتے ہیں۔ یہ لفظ سنسکرت لفظ کبی کا دلی یا کمبالی سے لیا گیا ہے۔

نشانی یا کمبی سنسکرت لفظ "کمبکا" سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ بانس کی کھپچی کی طرح چپٹی ہوتی ہے۔ مخطوطے کی روشنائی، رنگ اور کاغذ کو انگلیوں کے لس اور پسینہ سے بچانے کے لیے ہاتھی دانت، صندل، شیشم یا ساگون کی بنی ہوئی نشانی استعمال کیجاتی تھی

مخطوطہ پوش مخطوطہ کے اوراق کو بے جا موڑنے سے، پھٹنے سے اور موسمی اثرات سے بچانے کے لیے شیشم یا ساگون کی لکڑی کا مخطوطہ پوش بنایا جاتا تھا۔ بعض اوقات یہ مخطوطہ پوش خوبصورت وضع کے۔ رنگ کیے ہوئے اور سجے ہوئے ہوتے تھے۔ بعض اوقات وضعدار چمڑے کا ٹکڑا اور کبھی کبھی کھدر یا دوسرا سوتی کپڑا مخطوطہ پوشی کا مقصد پورا کرتا تھا انھیں پاٹا یا پنھا کہا جاتا ہے۔

گانٹھ مخطوطوں کو خشک یا تر موسم سے بچانے کے لیے، گرد سے اور تیز ہوا میں اوراق کو اڑنے سے محفوظ کرنے کے لیے ایک گانٹھ لگا دی جاتی ہے۔ یہ گرہ عام طور سے سوتی دھاگہ کی ہوتی ہے لیکن قیمتی مخطوطوں کے لیے ریشمی دھاگہ استعمال ہوتا ہے۔ بعض اوقات دوہری کھادی کے دھاگے یا شاذ و نادر مخملی دھاگے استعمال ہوتے ہیں۔

مصنفوں کی اپنے پڑھنے والوں سے جو استدعائیں ہوتی تھیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب کی حفاظت کی وہ کس قدر فکر رکھتے تھے یہ استدعائیں عام طور سے خاتمۂ کتاب پر مرقوم ہوتی تھیں:

(1) ۔ جو مخطوطہ چراتا ہے غمگین رہتا ہے اور اندھا ہو جاتا ہے اور بعد وفات دوزخ میں جاتا ہے۔

(2) ۔ وہ گنہگار جو مخطوطہ کو چرانے کی کوشش کرے گا یا میری سخت محنت کی کمائی کو نقصان پہنچائے گا برباد ہو جائے گا اور اس کا خاندان تاراج ہو جائے گا۔[90]

اور بھی بہت سے اشعار ہیں جن میں مخطوطوں کے تحفظ کی اپیل ملتی ہے اور ان میں سے بعض میں مخطوطوں کو نقصان پہنچانے والے یا چرانے والے کو رکیک زبان میں سخت کوسنے دیے گئے ہیں۔[91]

جین فلسفیوں کا خیال ہے کہ صرف کتابوں ہی سے انسانوں کو حق شناسی میں مدد ملتی ہے[92] وہ لوگ مخطوطوں کے مطالعہ کے وقت بھی ان کی حفاظت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ انھیں گندگی اور شکستگی سے بچانے کے لیے جین کتب بین اپنے منہ کو ڈھکنے اور ہتھیلیوں پر کپڑے کا ٹکڑا رکھتے تھے۔

تانبہ کی عطیاتی تختیوں کا تحفظ

مخطوطوں اور کتابوں کی طرح تانبہ کی عطیاتی تختیوں کی بھی خاص حفاظت کی جاتی تھی۔ بعض اوقات قیمتی کاغذات حفاظت کی غرض سے مٹی کے گھڑے میں رکھ کر زمین میں دفن کر دیے جاتے تھے۔ حال ہی میں چار جوڑ تانبہ کی تختیاں جنھیں مٹی کے گھڑے میں رکھ کر دفن کیا گیا تھا آندھرا پردیش کے سری کاکلم ضلع کے اندھاورم مقام پر دریافت کی گئی ہیں۔[93]

بعض اوقات ایسی تختیوں کو ایک پتھر کے صندوقچے میں جس کی شکل تجوری سے مشابہ ہو رکھا گیا۔ صندوقچے میں اوپر کا پتھر "10 x '1 x "5 '3 x '1 x "5 2 . اور "1.5 اندر سے خالی تھا۔ اس صندوقچے میں جو بمبئی کے احمد نگر ضلع میں نیواسا کے مقام سے سولہ میل مشرق میں کالی گاؤں میں دریافت

---

90. J.R.A.S.B., Vol. XVI, 1950, pp. 257-260.

91. J.R.A.S.B., V.XVI, 1950, pp. 257-260.

92. Jaina Chitra Kalpadruma, p. 110 ff.

93. Ep. Ind. Vol.XXVIII, p. 175 ff.

کیا گیا ہے تین تانبہ کی تختیاں ہیں جن کا سائز ".25 × "11 × 3.1 ہے[94] مزید براں عطیہ دینے والے خود بھی سند عطیہ سے متن کو غاروں کی دیواروں پر کندہ کر کے محفوظ کرا دیتے یا تختی گھر کی دیواروں میں پوشیدہ کراتے یا دور مقامات پر رکھتے تھے۔

<u>مخطوطوں اور کتابوں پر موسم کے اثرات</u> جین گیان بھنڈاروں کے نگراں گرمی اور نمی سے کتابوں کی حفاظت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ چونکہ انھیں احساس تھا کہ سورج کی براہ راست گرمی مضر ہے اس لیے بہت کم سیدھی سورج کی روشنی میں وہ مخطوطوں کو لاتے۔ صرف خاص حالات میں جب اوراق ایک دوسرے سے چپک جاتے تو انھیں ہوا اور دھوپ دی جاتی تھی لیکن براہ راست سورج کی روشنی میں نہ رکھا جاتا تھا۔

مخطوطوں کو تحریر کرنے میں جو روشنائی استعمال ہوتی تھی گوند اس کا ایک خاص جز تھا مرطوب آب و ہوا کی وجہ سے گوند گیلا ہو جاتا اور اوراق ایک دوسرے سے چپک جاتے ایسے اثرات سے بچانے کے لیے اوراق کو تختی کے ساتھ باندھ دیا جاتا تھا یہ سب ایک کہاوت کے مطابق ہوتا تھا کہ "کتاب کو بوجھے کے ساتھ خبردار ہمیشہ دشمن کی طرح رکھو"۔

مخطوطوں کو موسمی اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے جین گیان بھنڈار سخت گرمی اور زیادہ مرطوب موسموں میں بند کر دیے جاتے تھے۔ ان پر گلال چھڑک دیا جاتا تھا تاکہ صفحات ایک دوسرے سے نہ چپکیں۔

بعض اوقات صفحات چپک کر کیک کی شکل اختیار کر لیتے تھے ایسے کاغذی مخطوطوں کو دریائی ریت پر خشک مقام پر رکھ دیا جاتا تھا یا نم برتن میں بغیر پانی کے رکھ دیا جاتا تھا جب اوراق پر سردی کا اثر ہوتا تو انھیں دھیرے دھیرے الگ کیا جاتا تھا۔

دوسرا طریقہ چپکے ہوئے اوراق کو الگ کرنے کا یہ تھا کہ مرطوب موسم میں مخطوطوں کو کھلا رکھ دیا جاتا اور وہ نمی جذب کر لیتے پھر آہستہ آہستہ انھیں علاحدہ کر کے گلال چھڑک دیا جاتا تھا۔

جب کھجور کے پتوں والے مخطوطوں میں اوراق چپک جاتے تو عارضی طور سے انھیں گیلے کپڑے میں لپیٹ دیا جاتا۔ تھوڑی دیر اس طرح رکھنے سے پتیاں گیلی ہو جاتیں اور انھیں الگ کر دیا جاتا تھا۔

---

94. Ep. Ind. Vol.XXXII, pp.31-32.

کھجور کی پتی والے مخطوطے تیز روشنائی سے لکھے جاتے تھے اس لیے اس کے پھیل جانے یا خراب ہونے کا ڈر نہ تھا۔ اس عمل کے دوران پتیوں کی اوپری سطح کو بچانے کی خاص فکر رکھی جاتی تھی۔

اس قسم کے عمل سے کھجور کی پتی والے مخطوطوں کی عمر کم ہو جاتی ہے انھوں نے اپنے تجربے سے معلوم کر لیا کہ بھیگ کر مخطوطے 50 سال سے زیادہ قائم نہیں رہ سکتے ہیں[95]

گرم ممالک میں بے شمار کتابی کیڑے ہوتے ہیں جو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ایسے کیڑوں سے تحفظ کے لیے صندوقوں اور الماریوں میں اگر گندھ اور کافور رکھ دیا جاتا تھا[96]

الماریوں اور صندوقوں کی وجہ سے مخطوطے چوہے وغیرہ کے حملوں سے بچ جاتے تھے اسکے ساتھ ساتھ صفائی اور گرد جھاڑنا لائبریری کا معمول تھا۔ اس طرح ہندوستان کے عہد قدیم اور وسطیٰ میں مخطوطوں اور کتابوں کی دیکھ بھال کی جاتی تھی اور ان کی مناسب حفاظت کی ہر ممکن تدبیر کی جاتی تھی۔

مخطوطوں میں جو بدعا کے اشعار لکھے جاتے تھے اِن سے ان کی قدر و قیمت پر روشنی پڑتی ہے۔ ہم اس باب کو اس شعر پر ختم کرتے ہیں جس میں مخطوطے کی حفاظت کی غضبناک اپیل کی گئی ہے:۔

"بھگنا پرست کتی گریو ستبھد اورستی ادھو مکھا
کستین لکھیتم گرنتھم جتنن پرتی پالیسا"[97]

* * *

---

95. Ep.Ind. Vol. XXXII, pp.31-32.
96. Gaekwad's Oriental Series, V. LXXVI, p.39
97. Prasastimarga I, Ms. No.111 (dated 1306 V.S.)

باب دہم

ہندوستان میں طباعت کی تاریخ

سولھویں صدی میں منقولہ ٹائپ سے چھپائی کا آغاز ہندوستان کے کتب خانوں کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ علم اس سے پہلے ایک محدود حلقہ کے لیے تھا اور مخطوطات چند اشخاص کی قیمتی املاک مانے جاتے تھے۔ لیکن سرزمین ہند میں طباعت کے آغاز اور بتدریج فروغ نے کتابوں کی پیداوار کی شرح کو کافی آگے بڑھایا۔ اور عہد حاضر کی صبح ہو جانے کا اعلان کر دیا۔

یہ عام طور سے یقین کیا جاتا ہے کہ کتابیں سب سے پہلے چین میں چھپیں اور سب سے پہلے لکڑی کے چھاپوں سے چھپی کتاب ڈائمنڈ سوتر ہے جس کی تاریخ 868ء ہے۔ لیکن جدید تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانہ میں ہندوستان میں فن بلاک چھپائی معلوم تھا اور ہندوستانیوں اور چینیوں نے مل کر اہم بدھ تصانیف کو لکڑی کے چھاپوں سے چھاپنے کی کوشش کی۔

بے شمار مہریں موہن جوداڑو، ہڑپا، لوتھل اور دوسرے مقامات پر دریافت کی گئی ہیں اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہندوستانیوں میں ماقبل تاریخ چھاپوں کی بنیاد پر چھپائی کا تصور تھا[1]

1. Mohenzo Daro and the Indus Civilization, Sir John Marshall, London, 1931.

(پلیٹ XVI)۔ مُدرا کا لفظ جس کے معنی ہیں مہر، کوٹلیہ کے ارتھ شاستر میں ملتا ہے [2] ہمیں یجروید، اتھروید، گرود پُران، پدما پُران، گوتمیہ تانترا اور دوسری مذہبی کتابوں سے حوالے ملتے ہیں کہ خدا کی چھپی ہوئی چیز کے نشانات انسانی جسموں پر ملے [3] اس کے علاوہ مُدرا کا لفظ سنسکرت ڈرامہ "مدرا راکشش" میں استعمال ہوا ہے جو بلاک چھپائی کو ظاہر کرتا ہے [4]

چینی سیاح اِٹسنگ ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا اسکی تحریروں سے ہمیں مندرجہ ذیل معلومات ملتی ہیں:

ہندوستان میں پروہت اور عام آدمی ریشمی کپڑے اور کاغذ پر مہاتما بُدھ کی تصویریں چھاپتے ہیں اور جہاں کہیں بھی جاتے ہیں ان کی پوجا کرتے ہیں [5]

مزید یہ کہ ہندوستانی عالموں نے چینیوں کے ساتھ مل کر ایک بڑی ضخیم کتاب یعنی ترپتکا کا چینی ایڈیشن 5048 جلدوں میں چھاپا۔ اس کا ترجمہ سنسکرت سے 83-973ء میں ہوا۔ اس کی اشاعت کے لیے 1,30,000 لکڑی کے بلاک کاٹے گئے اور انھیں ایک نو تعمیر جگہ ذخیرہ کیا گیا یہ جگہ عدالتِ ترجمہ کے لیے بنی تھی جہاں ہندوستانی راہب اور ان کے ساتھی مصروف کار تھے" [6]

دھارا کی کمال مولیٰ مسجد میں دریافت شدہ پتھر کے ٹکڑے پر کندہ عبارت اس پر روشنی ڈالتی ہے کہ ہندوستان میں گیارھویں صدی میں پتھر کے بلاک سے چھپائی عام تھی [7]

---

2. Artha Sastra of Kautilya: Edited by R. Sham Sastri, 1919, p. 110.

3. I.L.Vi, 6, No.2, p. 35

4. (a) Anya Mudraya Mudhairam (Seal this with the signet ring)
   (b) Agrithita Mudrah Katakannish Kramasi (who are you going out of the camp without taking a self impression).

5. A record of the Budhist religion as preached in India and Malay Archipelago. I-Tsing (Taka Kasu), p. 130.

6. V.B.Q. Vol. 19, pp. 215-20.

7. E.W. Vol. 10, No.3, September 1969, pp. 203-204

8. Text- Vanussa Bhusana imnijassa niva
   (1) (2) Knagge tutha Kara-Kalic Khamge
   Tujjna bhvo esa sesanayassa....essa sirie...

اسی طرح پلندہ نما کتابیں یا ایک ایک ورق والی کتابیں پتھر کے بلاک سے چھاپ کر تیار کرنا چین میں خاص طور پر رائج تھا۔[8]

کندہ شدہ پتھر کا ٹکڑا ایک مقامی میوزیم میں محفوظ ہے اور 23 سینٹی میٹر لمبا ہے اس کی سب سے زیادہ چوڑائی 6 سینٹی میٹر ہے۔ یہ اپنی وضع کا ایک الگ ٹکڑا ہے جس پر دیوناگری رسم الخط میں الٹی کھدائی کی ہوئی ہے۔ یہ ٹکڑا جو کسی بڑے سنگی بلاک کا حصہ ہے اس کام کے لیے استعمال ہوتا تھا، جو تحریر اس پر کندہ ہے اس کی نقول بنائی جا سکیں (پلیٹ XVII)

یہ تمام شواہد اور وہ بے شمار لکڑی کے ٹکڑے اور بلاک چھاپے جو اب تک دستیاب ہوئے ہیں وسطی ایشیا کے کھنڈرات سے دریافت ہوئے ہیں۔[9] یہ علاقہ ہندوستان کی تہذیبی روایت سے بہت متاثر تھا یہ سب اس حصۂ زمین کی تشکیل کرتے ہیں جس میں ہندوستان نے طباعت کے ابتدائی فروغ میں اپنا کردار ادا کیا۔

مذکورہ بالا شواہد کی بنیاد پر اس بات کو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اصل کی نقل بنانے اور بلاک سے چھپائی کا فن قدیم ہندوستان والوں کو معلوم تھا۔ عہد وسطی میں مغل اور مراٹھوں کا یورپی باشندوں سے قریبی رابطہ ہوا۔ یوروپی پادری حضرات چھپی ہوئی کتابیں لائے اور انھیں بادشاہوں کو پیش کیا۔ اگرچہ یہ لوگ یوروپی باشندوں سے قریبی تعلق رکھتے تھے پھر بھی انھوں نے ہندوستان میں طباعت کے فن کو رائج کرنا پسند نہیں کیا۔

ہندوستان کے زمانۂ قدیم و وسطی کی تہذیبی تاریخ کا قریبی مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ کون سے سماجی، اقتصادی اور مذہبی پہلو فنِ طباعت کے رائج کرنے کے خلاف تھے۔

عام طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی ادب کی بے پناہ عزت، خطاطی اور کتابت سے عشق اور پیشۂ خطاطی کی قدر نہ ختم ہونے دینے کی وجہ سے فنِ طباعت ہندوستان میں سولھویں صدی سے قبل نہ قدم جما سکا نہ فروغ پا سکا۔

---

8. The invention of Printing in China and its spread Westward, T.F. Carter, p. 21.
9. J.R.A.S.B., 1909, p. 304 and The Invention of Printing in Chinse, p. 145.

ہندوستان میں چھاپہ خانہ کی ابتدا اب سرزمین ہندوستان پر طباعت کے فروغ کی تاریخ بیان کی جائے گی جو ملک کے ساحلی علاقہ میں زیادہ ترقی پاتی رہی۔ مغربی ساحل پر گواہ کوئیلون، امبا لکاڈو۔ ٹرانکوئیبر، بمبئی اور پونا۔ مشرقی ساحل پر ویپرے فورٹ سینٹ جارج مدراس، فورٹ ولیم کلکتہ اور سری رام پور کو ہندوستان میں ابتدائی طور پر مطبوعہ کتابیں پیش کرنے کا شرف حاصل ہے۔

گوا پرتگال سے آکر ۶ ستمبر ۱۵۵۶ء کو[10] گوا میں پہلا چھاپہ خانہ قائم ہوا۔ جیسوٹ لیٹرس (Jesuit Letters) مرتبہ فادر بکاری (Fr. Beccari) کی دسویں جلد میں ایک خط شائع ہوا تھا جو فادر گیسپر کالیز (Fr. Gasper Calaze) نے ۳۰ اپریل 1556ء کو سینٹ اگنی ٹش (St. Ignatius) کو لکھا تھا اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ابے سینیا کے (حبشہ) شہنشاہ کے مسلسل اصرار پر فادر جے نونیس (Fr. J. Nunes) (جو سردار کلیسا حبشہ تھے) کی نگرانی میں چھاپہ خانہ پرتگال سے ایتھوپیا (حبشہ) بھیجا گیا۔ اسی گروہ میں ایک برادر جوان ڈی بستا منٹے، (Brother Juan de Bustamante) تھا جو چھپائی کا فن جانتا تھا اور ایک ہندوستانی نے بستا منٹے کو چھاپہ خانہ قائم کرنے میں مدد کی[11]

جو جہاز اس پارٹی کو معہ چھاپہ خانہ کے ابے سینا (حبشہ) لے جا رہا تھا راستہ میں گوا ٹھہرا۔ گوا کے گورنر نے فادر جان نونیس سے ٹھہرنے کی درخواست کی عین اس وقت جب وہ گوا سے ابے سینا کی طرف کوچ کی تیاری کر رہا تھا۔ سردار کلیسا نے اس درخواست کو منظور کر لیا اور گوا میں ٹھہر گیا[12]

اس چھاپہ خانہ نے کام کرنا دراصل اکتوبر 1556ء سے اس وقت شروع کیا جب جان نے منطق پر تحقیق کے الگ الگ ورق چھاپنے شروع کیے۔ یہ تحقیق ایک مباحثہ کا خلاصہ تھی،

---

10. The Printing Press in India, Priolkar, p. 7
11. The Printing Press in India, Priolkar, p. 7
12. The Printing Press in India, Priolkar, p.4-9

جو عوام اور پادریوں کے درمیان ہوا تھا۔[13]

1557ء میں پہلی معلوم کتاب سینٹ زے ویر (St. Xavier) کی ڈوکٹرینا کرسٹا" (Doutrina Christa) تھی جو پرتگالی زبان میں گوا میں چھپی تھی۔ بدقسمتی سے اس کتاب کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے[14] لیکن اس کے تامل ترجمہ کا پہلا نسخہ جو 1554ء میں لسبن (Lisbon) میں چھپا تھا میوز انٹولوجیز ڈبیلم (Muse Entologies Da Belam) لسبن میں محفوظ ہے۔

طابع، جان کوئن کوئینسو (John Quinquencio) اور جان انڈم (John Endem) نے جو شاید پرتگال کے آرک بشپ کے ساتھ گوا آئے گاسپر ڈی لیو (Gasper De Leao) کی تصنیف کمپنڈیو اسپرچول ڈا ویڈا کرسٹا (Compendio Spiritual da vida Christaa) کو 2 جولائی 1561ء میں شائع کیا۔ یہ ایک موٹی سی چھوٹے سائز کی کتاب ہے اس کا ایک نسخہ نیو یارک پبلک لائبریری میں محفوظ ہے[15] (پلیٹ ×۱×)

جان آف انڈم نے ایک کتاب "کنورسیشن ان انڈین پلانٹس اینڈ ڈرگز ریفرنگ ٹو میڈیسن اف انڈیا" (Conversation on Indian plants & drugs refering to medicine of India) 1563ء میں شائع کی۔ یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ جان انڈم نے کتنی کتابیں چھاپیں لیکن Rev. Pawate کے مطابق چھ جلدیں ہیں۔ چھ میں سے پانچ جلدیں فولیو (Folio) سائز اور ایک کوارٹو سائز (Quarto) میں ہے۔[16]

1578ء میں ہنریک ہنریکس (Henrique Henriques) نے "Doutrina Christa" کا تامل ترجمہ شائع کیا (پلیٹ ××)۔ چونکہ یہ ملاباری اور تامل انداز میں چھپی تھی اس لئے فادر سوزا (Fr. Souza) اس کے متعلق لکھتے ہیں "یہ پہلی مطبوعہ کتاب ہے جو سرزمین ہند

---

13. The Printing Press in India, Priolkar, p.7
14. The Printing Press in India, Priolkar, p.8
15. Proceedings of the All India Library Conference, 1942, p. 226.
16. Proceedings of the All India Library Conference,1942,p227.

میں شائع ہوئے"[17] لیکن سینٹ زیویر (St. Xavier) کی (Doutrina Christa) سنہ 1557ء میں شائع ہو چکی تھی۔ یہاں فادر سوزا کا پہلی کتاب کا مطلب ہے کہ یہ تامل ترجمہ پہلی کتاب ہے جو ہندوستانی زبان میں چھپی۔

1577-78ء کے درمیان جوان گونسالویز (Joan Gonsalves) نے جو اسپینی باشندہ تھا اور بستامنٹے (Bustamante) کے ساتھ گوا آیا تھا اور جیوا ڈا فیریا (Jeao da Faria) نے ہندوستانی ٹائپ تیار کرلئے۔ "وہ یعنی جوان گونسالویز پہلا شخص تھا جس نے ملاباری حروف کے ٹائپ بنائے اور ان سے اولین کتابیں چھاپی گئیں"۔[18]

یونڈ فیریا (Reu Faria) نے تامل زبان کے حروف ڈھالے۔ عصری ریکارڈ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک برہمن جو نیا نیا عیسائی ہوا تھا جس کا نام پیرو لوئیس (Pero Luis) تھا گوا سے گانسالویز کی مدد کو بھیجا گیا کہ ہندوستانی حروف کی ترتیب سمجھائے۔[19]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملاباری حروف کا اصل مقصد کیا ہے؟ اس مسئلہ پر بہت اختلاف تھا جس کا خاتمہ اس طرح ہوا کہ (Doutrina Christa) کی ایک نقل سنہ 1578ء کی چھپی ہوئی تلاش کرلی گئی شرہیمر (Schurhammer) نے اپنے ایک مضمون "ہندوستانی حروف میں پہلی طباعت" میں جو ہارورڈ لائبریری بلیٹن جلد 6 نمبر 2 میں چھپا تھا کوئیلون کی ملاباری تامل حروف میں چھپی اولین کتاب کے کچھ اوراق دوبارہ نمونہ کے طور پر شامل کیے تھے ان اوراق کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گونسالویز کے ملاباری ٹائپ حروف اور فیریا کے تامل حروف یکساں ہیں۔

کوئیلون (Quilon)

Doutrina Christa کا ترجمہ دونوں مذکورہ ٹائپوں میں چھپا تھا۔ پہلی آٹھ سطور کے ٹائپ گانسالویز نے گوا میں سنہ 1577ء میں بنائے اور باقی کتاب میں جو ٹائپ استعمال کیا گیا وہ فیریا نے کوئیلون میں سنہ 1578ء میں بنایا۔[20] اس کتاب میں سولہ صفحات ہیں اور آج کل یہ ہارورڈ

---

17. Oriente conquistado a Jesus Christo. Francis de Souza. Con. 1-2,12, p.67.
18. Oriente conquistado a Jesus Christo. Francis de Souza. Con. 1-2-33, p. 81
19. The Printing Press in India, p. 11.
20. THE PRINTING PRESS IN INDIA, PP.10-11

کالج لائبریری کی ملکیت ہے۔

امبالکاڈو (AMBALAKKADU)

کوچین میں امبالکاڈو ہندوستان میں ابتدائی طباعت کا مرکز تھا۔ لیکن اس کی چھپی ہوئی کتابوں کو تلاش نہیں کیا جاسکا (Doctrina Christa) کی ایک بالکل مختلف جلد 1579ء میں کوچین میں چھپی[21] یہ 1578ء کی چھپی Doctrina Christa کا دوسرا ایڈیشن نہیں ہے بلکہ ایک الگ کتاب ہے۔ یہ مارکوس جارج (Marcos George) کی 1566ء کی چھپی پرتگالی زبان کا ترجمہ ہے[22] یہ کتاب سوربون (Sorbonne) لائبریری میں محفوظ ہے اور اس کے سرورق کا فوٹو سوارامن کے مضمون " ابتدائی سرورق اور اس کا ارتقاء" کے ساتھ شائع ہوا۔ عنوان کا ترجمہ کیا گیا ہے "کرسٹیا وانکام" (Christyalvanakanam)[23] فلاس سانے تورم (FLOS SANETORUM) ایک اور تامل کتاب ہے جس کے مصنف انرک ہنریک (H. Henriques) تھے یہ 1586ء میں شائع ہوئی اور واٹکن لائبریری میں موجود ہے۔

چھپائی کا کام گوا میں 1674ء تک بغیر کسی وقفہ کے چلتا رہا لیکن دھیرے دھیرے زوال پذیر ہونے لگا اس لیے کہ پادری حضرات کی ہمت پست ہوگئی تھی دوسرے یہ کہ وہ ہندوستانی زبانیں سیکھنے سے گریز کرتے تھے۔[24] 1684ء میں ایک حکم جاری کیا گیا کہ گوا میں مقامی زبانوں کی جگہ پرتگالی استعمال ہوگی اس کی وجہ سے ہندوستانی زبانوں میں طباعت کا کام ختم ہوگیا۔[25]

کیتھولک مبلغوں کی طرح ڈنمارک کے پروٹسٹنٹ مبلغین کی کوشش جو انھوں نے چھپائی کو رائج کرنے میں کی، بہت اہمیت رکھتی ہے۔ انھوں نے اپنے مذہب کی ترویج کے لئے مقامی

---

21. H.L.B. VOL. VI, NO.2,1952, p. 148
22. THE PRINTING PRESS IN INDIA. p.11
23. M.M.L.A. 1941, pp. 54-65
24. PROPAGATION OF THE GOSPEL IN THE EAST. PART III, p.50
25. THE PRINTING PRESS IN INDIA, pp. 25-26

زبان سیکھی۔ سماجی رسم و رواج سے اور عقیدتمندوں سے واقفیت حاصل کی اور چھپائی کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں بارتھولیمو زیگنبلاغ (BARTHOLEMOV ZEIGENBLAG) کا نام سرفہرست آتا ہے۔ وہ 1706ء کے قریب ہندوستان آیا اور کیتھولک افراد کی بدشعاری دیکھ کر سخت متاسف ہوا۔ وہ 1706ء میں یکم اکتوبر والے اپنے خط میں لکھتا ہے:۔

"ان کا تبدیلی مذہب کرنا (عیسائی بننا) رومن کیتھولک کے رویہ سے بھی رک جاتا ہے کیونکہ وہ مقامی باشندوں کو ہر منحوس طریقہ سے مذہبی دیگر عیسائی بنانا چاہتے ہیں"[26]

بڑے مذہبی جوش و خروش کے ساتھ ڈنمارک کے مبلغ حضرات نے حالات کو بدلنے کی کوشش کی تاکہ عیسائیت کی ترویج ہو سکے۔ انھوں نے یہ بھی تصور قائم کیا کہ ان کے مقصد کی بہتری اسی میں ہے کہ عیسائی مذہبی لٹریچر کو مقامی زبانوں میں چھاپ کر عوام میں وسیع طور پر تقسیم کیا جائے۔

اس مقصد کے تحت زیگنبلاغ (ZEIGENBLOG) نے 22 راگست 1708ء کو ملابار اور پرتگالی چھاپہ خانہ قائم کرنے کا مطالبہ کیا" اور 1709ء میں تمام یورپین پروٹسٹنٹ ملکوں سے اپیل کی کہ وہ اس نیک کام میں ان کی مدد کریں۔ زیگنبلاغ اور اس کے شریک کار الیف ای گرنڈلر (F. E. GRUNDLAR) نے چھاپہ خانہ۔ ڈھلائی کا کارخانہ اور کاغذ حاصل کرنے کی بار بار اپیل کی[27] 1712ء میں ریورنڈ اے۔ ڈبلیو۔ بوہمے (Rev. A. W. BOEHME) (جو شاہزادہ جارج ڈنمارک کے جرمن پادری تھے) کی کوششوں سے اپیل کامیاب ہوئی اور انگلینڈ کی "سوسائٹی فار پروموشن آف کرسچین نالج" نے ہندوستان میں ڈنمارک کے مبلغین کو چھاپہ خانہ۔ 100 ریم کاغذ۔ پرتگالی زبان میں نیو ٹسٹامنٹ (New Testament) کے 213 نسخے اور ایک چھاپنے والا جونس فنک (JONES FINCR) بھیجا۔[28]

---

26. PROPAGATION OF THE GOSPEL IN THE EAST, PART I, p.35
27. PROPAGATION OF THE GOSPEL IN THE EAST, PART II, p.15
28. PROPAGATION OF THE GOSPEL IN THE EAST, PART III, pp.1-17

ٹرانکوئبر سوائے فنک (FINCK) کے تمام چیزیں دوسرے سال یہاں پہنچ گئیں ۔ مسٹر فنک (چھپائی کارکن) راستہ میں بخار آجانے کی وجہ سے راس امید کے پاس مرگیا۔ ٹرانکوئبر (مدراس میں) چھاپے خانے نے ۱۱ جون ۱۷۱۳ء سے ایک جرمن طابع کی مدد سے جو پہلے سے ڈنمارک کی کسی کمپنی میں تھا چھپائی کا کام شروع کردیا۔[29] اس نے تیزی سے ملابار ٹائپ بنانے شروع کردیے اور بہت جلدی ڈھلائی کا کارخانہ قائم کرلیا۔ ۱۱ دسمبر ۱۷۱۳ء کے خط کے ایک اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ چھ ماہ کے اندر چھاپہ خانہ اور ٹائپ ڈھالنے والے کارخانہ نے کافی ترقی کرلی اس نے ایک کتاب چھاپی جس کا نام تھا "شرک سے بیزاری" اور اس سے بچنے کا راستہ"۔ یہ طباعت ان کے اپنے ڈھالے ہوئے ٹائپ حروف سے تھی اور پہلا تجربہ تھا۔[30]

۱۷۱۴ء میں The four evangelists and اور New Testament نیز the acts of the Apostles کتابیں تامل زبان میں چھپیں۔ اوّل الذکر کا ایک نسخہ سری رامپور کالج لائبریری میں محفوظ ہے۔

چھاپہ خانہ کو جو زور شور سے کام کر رہا تھا ہندوستان میں مشہور کرنے کے لیے ان حضرات نے "ایک شیٹ المانک" (Sheet Almanac) چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا جو نہ صرف کارومنڈل ساحل پر فروخت ہوا بلکہ مالابار اور بنگال میں بھی بکے"۔[31] جلد ہی ایک کاغذ بنانے کا کارخانہ "مشن کی بہبودی کے لیے" قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔[32]

ایک اور ڈنمارک کا مبلغ جس کا نام کرسچن فریڈرک شوارٹز (Christian Frederick Schwartz) تھا اور جو تنجور کے روشن خیال راجہ سرفوجی بھونسلے کا استاد تھا اس نے راجہ کو احساس دلایا کہ وہ سنسکرت اور مراٹھی کتابوں کے لیے ایک مطبع قائم کرے۔ ہمیں چھاپہ خانہ کی تفصیلی تاریخ معلوم نہیں لیکن مندرجہ ذیل مراٹھی اور سنسکرت کتابیں اس مطبع میں انیسویں صدی کے آغاز میں

---

29. PROPAGATION OF THE GOSPEL IN THE EAST, PART III, p. 25

30. PROPAGATION OF THE GOSPEL IN THE EAST, PART III, p.68

31. PROPAGATION OF THE GOSPEL IN THE EAST, PART III, p.43

32. PROPAGATION OF THE GOSPEL IN THE EAST PART III, p.184

چھپی تھیں:۔

(1) بدھ کانڈ مصنفہ بیکن ناتھ (1809)

(2) ششو پال وادھ مصنفہ ماگھ (1812)

(3) کری کاولی اور

(4) مکتاولی

یہ کتابیں سرسوتی محل لائبریری تنجور میں محفوظ ہیں۔[33] اس مطبع کی چھپی ایک اور کتاب "بال بودھ مکتاولی" برٹش میوزیم لائبریری میں محفوظ ہے "دیوناگری ٹائپ جو اس مطبع میں استعمال کیے گیے وہ چارلس ولکنس (Charles Wilkins) نے ڈھالے تھے۔"[34]

مدراس مدراس میں پہلا چھاپہ خانہ ویپری (Vapery) میں قائم ہوا بعد میں یہ ڈایوسسن پریس (Diocesan Press) کے نام سے مشہور ہوا۔ تامل ٹائپ پہلے مدراس میں ڈھالے گئے اور 1870ء تک ویپری میں استعمال ہوئے۔ یہ مطبع ویپری میں مندرجہ ذیل حالات میں شروع کیا گیا۔

> "1761ء میں سر آئر کوٹ (Sir Eyre Coote) نے پانڈیچیری کو فرانسیسیوں کے قبضہ سے چھین لیا اور گورنر کے مکان میں چھاپہ خانہ اور ٹائپ بنانے کا کارخانہ قائم ہوا۔ یہ کارخانے بطور مالِ غنیمت مدراس لائے گئے تھے لیکن فورٹ سینٹ جارج کے حکام اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے کیونکہ یہاں کوئی چھپائی کارکن نہ تھا۔
> ایک بڑا تامل عالم جو اس زمانے میں ویپری میں رہتا تھا اسکا نام (Fabricius) فیبری کس تھا۔ اسے یہ چھپائی کا سازوسامان اس شرط پر دیا گیا کہ اگر کمپنی کو مستقبل میں چھپائی کا کچھ کام پڑا تو وہ اس کو کرنا ہوگا۔ ویپری

---

33. J.T.S.M.L. VOL, I, No.2, 1939-40/p.46

34. THE PRINTING PRESS IN INDIA, p. 46

ھی میں فیبری کس نے اپنی مناجات کی کتاب چھاپی اور سنہ 1799ء میں "تامل، انگلش لغت" اور سنہ 1786ء میں "انگلش - تامل لغت" شائع کی۔[35]

فورٹ سینٹ جارج

فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس سنہ 1812ء میں قائم ہوا اور اس سے وابستہ مطبع نے تیلگو اور کنڑ زبانوں میں کتابیں چھاپنے کی ذمہ داری سنبھالی۔ یہ کالج فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے نمونہ پر تھا اور اسی کی طرح اس کا ایک مقصد بھی یہ تھا "کہ جنوبی ہند کی زبانوں سے متعلق ویسے ہی پسندیدہ نتائج پیش کرے"۔

فورٹ سینٹ جارج کالج سے چھاپہ خانہ میں مندرجہ ذیل کتابیں طبع ہوئی تھیں:۔

1۔ تیلگو زبان کی قواعد مصنفہ اے۔ ڈی۔ کیمپبل۔ (1816) [36]
2۔ تیلگو زبان کی قواعد مصنفہ اے۔ ڈی۔ کیمپبل دوسرا ایڈیشن (1820) [37]
3۔ کرناٹک زبان کی قواعد مصنفہ جے۔ ایم۔ کیرل (1820)
4۔ انگلش - کنڑ لغت مصنفہ ریورنڈ ولیم ریو۔ (1826) [38]

گریرسن (Grierson) نے ہمیں بتایا ہے کہ ایک کتاب جینتو زبان کی قواعد جو مدراس کے شمال مغرب میں رہنے والے لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں" سنہ 1807ء میں مدراس میں چھپی تھی۔[39] ہمیں نہیں معلوم کہ یہ کس چھاپہ خانہ میں طبع ہوئی تھی؟

کنڑ زبان کی چھپائی کو بلاری، بنگلور اور منگلور کے عیسائی مبلغین کی مدد سے فروغ حاصل ہوا منگلور کے لوہار انتاچاریہ نے ٹائپ حروف کو موجودہ ترقی یافتہ حد تک پہنچایا۔[40]

---

35. M.M.L.A. 1941, pp. 37-43
36. LINGUISTIC SURVEY OF INDIA, Vol. IV, p.582.
37. INDIA PRIVATE COLLECTION OF MR. A.K. PRIOLKAR.
38. LINGUISTIC SURVEY OF INDIA, Vol. IV, p. 367
39. LINGUISTIC SURVEY OF INDIA, VOL.IV, p. 582.
40. THE PRINTING PRESS IN INDIA, pp. 49-50

گرنا ٹا زبان کی قواعد مصنفہ ڈبلیو. کیری (W. Carey) سنہ 1817ء میں سری رامپور مشن پریس میں چھپی ۔

بمبئی بمبئی میں طباعت کو روشناس کرانے کی اوّلین کوشش سنہ 1674-75ء میں کی گئی۔ بھیم جی پریکھ ایک گجراتی تاجر اس تحریک کے رہنما تھے۔ انھوں نے اس کا آغاز خالص تجارتی نقطۂ نظر سے کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ہندو مذہبی کتابیں چھاپیں جن کی فروخت کا میدان خاصا وسیع تھا۔ انھوں نے ایک چھاپہ خانہ درآمد کیا[41] اور ایسٹ انڈیا کمپنی سے سنہ 1670ء میں درخواست کی کہ ایک لائق چھاپنے والا بمبئی بھیجے جس کو وہ -/50 پونڈ سالانہ دینے کے لیے تیار تھے اور تین سال کے لیے تقرر کرنا چاہتے تھے[42] ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھیم جی کی درخواست اس خیال سے قبول کرلی کہ اس نے عیسائی لٹریچر چھاپنے میں مدد ملے گی اس طرح حضرت عیسی کا مذہب پھیلے گا[43] کمپنی کے ایک خط برائے سورت مورخہ 3 اپریل سنہ 1674ء سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک ماہر طباعت مسمّی مسٹر ہنری ہلز (Mr. Henry Hills) مع چھاپہ خانہ۔ ٹائپ اور دوسری ضروری اشیاء مثلاً کاغذ وغیرہ کے بمبئی بھیجا گیا[44]۔ مسٹر ہلز ایک قابل طابع تھا لیکن ٹائپ ڈھالنے میں اتنی مہارت نہ رکھتا تھا اس لئے مسٹر پریکھ نے ٹائپ ڈھالنے والے کے لیے دوبارہ درخواست کی۔ ہم نہیں جانتے کہ ٹائپ ڈھالنے والا واقعی بمبئی پہنچا یا نہیں۔

لیکن آہستہ آہستہ طباعت کی حوصلہ افزائی جنرل آنجیر (General Aungier) گورنر بمبئی کی کوشش سے ہوئی[45] کچھ سرکاری کاغذات چھپنے شروع ہوئے جنکا ذکر کیپٹن الیگزینڈر ہملٹن نے (Capt. Allexander Hamillton) نے کیا ہے جنھوں نے سنہ 1688ء سے سنہ 1723ء تک ہندوستان کا دورہ کیا[46]

---

41. THE PRINTING PRESS IN INDIA, pp.27
42. ENGLISH RECORDS OF SHIVAJI, POONA, Vol. 1, p. 187
43. ENGLISH RECORDS OF SHIVAJI, POONA, Vol.II, p. 83
44. ENGLISH RECORDS OF SHIVAJI, POONA, Vol.I, p. 327
45. THE GAZETTEER OF BOMBAY CITY AND ISLAND, Vol.II.
46. ACCOUNT OF THE EAST INDIES, Vol. 1, p. 61

ہمیں نہیں معلوم کہ مراٹھوں نے طباعت کی حوصلہ افزائی کی یا نہیں؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہوتا تو اس دور کے کاغذات چھپے ہوئے ملتے۔ داستاویزی شواہد کی یکسر عدم موجودگی دوسری ہی کہانی بتاتی ہے۔ لیکن نانا فرنویس نے "بھگوت گیتا" کو تانبہ کی ڈھلائی کرنے والے سے مراٹھی حروف میں ڈھلوا کر چھپوانے کا خیال کیا۔ اس لئے اس نے پونا کے کاریگروں سے حروف کے سانچے بنوانے کی کوشش کی ہے[47]

پریولکر کی تحقیق سے مراٹھا رہنما کی اس کوشش پر جو اس نے تانبہ کی ایک دفع کی تختیاں بنوانے میں کی جس میں چھپائی کے لیے حروف لگے ہوتے تھے خاصی روشنی پڑتی تھی لیکن وہ اس خیال کو آگے بڑھانے میں ناکام رہا۔ جب پیشواؤں کی قسمت بدلی تو جو کاریگر دولت کے متمنی تھے انھوں نے میراج کے سردار گنگا دھر راؤ گوبند کی ملازمت اختیار کرلی۔ اور وہ سنہ 1805ء میں بلاک کی چھپائی کے ذریعہ بھگوت گیتا کی نقل چھاپنے میں کامیاب ہوگئے۔ تقریباً 175 تانبہ کی تختیاں جن پر حروف جڑے ہیں اور بھگوت گیتا کا ایک نسخہ بالترتیب بھارت اتہاس سنشودھک منڈل پونا میں اور پنڈت رگھوناتھ شاستری ساکن رتناگری کے پاس موجود ہیں[48]

بمبئی میں چھپائی درحقیقت اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں شروع ہوئی اور جو ٹائپ اسمیں استعمال ہوئے وہ سمندر پار ملکوں سے درآمد کیے ہوئے تھے۔

مسٹر جارج بوئسٹ (George Buist) مدیر "بامبے ٹائمز" ہمیں اپنے ایک مقالے میں بتاتے ہیں جو 4 دسمبر سنہ 1855ء میں "بمبے ٹائمز" اور "جنرل آف کامرس" میں چھپا تھا کہ سنہ 1780ء کا سالانہ کیلنڈر جسے رستم کریساجی (Rustam Caresajee) نے چھاپا تھا بمبئی کی چھپی ہوئی پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب میں 34 صفحات ہیں لیکن فہرست ملتی نہیں ہے۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل تین رسالے بمبئی میں چھپے تھے:۔

1۔ بامبے ہیرالڈ سنہ 1789ء میں[49]

2۔ بامبے کوریر سنہ 1790ء میں[50]

3۔ بامبے گزٹ سنہ 1791ء میں[51]

---

47. NAVAYUGA BOMBAY, 1915, Vol. 1, No.8, pp. 569-70

48. THE PRINTING PRESS IN INDIA, pp.33-35.

49. THE BOMBAY CITY GAZETTEER, Vol. III, p.140

50. THE BOMBAY CITY GAZETTEER, Vol. III, p.140

51. THE BOMBAY CITY GAZETTEER, VOL.III, p.140

اس وقت کوُریر پریس کو ایک امتیازی سربراہی حاصل تھی اور واقعی اس کی تجارت پورے بمبئی میں چلتی تھی[52]

ایک کتاب " ریمارکس اینڈ اکرنسز (Remarks & Occurrences) مصنفہ مسٹر ہنری بیچر (Henry Becher) جو انھوں نے ٹیپو سلطان کی جیل میں ڈھائی سالہ اپنی حراست کے دوران تحریر کی تھی جہاں سے وہ بعد میں فرار ہوئے" 1793ء میں بمبئی میں چھپی ۔ "یہ بمبئی میں چھپی اوّلین کتاب ہے" یہی مذکورہ کتاب کے تعارف میں درج ہے ۔ اور یہ کتاب ہیراس انسٹی ٹیوٹ آف انڈین ہسٹری اینڈ کلچر بمبئی (Hers Institue of Indian History & Culture) میں محفوظ ہے۔

اب ان دو کتابوں کلنڈر برائے 1780ء اور مذکورہ بالا کتاب میں مقابلہ ہے کہ ان میں سے بمبئی میں چھپی پہلی کتاب کون سی ہے ۔ اوّل الذکر کتاب ملتی نہیں ہے اور یہ دعوا کہ رستم جی کا مطبع بمبئی کا پہلا مطبع تھا بے بنیاد ہے ۔ دوسری کتاب موجود ہے اور اس کے تعارف میں یہ تحریری دعوا ہے کہ یہ بمبئی کی اوّلین مطبوعہ کتاب ہے ہم دوسری کتاب کے دعوے کو تسلیم کر سکتے ہیں ۔

کوُریر پریس اس زمانہ میں بمبئی کا سب سے بڑا چھاپہ خانہ تھا اس کے مالک نے تجارت کی توسیع کے لئے گجراتی اور مراٹھی ٹائپ کی ضرورت محسوس کی ۔ پریس کے ایک ملازم جی جی بھائی چھاپ گرنے کوُریر پریس کے لئے ٹائپ تیار کئے[53] گجراتی ٹائپوں کو سب سے پہلے 29 جنوری 1799ء میں ایک اشتہار چھاپنے میں استعمال کیا گیا[54] مسٹر چھاپ گر کی مدد سے فردون جی مرزبان نے 1812ء میں بمبئی میں پہلا گجراتی پریس قائم کیا[55] اور مندرجہ ذیل کتابیں چھاپیں :-

1 ۔ این المانک فار دی ہندو سمبت ایر 1817 1814ء میں

An almanac for the Samvat year 1871 in 1814

2 ۔ دیو استھان کا گجراتی ترجمہ 1815ء میں ۔

3 ۔ کھورڈے اویستا (Khorde Avesta) کا گجراتی ترجمہ 1817ء میں

---

52. THE PRINTING PRESS IN INDIA, pp. 72-73.

53. THE PRINTING PRESS IN INDIA, p.73.

54. THE PRINTING PRESS IN INDIA, p.73.

55. THE PRINTING PRESS IN INDIA, p.78.

4۔ بامبے سماچار رسالہ ۱۸۲۲ء میں ادا ہوا ۱۸۳۲ء تک جاری رہا۔

مرزبان ۲۳ مارچ ۱۸۴۷ء کو مر گیا۔ ابتدائی قسم کے ٹائپ جو مرزبان نے تیار کروائے تھے۔ گنپت کرشن جی اور جاوٗ جی دادا جی نے انھیں بڑی حد تک بہتر بنالیا۔

مراٹھی زبان میں پہلا اشتہار بمبئی کے کوریر پریس میں ۱۷ جولائی ۱۸۰۲ء میں چھپا۔ گجراتی اور مراٹھی رسم الخط جو کوریر پریس میں استعمال ہوتے تھے انھیں مہاجن اور مودی رسم الخط کہا جاتا ہے یہ رسم الخط عوام کے لیے اور زود نویسی کے لیے ہوتے تھے تعلیم یا عدالتی رسم الخط جو گجراتی اور مراٹھی کے لیے استعمال ہوتے تھے شاستری اور بال بودھ کہلاتے تھے۔

۱۸۰۸ء میں ایک کتاب ۔ "السٹریشن آف دی گرامیٹیکل پارٹس آف گجراتی مراٹھی اینڈ انگلش لینگویج" (Illustration of the grammatical Parts of Gujrati (Marathi and English language) مودی رسم الخط میں کوریر پریس میں چھپی تھی۔ یہ کتاب ریونڈ رابرٹ ڈرمنڈ (Rev. Robert Drummond) نے لکھی تھی۔

بامبے نیٹو اسکول بک اینڈ اسکول سوسائٹی (قائم شدہ ۱۸۲۲ء) (Bombay Native School Book & School Society) نے ۲۶-۱۸۲۵ء میں درسی کتابوں کے لیے دیوناگری رسم الخط اپنی پالیسی کے مطابق مقرر کیا۔ لیکن مہاجن اور مودی رسم الخط مقبول تھے اس لیے دیوناگری رسم الخط خاطر خواہ اثر پیدا کرنے میں ناکام رہا۔

انیسویں صدی کے آغاز میں یورپ بمبئی میں برسر اقتدار آئے ساتھ ہی ساتھ امریکن مبلّغین نے بھی اس جزیرہ کو اپنا مستقر بنایا گورنمنٹ کی مدد اور امریکی مبلّغین کے جوش و خروش کی بنا پر بمبئی میں طباعت کا کام کافی پھیلا اور اس کی خاص حوصلہ افزائی اور سرپرستی ہوئی۔

عیسائی لٹریچر کی اشاعت کے لیے امریکی مبلّغین نے ایک چھاپہ خانہ ۱۸۱۶ء میں قائم کیا، اور ۱۸۱۷ء میں انھوں نے مراٹھی رسم الخط میں گاسپل آف سینٹ میتھیو (Gospel of St. Mathew) کا ترجمہ شائع کیا۔[56] لیکن مراٹھی میں سب سے پہلی مطبوعہ کتاب ایک لاطینی کتاب "ہورٹس انڈیکس ملاباریکس" (Hortus Indicus Malabaricus) ۱۸۱۰ء میں

---

56. M.P.A.M.M. P.77.

شائع ہوئی ہے۔[57]

مشن پریس میں واحد لکڑی کا پریس تھا اور ایک کلکتہ سے حاصل کیا ہوا مراٹھی حروف کا مجموعہ تھا۔ 1817ء سے 1856ء تک اس چھاپہ خانہ کے نو نگراں رہے اور اسے صرف عیسائی لٹریچر چھاپنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ ریورنڈ ایچ بارڈ ویل (Rev. H. Bardwell) اس مطبع کے پہلے نگراں 1817ء سے 1820ء تک رہے وہ چھپائی کا فن بھی جانتے تھے اور مراٹھی زبان سے بھی خوب واقفیت رکھتے تھے۔

لیکن چھوٹا لکڑی کا چھاپہ خانہ ضروریات کو پورا کرنے میں ناکام ثابت ہوا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بڑی حد تک انگریزی، سنسکرت، مراٹھی، گجراتی، ہندوستانی، فارسی، عربی، زند اور پہلوی زبانوں کی طباعت کا کام کر کے فروغ پاتا رہا۔"[58]

اس طرح اس مطبع کی وسعت بڑھتی گئی اور 1854ء میں اس میں "7 عدد ہینڈ پریس ایک لیتھو پریس، ایک ایمباسنگ پریس، دو اسٹینڈنگ پریس، دو کٹائی کی مشینیں، 7 بھٹیاں اور دوسرا ڈھلائی کا ساز و سامان تھا اس میں انگلش حروف ڈھالنے کے سانچے چھوٹے اور بڑے سائز کے لیے۔ 7 مراٹھی حروف ڈھالنے کے سانچے بال بودھ ایک مراٹھی، مودی، تین گجراتی اور ایک زند مجموعہ ہائے حروف ہیں اور اس میں دو چھوٹے مجموعہ حروف ہندوستانی طباعت کے لئے ہیں اور انھیں حروف کے مجموعہ کی وجہ سے ہم سندھی، ہندی، سنسکرت، فارسی اور عربی میں چھپائی کر سکتے ہیں۔ موسیقی کے لئے بھی ٹائپ ہیں۔ یہاں انگلش ٹائپ کی مختلف قسمیں موجود ہیں، یعنی سادے اور با وضع ٹائپ تاکہ ایک پروف خواں (Proof Reader) چھپائی کے کام کو جاری رکھ سکے"۔[59]

اس طرح یہ بمبئی کا بڑا اور نفع کمانے والا مطبع بن گیا۔ لیکن تجارت کے ساتھ ساتھ اس چھاپہ خانہ نے گجراتی اور مراٹھی ٹائپ کے فروغ میں ان کے سائز کو کم کر کے اور واضح بنا کر اہم کردار ادا کیا۔

---

57. PROCEEDINGS OF ALL INDIA LIBRARY CONFERENCE, 1942, p.233

58. THE PRINTING PRESS IN INDIA, p.82.

59. THE PRINTING PRESS IN INDIA, p.83.

جیسے جیسے مختلف سرگرمیاں بڑھتی پریس کا تجارتی کردار سامنے آتا گیا جو مبلغین کے مقصد کے برعکس تھا۔ اس صورت حال پر نظر کرتے ہوئے جوان کے مقصد کے خلاف تھی اور بڑھتے ہوئے انتظامی مسائل کی بنا پر 1854ء میں مشن نے اس سلسلے کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا اور چار سال کے دوران انھوں نے مطبع بند کر دیا اس کے انگریزی اور ہندوستانی دونوں حصے بیچ دیے۔

بمبئی میں 1818ء میں مغربی لوگ برسراقتدار آئے اور ہندوستانیوں میں تعلیم کو فروغ دینے کے لیے انھوں نے 1820ء میں نیٹو اسکول (Native school) اور اسکول بک کمیٹی قائم کی اور اس وقت کے بمبئی کے گورنر ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن (Mount Stuart Elphinston) کو اس کا صدر مقرر کیا۔ کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ مقامی زبانوں میں مناسب درسی کتابیں شائع کرے[60]

مراٹھی ٹائپ جو سر چارلس ولکنس (Charles Wilkins) نے تیار کرائے تھے انگلینڈ سے منگوائے گئے[61] اور مراٹھی ٹائپ سے پہلی کتاب پنچوپاکھیان 1822ء میں گورنمنٹ پریس سے شائع ہوئی۔ دوسری درسی کتابیں "وِدور نیتی اور سنگھاسن بتیسی" بالترتیب 1823ء اور 1824ء میں چھپیں کتابیں چھاپنے کا یہ طریقہ سست تھا۔ "لیکن بورڈ کا درسی کتابوں کی وسیع پیمانہ پر ترویج کے راستے میں تھی وہ کافی حد تک یوں ختم ہوئی کہ حکومت نے اپنی حسب معمول فیاضی سے کام لیتے ہوئے سوسائٹی کو چار لیتھوگرافک پریس پیش کئے۔ دو مجموعہ ہائے حروف بنگال سے منگوائے اس کے ساتھ ساتھ چھپائی مشینیں اور انگریزی اور بال بودھ ٹائپ استعمال کے لیے انگلینڈ سے منگوائے ہیں۔ ان طریقوں سے کمیٹی کو ترغیب دی گئی ہے کہ سوسائٹی کا چھپائی محکمہ تیزی سے اور کفایت سے کام کرے گا۔"[62]

بامبے اسکول بک اینڈ اسکول سوسائٹی کی دوسری سالانہ رپورٹ (1824-25) سے ہمیں درسی کتابوں اور ان دوسری مطبوعات کے بارے میں قابلِ قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں جو

---

60. THE PRINTING PRESS IN INDIA, p.87.

61. THE PRINTING PRESS IN INDIA, p.89.

62. SECOND ANNUAL REPORT (1824-25) OF THE BOMBAY NATIONAL SCHOOL BOOK AND SCHOOL SOCIETY, pp.13-44.

1823-24ء میں شائع ہوئیں۔" اس دوران جو کتابیں چھپی ہیں وہ یہ ہیں گنت یعنی یورپی طریقہ پر ریاضی گجراتی میں اسکول کے استعمال کے لیے لنکاسٹر کے نظام کے مطابق ٹیبل کے چار سو نسخے مراٹھی میں۔ لیکن اب زیرِ طبع کتابوں میں گجراتی میں لنکاسٹر ٹیبل۔ بچوں کے لیے کہانی کی مراٹھی کتابیں، کرنل پالسی کی عمل جیومیٹری کا مراٹھی اور گجراتی ترجمہ، ہٹن کی سادی اور ٹھوس جیومیٹری، ٹرگنامیٹری پر لاگ ٹیبل کے ساتھ ایک کتاب، لاگ سائن وغیرہ مراٹھی میں اور الیوپ فیبل (Esop's Fables) کا مراٹھی ترجمہ اور جمع الحکایات سے کہانیوں کا ہندوستانی میں ترجمہ۔"

اس طرح درسی کتابوں اور دوسری کتابوں کی تعداد ہر سال بڑھتی رہی اور بامبے نیٹو ایجوکیشن سوسائٹی (Bombay Native Education Society) کی رپورٹ برائے سال 1825-26ء سے ہمیں مراٹھی، گجراتی، فارسی اور ہندوستانی میں مطبوعہ اور برائے اشاعت کتابوں کی تفصیلی فہرست ملتی ہے۔

بامبے نیٹو ایجوکیشن سوسائٹی کے مطبع میں ٹائپوگرافیکل اور لیتھوگرافیکل چھپائی ہوتی تھی؛ لیکن چونکہ ٹائپ حروف لمبے ہوتے تھے اس لیے زیادہ کاغذ خرچ ہوتا تھا۔ کاغذ کی کفایت کرنے کے لیے کلکتہ سے چھوٹے ٹائپ منگوائے گئے۔

لیتھوگرافک چھپائی کے لیے روشنائی اور پتھر ضروری اجزا تھے۔ لیتھوگرافک پتھر ہندوستان میں سنہ 1826ء سے ہی تیار کیے جاتے تھے اور تب ہی سے انھوں نے لندن سے درآمد کیے جانے والے پتھروں کی جگہ لے لی۔

بنگال: سنہ 1765ء سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کے براہِ راست نظم و نسق کی ذمہ داری سنبھالی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کے ملازمین نے جو نظم و نسق کے ذمہ دار بنے صوبہ کی زبان سیکھنی شروع کی۔ اُن کا بنگالی سیکھنے کا جوش و خروش ہی طباعت کے فروغ کا براہِ راست ذمہ دار بنا۔

سنہ 1778ء میں نیتھنیل براسی ہالہڈ (Nathaniel Brassy Halhed) نے جو کمپنی کا ملازم تھا اور جس نے بنگالی زبان میں اعلیٰ قابلیت حاصل کرلی تھی انگریزی میں بنگالی زبان کی قواعد چھاپی۔[63] (پلیٹ - XX)۔ یہ کتاب سینٹ اینڈریوز پریس ہگلی میں چھپی۔ اور

---

63. COPIES ARE AVAILABLE AT NATIONAL LIBRARY AND BANGIYA SAHITYA PARISHAD, CALCUTTA AND ALSO AT SRIERAMPUR COLLEGE LIBRARY.

لسبن[64] اور لندن[65] کی مطبوعات کو جو قبل چھپ چکی ہیں مستثنیٰ کرتے ہوئے یہ کتاب بنگالی میں چھپی کتاب کا اولین نمونہ ہے۔ ہگلی میں جو کتاب چھپی اس کے ٹائپ چارلس ولکنس نے تیار کیے تھے۔

سر چارلس ولکنس بنگال میں ۱۷۷۰ء میں آئے۔ وہ یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم کی حیثیت سے آئے اور سنسکرت۔ بنگالی اور دوسری مشرقی زبانیں سیکھیں سنسکرت کتابیں مثلاً گیتا۔ ہتوپدیش اور شکنتلا کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ حروف ڈھالنا سر ولکنس کا تفریحی مشغلہ تھا اور ہالہید کی قواعد کے لیے انھوں نے گورنر جنرل کی درخواست پر بنگالی حروف ڈھالے۔ ہالہید کی قواعد کے کا پیش لفظ ہمیں مندرجہ ذیل معلومات فراہم کرتا ہے۔

"بنگالی حروف کو فولاد میں ڈھالنا بڑا مشکل ہے۔ جو دیکھے گا وہ اس بات کو تسلیم کرلے گا کہ اس کے خطوط پیچیدہ ہیں۔ حروف کی لمبائی غیر مساوی ہے اور لکھائی میں حروف کی جگہیں اور ملانے کے طریقے بہت طرح کے ہیں۔ ایسے کاتب کا تلاش کرنا مشکل تھا جو یکساں متناسب حروف تیار کرسکے اور انہیں باقاعدگی اور صفائی کے ساتھ حروف بنا سکے جو ڈھلائی کیلیے درکار ہوتی ہے۔ مسٹر بولٹس (Mr. Bolts) نے (جو اس زبان میں مہارت رکھتا ہے) ٹائپ ڈھالنے کی کوشش کی اس کی مدد کے لئے لندن کے قابل ترین فنکار تھے۔ لیکن چونکہ وہ آسان حروف یا بنیادی حروف بنانے میں بھی ناکام رہا جس کا ایک نمونہ اسنے چھاپا ہے اس لئے یہ فرض کرلینے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اپنے منصوبہ کی تکمیل کے بعد موجودہ اس خام حالت سے جیسی نمایاں بجاوٹ میں خامیوں کی شکل میں ظاہر ہوتی رہتی ہے، اور ابھی آگے بڑھے گا۔

گورنر جنرل کے مشورے بلکہ استدعا کا مسٹر ولکنس پر جو کمپنی کی

---

64. BENGAL PAST AND PRESENT, VOL.IX, JULY-DECEMBER SER.NO.17-18.

65. HISTORY OF BENGALI LITERATURE, DE, p.78

ملازمت میں کئی سال بنگال میں رہ چکے تھے اثر پڑا اور انھوں نے بنگالی ٹائپ ڈھالنے کا کام سنبھالا اور ان کی کامیابی تمام توقعات سے آگے بڑھ گئی۔ ایک دور دراز ملک میں یوروپی فنکاروں کے رابطہ سے دور انھوں نے اپنے سر دھات کار، کندہ کار، ڈھلائی کار، اور چھاپہ گر سب کے فرائض لے لیے۔ اپنی تخلیقی ذہانت کے ساتھ انھیں ذاتی محنت کا بھی استعمال کرنا پڑا۔ اور ایسی تیزی کے ساتھ جس کا یوروپ میں فقدان تھا۔ انھوں نے تمام مشکلات پر قابو پالیا اگرچہ ابتدا میں ایسے مشکل فن میں دقتیں پیش آتی ہیں اور انھیں تنہا تجربات کی ناموافق صورت حال کا بھی سامنا تھا لیکن ان کی تنہا اور پہلی کوشش نے وہ جامع اور مکمل نمونہ پیش کر دیا جس کے لیے دنیا کے مختلف حصوں کی متحدہ کوشش اور مختلف منصوبوں کا بتدریج ارتقاء درکار ہے"[66]

اس طرح سر ولکنس نے ایک بے نظیر مرتبہ حاصل کر لیا۔ اور اسی بے مثال کامیابی سے پہلا بنگالی چھاپہ خانہ قائم ہوا[67] سر ولکنس نے ہندوستانی دستکاروں کو بھی تربیت دی جس کی وجہ سے یہ فن دیسی بنا۔ انھوں نے شری پنچانن کرمکار کو اپنا مددگار بنایا جو سری رامپور کا لوہار تھا۔ پنچانن نے ٹائپ کاٹنے اور ڈھالنے کا فن سیکھا اور چھاپہ خانہ کے لیے حروف ڈھالے جو کلکتہ اور سری رامپور میں شروع ہوئے تھے۔

ہگلی میں قائم چھاپہ خانہ کی ہمیں تفصیلات معلوم نہیں جس میں ہالہیڈ (Halhed) کی قواعد چھپی تھی لیکن مندرجہ ذیل خط سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ 1779ء میں گورنر جنرل ان کونسل سر ولکنس کی نگرانی میں چھاپہ خانے قائم کرنا چاہتے تھے[68] خط کا متن حسب ذیل ہے:

66. PREFACE, pp.xxiii-iv.

67. DR. GARNETT'S PAPER ON THE FIRST INTRODUCTION OF PRINTING IN THE EAST PUBLISHED IN THE TRANSLATION AND PROCEEDINGS OF THE SECOND INTERNATIONAL LIBRARY CONFERENCE, LONDON, 1898.

68. BANGLA SAHITYER ITIHASA: GADYER PRATHAMA YUGO; SAJAN KANTA DAS, p. 26

"بخدمت جے۔ پی۔ آر پولیا اسکوائر
سیکریٹری جنرل ڈپارٹمنٹ

جنابِ عالی:

عزت مآب گورنر جنرل اور کونسل اس کو مناسب خیال کرتے ہیں کہ مسٹر چارلس ولکنس کی نگرانی میں طباعت کا ایک دفتر قائم کریں۔ مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں آپ کو چھپائی شرحوں کی ایک نقل بھیجوں اور آپ سے درخواست کروں کہ آپ تمام چھپنے والے کاغذات چاہے وہ فارسی میں ہوں، بنگالی میں ہوں یا رومن میں ہوں سب اپنے دفتر سے مسٹر ولکنس کو بھیجیں اور نام و تاریخ وغیرہ کے لیے جو تبدیل ہونے والے ہوتے ہیں، خالی جگہیں چھوڑ دیں اور ہر فارم کا ایک نمبر دیں جو دوران سال جاری ہوتے ہیں۔

آپ کا فرماں بردار خادم
جی ہاجسن
سیکریٹری

محکمۂ مالیات
فورٹ ولیم
۸ر جنوری ۱۷۷۹ء

ہر دستہ کے لیے جس میں کاغذ کی قیمت شامل ہے۔

اگر صرف ایک طرف چھپے .... 3 روپے
اگر دونوں طرف چھپے .... 5 روپے
فارسی اور بنگالی کے لیے
ہر دستہ کی ایک طرف چھپائی کے لیے .... 5 روپے
ہر دستہ کی دونوں طرف چھپائی کے لیے .... 7 روپے

دستخط ڈبلیو۔ ویبر
نائب سیکریٹری
محکمۂ مالیات
صدقہ نقل

لیکن یہ منصوبہ اس وقت سرانجام نہ پاسکا اور انھوں نے خود کو مشرقی علوم کے مطالعہ کے لیے وقف کر دیا اور ایشیاٹک ریسرچز کی ابتدائی جلدوں میں قابل قدر مقالے لکھے۔ جب 1783ء میں سر ولیم جونس کلکتہ میں بہ حیثیت جج سپریم کورٹ آئے تو ولکنس نے ان کے ساتھ تعاون کر کے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی بنیاد ڈالنے میں مدد دی۔

1786ء میں خرابی صحت کی وجہ سے وہ ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے اور 1800ء میں کمپنی کی ملازمت بہ حیثیت لائبریرین انڈیا آفس لائبریری اختیار کی اور مشرقی مخطوطات کے نگراں بھی بنے۔ یہ مخطوطوں کا ذخیرہ سری رنگا پٹم کی فتح کے بعد حاصل ہوا تھا۔ وہ 1805ء سے ہیلی بری کالج (Hailey Bury College) سے اس کی بنیاد کے وقت ہی سے متعلق تھے۔ اس دوران انھوں نے کئی کتابیں لکھیں اور کئی کی ادارت بھی کی۔[69] یہ عظیم مشرقی عالم جسے بنگال کا کیکسٹن کہا جا سکتا ہے لندن میں 13 فروری 1836ء کو انتقال کر گیا۔[70]

1780ء میں آگسٹس ہکی (Augustus Hicki) نے کلکتہ میں پہلا مطبع "بنگال گزٹ" شائع کرنے کے لیے قائم کیا۔ 1784ء میں فرانسس گلاڈون (Francis Gladwin) نے "کلکتہ گزٹ پریس" قائم کیا جہاں تمام گورنمنٹ کے کاغذات چھپتے تھے۔[71]

سپریم کورٹ قائم ہونے اور کچھ انتظامی تبدیلیوں کے نتیجہ میں مندرجۂ ذیل کتابیں اٹھارہویں صدی کے آخری دہائی میں کمپنی کے مطبع میں چھپیں:-

1- امپے کوڈ (Impey Code) ترجمہ جوناتھن ڈنکن (Jonathan Duncan) موسوم بہ نام ریگولیشنز فار دی ایڈمنسٹریشن آف جسٹس ان دی کورٹ آف دیوانی عدالت" 1785ء میں شائع ہوئی

(REGULATIONS FOR THE ADMINISTRATION OF JUSTICE IN THE COURTS OF DEWANEE (DAWLAT)).

---

69. ASIATIC JOURNAL 1836, pp.165-171.

70. TRANSACTIONS AND PROCEEDINGS OF THE SECOND INTERNATIONAL LIBRARY CONFERENCE HELD IN LONDON, 1898.

71. BANGLA SAHITYER ITIHAS, S. DAS, p.27.

2- نیل بنجامن ایڈمنسٹن (Neil Benjamin Edmunstone) کا ترجمہ ریگولیشنز فار دی ایڈمنسٹریشن آف جسٹس ان دی فوجداری کریمنل کورٹس ان بنگال، بہار، اڑیسہ پاس شدہ گورنر جنرل ان کونسل مورخہ 3 دسمبر 1790ء - کلکتہ - 1791ء[72]

(REGULATIONS FOR THE ADMINISTRATION OF JUSTICE IN FAUJDARI COURTS OF BENGAL, BIHAR AND ORISSA)

3- بنگالی ترجمہ از این - بی - ایڈمنسٹن - ریگولیشنز فار دی گائیڈنس آف دی مجسٹریٹس پاس شدہ گورنر جنرل ان کونسل محکمۂ مالیات مورخہ 18 مئی 1792ء مع ضمیمہ جات - کلکتہ - 1792

(REGULATIONS FOR THE GUIDANCE OF THE MAGISTRATES PASSED BY GOVERNOR GENERAL IN COUNCIL IN THE REVENUE DEPTT. ON 18TH MAY 1792 WITH SUPPLEMENTARY ENACTMENTS, CALCUTTA, 1792)

4- مشہور "کارنوالس کوڈ" 1793ء ترجمہ ایچ - پی - فارسٹر مذکورہ بالا قوانین اصول اور کوڈ کے علاوہ ایک فارسی اور انگریزی کتاب بطریقۂ بائر (Bayer) وغیرہ مصنفہ رابرٹ جونس کمپنی کے چھاپہ خانہ کلکتہ میں 1792ء میں چھپی[73] اپجان (Upjohn) کی انگریزی، بنگالی وکیوبلری 1793ء میں کرانیکل پریس (Chronicle Press) کلکتہ میں چھپی[74]

"گرامر آف ہندوستانی لینگویج" مصنفہ گل کرائسٹ دیوناگری ٹائپ میں 1796ء میں کرانکل پریس کلکتہ میں چھپی - اور "وکیبولری ان ٹو پارٹس انگلش اینڈ بنگالی اینڈ وائس ورسا مصنفہ ایچ. پی. فارسٹر سینئر مرچنٹ آن بنگالی اسٹیبلشمنٹ"

(VACABULARY IN 2 PARTS, ENGLISH & BENGALI AND VICE VERSA BY H.P. FORSTER, SENIOR MERCHANT ON BENGAL ESTABLISHMENT).

---

72. CATALOGUE OF BENGALI BOOKS IN THE BRITISH MUSEUM, BLUMHARDT.p.8

73. IN THE PRIVATE COLLECTION OF MR. A.K. PRIOLKAR.

74. AVAILABLE AT BANGIYA SAHITYA PARISHAD AND NATIONAL LIBRARY, CALCUTTA.

دو قسطوں میں 1799ء اور 1802ء میں فیرس کمپنی ([illegible] Company) [illegible]
1797ء میں جان ملر (John Miller) نے ٹیوٹر یعنی نیو انگلش درک مقامی لوگوں کو انگریزی
پڑھانے کے لیے تین حصوں میں شاید کلکتہ سے چھپی ہے[75]

بنگال کی طباعت کی تاریخ میں 1799ء اور 1801ء یادگار ہیں جبکہ مبلغین کا ایک گروہ گنگا کے کنارے اترا اور نوعمر سول ملازمین کو مقامی زبانیں سکھانے کے لیے فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے (Baptist Mission) کا مرکز برطانوی حدود میں کھولنے سے انکار کیا تو وہ لوگ سری رامپور میں آئے انھوں نے کلکتہ کے قریب ڈنمارک کی مملکت قائم کی تاکہ نئے جوش و خروش کے ساتھ عیسائی مذہب کی تبلیغ کر سکیں۔ اس مشن کا خاص مقصد یہ تھا کہ بائبل کو اور دوسرے عیسائی لٹریچر کو بنگالی میں ترجمہ کریں۔ لیکن کمپنی نے یہ ترویج مذہب کی موافقت کی اور نہ ایسی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی ہے[76]

جان تھامس نے جو 1783ء میں بنگال آیا۔ سری رامپور میں تبلیغی مرکز قائم کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ وہ 1792ء میں وطن واپس گیا اور دوسرے سال اپنے ساتھ ولیم کیری کو لے کر آیا۔ ڈاکٹر تھامس اور کیری کو لائسنس نہ ملا اس لیے وہ 13 جون کو ڈنمارک کے ایک جہاز میں بیٹھ کر 11 نومبر کو بنگال پہنچا۔

کیری کا مقصد یہ تھا کہ عیسائی لٹریچر کو بنگال میں ترجمہ کرے اُس نے 1798ء تک بائبل کا بڑا حصہ دورانِ قیام مدن بٹی ترجمہ کر لیا تھا۔ صرف وہ تاریخی کتابیں جو جوشوا نے جان کو لکھی تھیں ترجمہ کرنے سے بچ رہی تھیں ہے[77] وہ انھیں بنگالی میں شائع کرنے کے لیے بیتاب تھا اس نے 1798ء میں 40 پونڈ میں ایک لکڑی کا چھاپہ خانہ خریدا لیکن لندن سے دوسرے لوازمات درآمد کرنا مہنگا سودا تھا۔ ایسی صورت میں "ہر ایک پنچ (Punch) کی قیمت ایک گنی ہوتی اور نیو ٹسٹامنٹ (New Testament) کی دس ہزار جلدیں کلکتہ میں چھاپنے کی قیمت 3,750/- روپے ہوتی"۔ اسی دوران اسے معلوم ہوا کہ ایک ڈھلائی کا کارخانہ کلکتہ میں قائم ہوا ہے جس میں مقامی

---

75. BANGLA SAHITYER ITIHAS, DAS, p.37 (WITH TITLE PAGE ILLUS)
76. BENGALI LITERATURE IN THE 19th cy.DE., pp.98-99.
77. BENGALI LITERATURE IN THE 19TH cy.DE., pp 107.

[illegible]

(Marshman) [illegible] اہل وعیال کے سری رام پور میں وارد ہوئے چونکہ وہ مبلغین تھے اس لیے انھیں برطانوی حکام نے اجازت نہ دی اور واپس وطن جانے کے لیے کہا۔ اس موقع پر ڈنمارک کا گورنر ان کا پشت پناہی کے لیے آیا۔ سری رام پور بپٹسٹ مشن (Baptist Mission) جو کیری، وارڈ اور مارش مین نے جنوری 1800ء میں قائم کیا اور اسی وقت سے چھاپہ خانہ نے بھی کام کرنا شروع کیا۔

بنگالی کاریگروں میں جنھوں نے ٹائپ کاٹنے کا کام سیکھا۔ سری رام پور کا ایک لوہار پنچانن کرمکار اور اس کا داماد منوہر تھے۔ پنچانن نے ٹائپ کاٹنے کا فن سر ولکنس سے سیکھا تھا۔ اگرچہ یہ ایک "مقدس دھوکا" تھا لیکن کیری نے کول برک (Colebrook) کی مدد سے پنچانن کو حاصل کیا اور طباعت کے کام کی توسیع کی۔ اور ایک ٹائپ ڈھالنے کا کارخانہ قائم کیا جس میں تمام مشرقی زبانوں کے حروف ڈھالے جا سکتے تھے۔ پنچانن سے جو مدد حاصل ہوئی اس کی اطلاع ہمیں ایک "یادداشت متعلقہ تراجم مقدس دینی کتب در زبانِ مشرق" سے ملتی ہے

(Mem)ir relative to the Translation of the sacred scriptures into the language of the East).

"ہمارے سری رامپور میں سکونت پذیر ہوتے ہی خدا نے ہمارے لیے وہ فنکار بھیج دیا جس نے ولکنس کے ساتھ کام کیا تھا جس نے بڑی حد تک اس کے خیالات کو اپنے اندر سمو لیا تھا۔ اس کی مدد سے ہم نے حروف ڈھالنے کا ایک کارخانہ قائم کیا۔ اب وہ مر چکا ہے لیکن اس نے اپنا فن بہت سے دوسرے لوگوں تک پوری طرح پہنچا دیا تھا کہ وہ ٹائپ حروف ڈھالنے کا کام اور سانچے بنانے کا کام اتنی درستی اور صحت سے کرتے ہیں کہ یوروپ کے فنکاروں کے سامنے انھیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

دو قسطوں میں سنہ 1799ء اور سنہ 1802ء میں فیرس کمپنی (Fearis Company) کلکتہ میں چھپی - سنہ 1797ء میں جان ملر (John Miller) نے ٹیوٹر یعنی نیو انگلش ورک مقامی لوگوں کو انگریزی پڑھانے کے لیے تین حصّوں میں شاید کلکتہ سے چھپی ہے[75]

بنگال کی طباعت کی تاریخ میں سنہ 1799ء اور سنہ 1801ء یادگار ہیں جبکہ مبلّغین کا ایک گروہ گنگا کے کنارے اترا اور نوعمر سول ملازمین کو مقامی زبانیں سکھانے کے لیے فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے (Baptist Mission) کا مرکز برطانوی حدود میں کھولنے سے انکار کیا تو وہ لوگ سری رامپور میں آئے انھوں نے کلکتہ کے قریب ڈنمارک کی مملکت قائم کی تاکہ نئے جوش و خروش کے ساتھ عیسائی مذہب کی تبلیغ کر سکیں - اس مشن کا خاص مقصد یہ تھا کہ بائیبل کو اور دوسرے عیسائی لٹریچر کو بنگالی میں ترجمہ کریں - لیکن کمپنی نے یہ ترویج مذہب کی موافقت کی اور نہ ایسی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی ہے[76]

جان تھامس نے جو سنہ 1783ء میں بنگال آیا۔ سری رامپور میں تبلیغی مرکز قائم کرنے میں نمایاں حصّہ لیا۔ وہ سنہ 1792ء میں وطن واپس گیا اور دوسرے سال اپنے ساتھ ولیم کیری کو لے کر آیا۔ ڈاکٹر تھامس اور کیری کو لائسنس نہ ملا اس لیے وہ 13 رجون کو ڈنمارک کے ایک جہاز میں بیٹھ کر 11 رنومبر کو بنگال پہنچا۔

کیری کا مقصد یہ تھا کہ عیسائی لٹریچر کو بنگال میں ترجمہ کرے اُس نے سنہ 1798ء تک بائیبل کا بڑا حصّہ دورانِ قیام مدن بتی ترجمہ کر لیا تھا۔ صرف وہ تاریخی کتابیں جو جوشوا نے جان کو لکھیں تھیں ترجمہ کرنے سے بچ رہی تھیں ہے[77] وہ انھیں بنگالی میں شائع کرنے کے لیے بیتاب تھا اس نے سنہ 1798ء میں 40/- پونڈ میں ایک لکڑی کا چھاپہ خانہ خریدا لیکن لندن سے دوسرے لوازمات درآمد کرنا مہنگا سودا تھا۔ ایسی صورت میں "ہر ایک ٹھپّہ (Punch) کی قیمت ایک گنی ہوتی اور نیو ٹسٹامنٹ (New Testament) کی دس ہزار جلدیں کلکتہ میں چھاپنے کی قیمت 3,750/- روپے ہوتی"۔ اسی دوران اسے معلوم ہوا کہ ایک ڈھلائی کا کارخانہ کلکتہ میں قائم ہوا ہے جس میں مقامی

75. BANGLA SAHITYER ITIHAS, DAS, p.37 (WITH TITLE PAGE ILLUS)

76. BENGALI LITERATURE IN THE 19th cy.DE., pp.98-99.

77. BENGALI LITERATURE IN THE 19TH cy.DE., pp 107.

ٹائپ ڈھالے جاتے ہیں، کارخانہ کا اس کو پتہ نہ لگا لیکن مقامی کاریگروں کی جنھوں نے سر چارلس ولکنس سے تربیت حاصل کی تھی صلاحیتوں سے اس نے فائدہ اٹھایا۔ جو چھاپہ خانہ اس نے پہلے مدن بٹی میں قائم کیا تھا وہ اُسے سری رام پور لے آیا۔

نومبر 1799ء میں ولیم وارڈ (William Ward) اور جوشوا مارش مین (Joshua Marshman) مع اہل و عیال کے سری رام پور میں وارد ہوئے چونکہ وہ مبلّغین تھے اس لیے انھیں برطانوی حکام نے اجازت نہ دی اور واپس وطن جانے کے لیے کہا۔ اس موقع پر ڈنمارک کا گورنر ان کی پشت پناہی کے لیے آیا۔ سری رام پور بپٹسٹ مشن (Baptist Mission) تھامس کیری، وارڈ اور مارشمین نے جنوری 1800ء میں قائم کیا اور اسی وقت سے چھاپہ خانہ نے بھی کام کرنا شروع کیا۔

بنگالی کاریگروں میں جنھوں نے پنچ کاٹنے کا کام سیکھا۔ سری رام پور کا ایک لوہار پنچانن کرمکار اور اس کا داماد منوہر تھے۔ پنچانن نے ٹائپ کاٹنے کا فن سر ولکنس سے سیکھا تھا۔ اگرچہ یہ "ایک مقدس دھوکا" تھا لیکن کیری نے کول برک (Colebrook) کی مدد سے پنچانن کو حاصل کیا اور طباعت کے کام کی توسیع کی۔ اور ایک "ٹائپ ڈھالنے کا کارخانہ قائم کیا جس میں تمام مشرقی زبانوں کے حروف ڈھالے جا سکتے تھے۔ پنچانن سے جو مدد حاصل ہوئی اس کی اطلاع ہمیں ایک "یادداشت متعلقہ تراجم مقدس دینی کتب در زبانِ مشرق" سے ملتا ہے۔

(Memoir relative to the Translation of the sacred scriptures into the language of the East).

> "ہمارے سری رامپور میں سکونت پذیر ہوتے ہی خدا نے ہمارے لیے وہ فنکار بھیج دیا جس نے ولکنس کے ساتھ کام کیا تھا جس نے بڑی حد تک اس کے خیالات کو اپنے اندر سمو لیا تھا۔ اس کی مدد سے ہم نے حروف ڈھالنے کا ایک کارخانہ قائم کیا۔ اب وہ مر چکا ہے لیکن اس نے اپنا فن بہت سے دوسرے لوگوں تک پوری طرح پہنچا دیا تھا کہ وہ ٹائپ حروف ڈھالنے کا کام اور سانچے بنانے کا کام اتنی درستی اور صحت سے کرتے ہیں کہ یوروپ کے فنکاروں کے سامنے انھیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

پنچانن کے بعد منوہر نے چالیس سال مشن کی خدمت کی پھر اس کے بیٹے کرشن نے جو پنچ (Punch) کاٹنے میں ماہر ہوگیا تھا اس ادارہ کی ذمہ داری سنبھالی اور اس کی فروغ میں مدد دی یہاں تک کہ سنہ 1850ء میں وہ ہیضہ میں مرگیا۔ اس کی وفات کے بعد پنچانن، منوہر اور کرشن کے کردار کی تفصیل ایک ہفتہ وار رسالہ "ستیہ پردیپ" مورخہ 25 مئی سنہ 1850ء میں چھپی۔

سنہ 1803ء سے سنہ 1832ء تک سری رامپور مشن پریس نے دو لاکھ بارہ ہزار کتابیں چالیس مختلف زبانوں میں شائع کیں۔ مسٹر جارج اسمتھ نے اپنی کتاب سوانح حیات ولیم کیری ڈی ڈی میں سری رامپور پریس کی مختلف زبانوں میں چھپی کتابوں کی فہرست دی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے چینی زبان کے حروف کے ڈھلے والے متحرک ٹائپ تیار کیے اور ان کی یہ کامیابی بے مثال تھی۔ سنہ 1860ء تک سری رامپور مشرقی زبانوں کے حروف کی ڈھلائی کا خاص مرکز بنا رہا۔

فورٹ ولیم کالج اور اسکول بک سوسائٹی۔ کلکتہ

فورٹ ولیم کالج اگست سنہ 1800ء میں کلکتہ میں قائم ہوا تاکہ کمپنی کے چھوٹے غیر فوجی افسران کو بہتر تعلیم دے سکے۔ کالج نے اپنی بہت سی تہذیبی سرگرمیوں کے علاوہ بنگال میں اشاعت اور چھپائی کو فروغ دینے میں مدد دی۔ سنہ 1801ء میں اس کالج میں کیری (Carey) کو بنگالی اور سنسکرت کا استاد مقرر کیا گیا۔ بعد میں انکو مراٹھی پڑھانے کا کام بھی سونپا گیا اور سنہ 1807ء میں انھیں پروفیسر کا عہدہ دیا گیا۔ ان کی تنخواہ بہ حیثیت سنسکرت اور بنگالی کے استاد کے 500/- روپے ماہوار تھی لیکن فاضل ذمہ داریاں دینے کے بعد ان کی تنخواہ بڑھا کر 1000/- روپے کردی گئی کیری کو کثیر رقم کی تنخواہ نے انھیں موقع دیا کہ اپنے کام کو وسعت دیں اور اپنے مقصد کی تکمیل کریں۔

"کالج کے صاحبِ اقتدار حضرات نے محسوس کیا کہ ہندوستانی زبانوں میں کتابیں ہوں کیونکہ ان کے بغیر ان زبانوں میں تعلیم دینا مشکل ہوگا۔ کالج نے اسی لیے کلکتہ میں چھاپہ خانوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ٹائپ کاٹنے اور ہندوستانی زبانوں میں کتابیں چھاپنے کو بڑھاوا دیا۔ لیکن چونکہ یہ چھاپے خانے یورپین یا اینگلو انڈین کے ہاتھوں میں تھے اس لیے ہندوستانی زبانوں کے حروف کے ٹائپ اطمینان بخش نہ تھے۔ کالج کے حکام نے پنڈت اور منشی لوگوں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ ہندوستانی زبانوں کے حروف ڈھالنے کے کارخانے قائم کریں اور اس کا معیار بلند کریں۔

انھوں نے ایسے چھاپہ خانوں کی سرپرستی کی پیش کش کی جو ان کارخانوں کے بنائے بہتر چھاپوں کو استعمال کرتے ہوں۔ کالج کے پارسی، ہندی، بنگالی اور دوسرے شعبوں کے

استادوں نے نئے اور بہتر مجموعہ ہائے حروف ایجاد کیے اور کلکتہ میں جو نئے نئے چھاپے خانے قائم ہو رہے تھے انھوں نے ان بہتر ٹائپ حروف کو استعمال کر کے فورٹ ولیم کالج کے اساتذہ کی تصنیف کی ہوئی کتابوں کو شائع کیا۔

یہ کہا جاتا ہے کہ عمدہ ٹائپ حروف کو کالی کمار رائے کی تحریر کے نمونہ پر تیار کیا گیا تھا جو کالج میں استاد تھے اور انھیں پنچانن کرمکار نے ڈھالا تھا۔"[78]

سنسکرت پڑھانے کے لیے کیری نے قواعد تصنیف کی اور اس کو چھاپنے کے لیے دیوناگری ٹائپ تیار کرانے پڑے یہی ٹائپ ہندوستانی اور مراٹھی کی کتابیں چھاپنے کے لیے استعمال کیے گیے۔

کیری نے مراٹھا قواعد بھی مرتب کی جو 1805ء میں سری رامپور میں چھپی۔

کیری کی دیوناگری ٹائپ کی کوشش سے قبل یورپ اور ہندوستانی دونوں جگہوں پر دیوناگری چھپائی ہوتی تھی۔[79]

کیری نے پنچانن کی مدد سے جو دیوناگری ٹائپ تیار کروائے تھے وہ بڑے سائز کے تھے۔ اسی لیے کاغذ کے خرچ کے معاملہ میں کفایت شعاری نہیں ہو سکتی تھی۔ ہندوستان کے ٹیکنیکل کارکنوں کی مدد سے چھوٹے ٹائپ تیار کرائے گئے اور یہ تقریباً ایک مختلف اور مشترک حروف کا مجموعہ ہے لیکن اس کے باوجود بھی جب مراٹھا گرامر، مراٹھا بائبل اور مراٹھا لغت کے دوسرے ایڈیشن چھپے تو ان ٹائپ حروف کی جگہ مودی ٹائپ حروف استعمال کیے گئے۔

جو درسی کتابیں فورٹ ولیم کالج کی سرپرستی میں چھپیں وہ مہنگی تھیں ایک اوسط درجہ کے طالب علم کے لیے ان کو خرید نا مشکل تھا۔ کتابوں کو سستا اور بہ آسانی مہیا کرنے کے لیے جولائی 1817ء میں کلکتہ اسکول بک سوسائٹی قائم کی گئی اس سوسائٹی کے ممبران کیری، تارنی چندر مترا

---

78. THE CAREY EXHIBITION OF EARLY PRINTING AND FINE PRINTING.

79. (a) ONE COPY PRINTED IN EUROPE IN 1743 IN DEVANAGARI CHARACTER IS IN THE PRIVATE COLLECTION OF DR. SUNITI KR. CHATTERJEE.
(b) GRAMMAR OF THE HINDUSTANEE LANGUAGE BY JOHN GILCHRIST WAS PRINTED AT THE CHRONICLE PRESS, CALCUTTA.

رادھاکانت دیو اور رام کمل سین تھے اس سوسائٹی نے ادب، تاریخ، جغرافیہ اور قواعد پر درسی کتابیں چھاپیں۔

سوسائٹی کے تین ہندوستانی ممبران نے ملکرنیتی کتھا کا ترجمہ کیا جو 1818ء میں چھاپا گیا۔ تاراچند دت نے 1819ء میں ایک کتاب انگریزی بنگالی میں۔ پلیزنگ ٹیلس (Pleasing Tales) یا منورنجن اتہاس کے نام سے چھاپی۔ رادھاکمل سین نے "ایسوپ فیبلس (Esop's Fables)" کا ترجمہ کیا اور فارماکوپیا کا ادشدھسار سانگرہ ترجمہ 1819ء میں کیا۔ اور دیاکرن سار مادھوچندر بھٹاچارجی نے لکھی جو 1824ء میں شائع ہوئی۔

بنگال کے ابتدائی چھاپہ خانے اور کتابوں کی تجارت

اس طرح چھپی ہوئی کتابیں عام ہوگئیں اور بہت سے چھاپہ خانے کلکتہ میں قائم ہوئے تاکہ اس وقت کی مانگ کو پورا کیا جاسکے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں (1825-26ء) میں مندرجہ ذیل چھاپہ خانے کلکتہ میں سرگرم تھے:-[80]

1۔ چندریکا جنترالیہ واقع کالوٹولا۔
2۔ پریس آف لیونڈر واقع لوبازار۔
3۔ ہرچندر رائے کا چھاپہ خانہ واقع آراپلی۔
4۔ سمباد تمرناسک پریس واقع مرزاپور۔
5۔ منشی ہدایت اللہ کا چھاپہ خانہ واقع مرزاپور۔
6۔ مہندر لال کا چھاپہ خانہ واقع شنکری ٹولہ۔
7۔ بدن پالت پریس " " "
8۔ بشواناتھ دیو پریس واقع شوابازار
9۔ مسٹر پٹر (Pitt) کا پریس واقع انٹلی۔

---

80. JANASABHAR SAHITYAR BENOY GHOSH, p.167.

10 ۔ شمس الاکبر پریس ۔

11 ۔ کالج پریس ۔

ان کے علاوہ اور بھی چھاپہ خانے کلکتہ کے ارد گرد قائم ہوئے تھے ۔ خاص کلکتہ میں اور اس کے اطراف چھاپہ خانوں کا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ چھپی ہوئی کتابوں کی مانگ کس درجہ بڑھ گئی تھی ۔

چھپی ہوئی کتابوں کی طلب نے کتابوں کی تجارت کا راستہ ہموار کیا ۔ انیسویں صدی کے آغاز میں بنگال کی کتابوں کی تجارت میں گنگا کشور کا نام سب سے اوّل ہے ۔

گنگا کشور سری رام پور کے قریب ایک گاؤں بہارا کا رہنے والا تھا پہلے اس نے اپنی تجارت کتابوں کی طباعت اور فروخت سے شروع کی ۔ اس نے کتابوں کی طباعت کا فن سری رام پور مشن پریس میں سیکھا ۔

گنگا کشور کو جو پہلے سری رام پور پریس میں ملازم تھا خیال آیا کہ رائج زبان میں کتابیں شائع کرکے دولت حاصل کی جاسکتی ہے ۔ ہندو عوام کی نبض کو محسوس کرتے ہوئے اس نے ایک یوروپی باشندہ کے چھاپہ خانہ میں کچھ کتابیں چھپوائیں اور جب ان کی بکری اچھی ہوئی تو اس نے اپنا ایک دفتر قائم کیا ۔ اور کتابوں کی دکان کھولی اس نے بنگال کے بڑے شہروں اور قصبوں میں کتابیں بیچنے کے لیے ایجنٹ مقرر کیے وہ خود کئی کتابوں کا مصنف تھا اور اس نے کلکتہ میں بنگلہ گزٹ پریس غالباً 1818ء میں قائم کیا ۔

بنگلہ گزٹ جو بنگالی زبان کا پہلا اخبار تھا اس پریس سے چھپا کرتا تھا[81] گنگا کشور پہلا بنگالی تھا جس نے منظم طور پر کتابوں کی تجارت شروع کی اور پہلا بنگالی اخبار شائع کیا ۔ اس طرح اس نے ایک نیک کام کو رواج دیا ۔

گنگا کشور کے بعد کلکتہ کے بٹ تالہ ناشر نے نئی قوت کے ساتھ اس روایت کو برقرار رکھا اور مختلف قسم کی کتابیں چھاپیں ۔ آج بھی بٹ تالہ ناشر کا نام تاریخی طور پر مشہور ہے جس نے گنگا کشور کے شروع کیے ہوئے کام کو تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی ۔

---

81. JANASABHAR SAHITYAR BIJOY GHOSH, p.170.

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی چند مطبوعات

کتب خانہ داری کا ایک تعارف

مصنف: شہاب الدین انصاری
صفحات: 394
قیمت: -/24

ہندوستان میں چھاپہ خانہ

مصنف: رولکر/ علی ابن الحسین زیدی
صفحات: 156
قیمت: -/52

مبادی کتابیات

مصنف: شہاب الدین انصاری/ کرشن کمار
صفحات: 304
قیمت: -/22

لغت ابجد شماری (چار جلدوں میں)

مرتب: سید احمد
صفحات: 2539
مکمل سٹ کی قیمت: -/472

وضع اصطلاحات

مرتب: وحید الدین سلیم
صفحات: 318
قیمت: -/18

کتاب کی تاریخ

مصنف: شایاں قدوائی
صفحات: 280
قیمت: -/75

نوٹ: طلبہ و اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

क़ौमी काउन्सिल बराए फरोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language
West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066